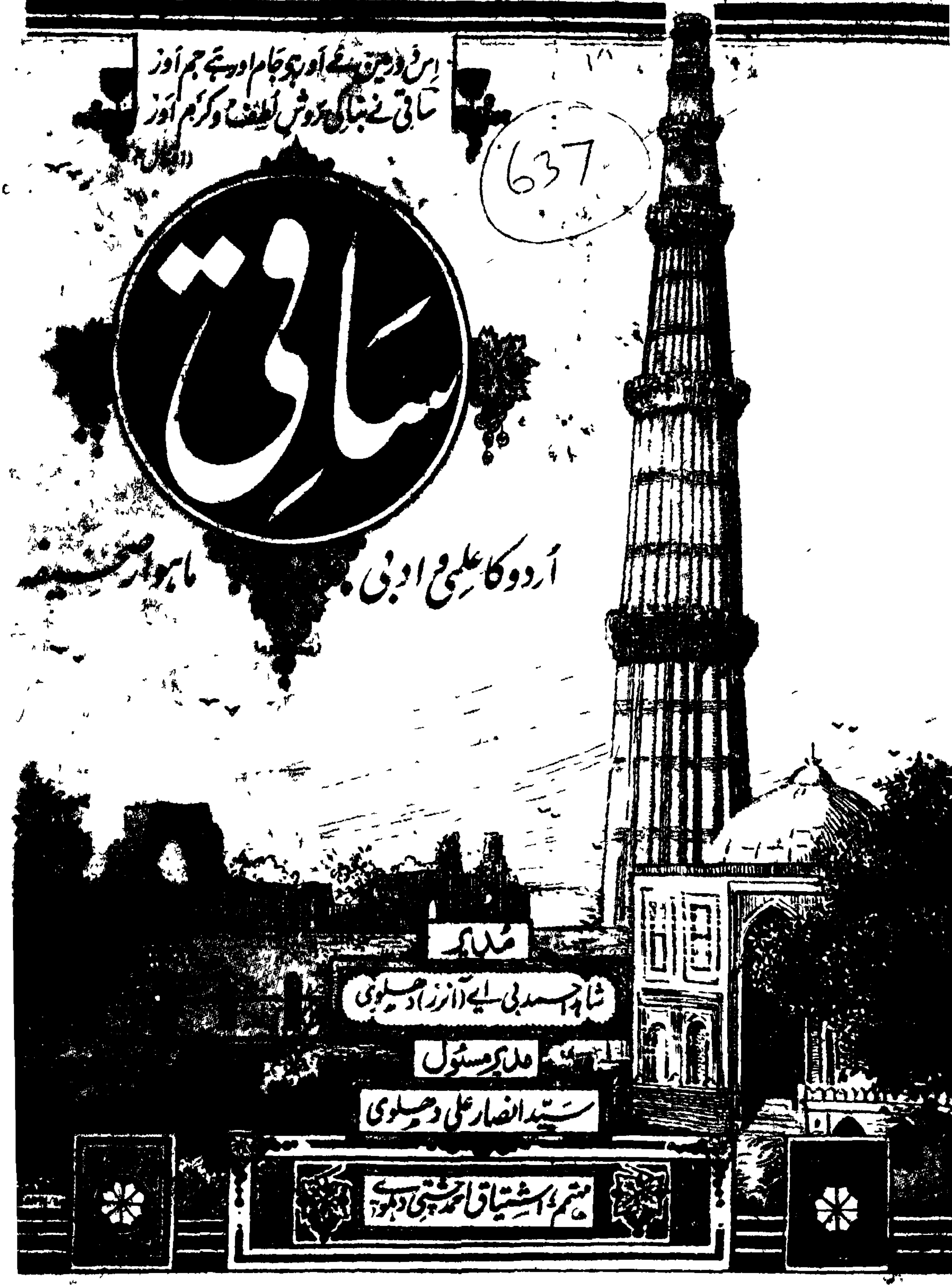
FEBRUARY 1932



Price per Copy As 6 | Annual Rs 3-8-0

MURARI ART PRESS DELHI

پچاس روپیہ

جیسا کہ گذشتہ سال کا ظریف نمبر جس قدر مقبول ہوا بیان سے باہر ہے۔ امسال ادارۂ ساقی کی کوشش ہے کہ امسال کا ظریف نمبر (جو مارچ یا اپریل کو شائع ہوگا) نہ صرف گذشتہ سال کے ظریف نمبر سے بڑھ چڑھ کر ہو بلکہ ایسا ہو کہ ادبی دنیا میں ظرافت نگاری کے ایسے نمونے پیش کئے جائیں جو علم ادب میں غیر فانی یادگار ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ ادارہ کی جانب سے برابر اس امر کی کوشش ہو رہی ہے اور اسی سلسلہ میں ہم آج یہ اعلان کرتے ہیں کہ ساقی کی طرف سے ظریف نمبر کے بہترین مضمون لکھنے والے کی خدمت میں مبلغ پچاس روپیہ نقد پیش کئے جائیں گے۔ یہ کوئی انعام نہیں ہے اور نہ کوئی لالچ ہے اور نہ کوئی ادبی مقابلہ ہے بلکہ ادارہ ساقی کی طرف سے اظہار تشکر سمجھا جائے۔ ساقی کا فرض ہوگا کہ جس کا مضمون بہترین ہو اس کی خدمت میں یہ رقم پیش کرے اور اگر مضمون نگار کی طرف سے انکار بھی ہو تب بھی [illegible] کرے۔ قصہ مختصر اس رقم کے لینے سے انکار کرنا عبث ہوگا اور یہ رقم ضرور دی جائے گی۔

بہترین مضمون وہ ہوگا جس کو کہ خریداران ساقی بہترین قرار دیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ ساقی کے خریدار اس معاملہ میں ہماری امداد کریں گے اور ظریف نمبر کے شائع ہوتے ہی اپنی اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے کہ کون سا مضمون ان کی دانست میں سب سے اچھا ہے۔ ایسے تمام خطوط پر نمبر خریداری اور صاف پتہ مع خریدار کا درج ہونا چاہیئے۔ جس مضمون کے حق میں سب سے زیادہ رائیں آئیں گی وہی بہترین قرار دیا جائے گا۔

چنانچہ ہم اس سلسلہ میں تمام اہل ادب کو مخاطب کر کے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری خاطر نہیں بلکہ صرف ادب کی خاطر ہماری اس دعوت کو قبول فرمائیں اور خاص طور پر ہم اپنے محترم حضرت مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ حضرت شوکت تھانوی صاحب۔ ملا رموزی صاحب۔ مسٹر پطرس۔ سید امتیاز علی صاحب تاج۔ مسٹر شفیق احمد صدیقی۔ مسٹر سلطان حیدر جوش۔ مسٹر ایم اسلم۔ علامہ مضحک دہلوی۔ مسٹر مرزا عظیم بیگ چغتائی مسٹر ناکارہ حیدر آبادی۔ سید تمکین الکاظمی۔ مسٹر رفیق اجمیری۔ مسٹر قیسی رامپوری۔ اور نیز دوسرے مزاح نگاروں اور اہل قلم کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس تجویز میں ہماری پوری پوری امداد فرمائیں۔ ظریف نمبر میں صرف وہی مضامین شامل کئے جاسکیں گے جو ۵ مارچ سنہ ۳۲ء تک دفتر ساقی میں موصول ہوں گے۔

جُرعات

جلد (۵) | ساقی - دہلی - بابت فروری سنہ ۱۹۳۲ء | نمبر (۲)

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	پچاس روپے	....	(۱)
(۲)	جرعات	....	(۲)
(۳)	نگاہِ اولین	"شاہد"	(۳)
(۴)	غمِ زندگانی	خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی	(۴)
(۵)	عکسِ شرمگیں	حضرت حافظ غازی پوری	(۶)
(۶)	شعر کیا ہے؟	حضرت جوش ملیح آبادی	(۷)
(۷)	فرمودات یگانہ	حضرت یگانہ لکھنوی	(۸)
(۸)	چیسٹر ڈ گرڈ	جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی	(۹)
(۹)	داستانِ عبرت	جناب مرزا عبد الحمید بیگ صاحب دہلوی	(۱۷)
(۱۰)	راحت کدہ	حضرت عبد السمیع پال - اثر صہبائی	(۲۳)
(۱۱)	جرعاتِ تازہ	حضرت سرشار گمنڈوی	(۲۴)
(۱۲)	سہیلی کی نصیحت	"شاہد"	(۲۵)
(۱۳)	اختر کی سرگذشت	جناب ممتاز حسین صاحب دہلوی	(۳۱)
(۱۴)	غزلیات	راز بنگش - نہال آفریدی - باسط بسوانی - حسان جعفری وغیرہ	(۴۶)
(۱۵)	اندھا عاشق	جناب نور الحسن صاحب برلاس	(۴۹)
(۱۶)	دیوانہ	محترمہ مس حجاب اسماعیل	(۵۸)
(۱۷)	خدائی دربار	جناب مرزا سلیم بیگ صاحب دہلوی	(۶۰)
(۱۸)	وفا کا پھل	حضرت مظہر انصاری دہلوی	(۶۶)
(۱۹)	فریبِ وفا	حضرت ساحل بلگرامی	(۷۱)
(۲۰)	غرورِ محبت	حضرت تنویر قریشی	(۷۳)
(۲۱)	تنقیدِ شعری	حضرت پرویز بٹالوی	(۷۸)
(۲۲)	جذباتِ بسمل	منشی سکھدیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی	(۸۰)
(۲۳)	ہمارا لباس	جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی	(۸۱)
(۲۴)	جام لوازیاں	مختلف رسائل	(۸۵)
(۲۵)	ساقی سنہ ۱۹۳۱ء میں	جناب فضل حق قریشی دہلوی	(۸۹)
(۲۶)	اشتہارات	مشتہرین	(۹۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولین

سالنامہ ساقی کی مقبولیت توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی۔ سالنامہ زیادہ تعداد میں شائع کیا گیا تھا مگر پبلک نے اس قدر پسند کیا کہ اس وقت دفتر ساقی میں صرف دو کاپیاں باقی ہیں اور دو سو پرچوں کی فرمائشیں موصول ہو چکی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم شائقین کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتے اور اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے معافی کے بھی خواستگار ہیں۔ آیندہ خاص نمبروں کے موقعوں پر اس امر کا لحاظ رکھا جائیگا اور خاص نمبر اور بھی زیادہ تعداد میں شائع کئے جائینگے۔

"ظریف نمبر" کا اعلان صفحہ اوّل پر شائع کیا گیا ہے تاکہ ہر خاص و عام کی نظر سے گذر جائے ہمیں امید ہو کہ اس سال "ظریف نمبر" اپنی طرز کا پہلا پرچہ ہوگا جو اپنی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے عدیم المثال ہوگا اس نمبر کی اشاعت محض اس لئے کی جا رہی ہے کہ مزاحیہ ادبیات کا ایک اچھا ذخیرہ ہماری زبان میں جمع ہو جائے۔ امید ہے کہ مزاح نگار حضرات "ظریف نمبر" کے مُرتب کرنے میں ہماری امداد فرمائیں گے۔

لاہور سے جتنے اچھے اچھے رسائل شائع ہو رہے ہیں ہندوستان کے کسی اور شہر سے شائع نہیں ہو رہے۔ رسائل کا وجود زبان کی ترویج و ترقی کے لئے ضروری ہے اس لئے اُردو کی جو خدمت لاہور کے رسائل کر رہے ہیں اُسکے لئے انکی سعی مشکور ہے۔ "ہمایوں" نے اپنی دس سالہ جوبلی منائی ہے اور اپنا خاص نمبر پیش کیا ہے جو مضامین کے اعتبار سے اس سال کے مجلہ سالناموں سے بڑھا ہوا ہے۔ مضامین ہر قسم کے ہیں اور ہر مضمون کا معیار بہت بلند ہے حصہ نثر میں تنقیدی مضامین کے علاوہ تین ڈرامے خصوصیت کے ساتھ جاذبِ توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک ہمایوں کے مضمون نگارِ خصوصی حضرت "فلک پیما" کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا ملک کے مایۂ ناز ادیب جناب سجاد حیدر صاحب یلدرم نے ترکی زبان سے ترجمہ کیا ہے اور تیسرا محمد عمر نور الٰہی صاحبان کا جنکو ڈرامہ لکھنے میں خاص مہارت ہے حصۂ نظم میں بھی وہی دلکشی ہے جو حصۂ نثر میں۔ رفعتِ خیال۔ تنوّع۔ زبان کی چاشنی اور ایک درس ہر نظم کی خصوصیات ہیں تصاویر کے انتخاب میں بھی علوِ مذاق شامل ہے ضخامت تقریباً (۲۴۰) صفحات قیمت ۸ مستقل خریداروں کو سالنامہ مفت دیا جائیگا۔ "عالمگیر" کے خاص نمبر خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تازہ ترین خاص نمبر بھی اپنی بوقلموں خصوصیات کا متحمل ہے۔ مضامین سب اچھے ہیں تصاویر بے شمار ہیں۔ جنمیں رنگین تصویریں آرٹ کے اچھے نمونے ہیں بڑی تقطیع کے تقریباً (۲۲۵) صفحات پر شائع ہوا ہے مزاحیہ مضامین میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ حضرت ناکارہ اور حضرت کوئی کے مضامین اچھے ہیں قیمت صرف ۱۲ ہے مستقل خریداروں کو مفت دیا جاتا ہے۔ "نیرنگِ خیال" کا سالنامہ بھی شائع ہوا ہے مگر ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ سالنامہ نہ تبادلہ میں بھیجا جاتا ہے اور نہ مستقل خریداروں کو مفت دیا جاتا ہے۔

"شاہد"

غمِ زندگانی

از خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی

آدھی سے زیادہ رات ڈھل چکی ہے۔ تمام شہر شہر خموشاں ہو رہا ہے۔ دروازہ کی کنڈی لگا کر میں اکیلا تھکا ماندہ پڑا ہوا ہوں۔ ؎

کانیست رواق سر بلندم | طارق دگر از نظر فگندم
تنہا بخیال خود نشستم | وز حاجب و بارگاہ رستم

میری آنکھ ابھی نہیں لگی تھی کہ اتنے میں دستک کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا کہ:۔
"اتنی رات گئے آنے والا کون ہے؟ اس وقت کوئی کسی کے ہاں جاتا آتا نہیں یہ وقت دروازہ کھولنے کا نہیں ہے"۔
جواب ملا کہ:۔
"دنیا میں مجھے سب جانتے ہیں۔ میرا نام شہرت ہے۔ میری تلاش میں اک جہان سرگرداں ہے۔ تو بھی میری جستجو میں تمام عمر مارا مارا پھرا۔ اب تھک کر بیٹھ رہا تو تجھے اس طرح مایوس دیکھکر میں تیرے پاس خود چلی آئی میرا مزاج بچوں کا سا ہے کہ کبھی بلانے سے نہیں آتی اور کبھی خود دوڑ کر گلے میں باہیں ڈال دیتی ہوں۔ میرے چاہنے والے اسے چلبلا پن کہتے ہیں"۔
میں نے کہا کہ "اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ اب ہم تھکے ہوئے پڑے ہیں۔ اسوقت تمہارے لئے کون اٹھے"۔ ؎

وعدۂ وصل صبح اُس سے کرو | کٹ سکے جس سے رات فرقت کی

پھر آواز بدل کر کوئی پکارا کہ "میرا نام جوانی ہے جسکو مرضِ عشق میں دیوانی کہتے ہیں۔ میرا پتہ حضرت شیخ سعدیؒ سے پوچھ لو کہ گلستان کا بابِ پنجم در عشق جوانی" میری خاطر سے لکھا۔ حضرتِ یوسف کی گرمی بازار میری بدولت ہو گئی جس کے لئے خدا نے زلیخا کو پھر جوانی دی"۔ ؎

یہ خوبیاں تھیں ذوقِ وصالِ دوام کی | ورنہ کبھی دعا سے زلیخا جواں نہ ہو

میں نے کہا "وہ باتیں گئیں۔ عشق و محبت میں ہجر و بیوفائی کے سوا کوئی بات نہیں۔ اگلے وقتوں کا ذکر جانے دو۔ اب تو جس سے پوچھیئے۔ یہی کہیگا ع چاہنے والا کس کو ملتا ہے؟ ہم جسکو چاہیں وہ ضد کر کے دوسرے کو چاہتا ہے"۔ ؎

یوسف بھی ہو تو اب نہیں پھرتے دن از فلک | وہ دن گئے کہ بخت زلیخا جواں ہوا

پھر آواز آئی کہ "میرا نام شعر و سخن ہے۔ میں باتیں کرنے آئی ہوں۔ میں تیری دمساز ہوں۔ مجھے آنے دے ع ابھی ساقی چھڑا دامن نہ ہم سے"۔ شعر و سخن کے لئے دل و دماغ چاہیئے۔ مدت ہوئی کہ دونوں رخصت ہو گئے ؎

تاب و طاقت تو کبھی کی کوچ یاں سے کر گئی | اب و داعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

زلف و سنبل کے ذکر سے دماغ پریشان ہوتا ہے۔ شبِ ہجراں کے نام سے جی گھبراتا ہے۔ خیالِ یار خواب میں

بھی نہیں آتا۔"

آواز آئی کہ "میرا نام **دولت دنیا** ہے۔ میں دروازہ پر کھڑی پکار رہی ہوں۔ مجھے آنے دے کہ خیالِ یار بھی میرے ساتھ ہے۔"

جواب ملا کہ "دیر کرکے آئی۔ بہرے کیلئے آوازِ غنا بیکار اور لنگڑے کے لئے ناچنا ہنسی میں داخل ہے۔" ؎

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے ۔۔۔ اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

پھر وہی آواز آئی جو اب تک بدل بدل کر آرہی تھی بولی کہ "جب تم کسی کو نہیں آنے دیتے تو سُن لو کہ میرا نام **موت** ہے۔ اِتنی آوازیں جو تیرے کان میں آئیں اُن سے یہی غرض تھی کہ "آخر فنا" دنیا کے تمام عیش و رنج کا مآل یہی ہے۔ مصیبت میں میرا ہی ساتھ اچھا ہے اور جب کہ ہر عیش کا انجام مصیبت ہے تو سب کو مجھ سے مفر نہیں۔ تو نے دروازہ نہیں کھولا۔ نہ کھول۔ میں نگاہِ یار کی طرح دل میں کام کر جاتی ہوں اور بسانِ شمیم کا کلِ مشکین دماغ میں پہونچتی ہوں۔"

میں نے کہا کہ "تجھے کون روک سکتا ہے۔ دل دردمند کو تیرا ہی سہارا ہے۔ دُنیا کو میں نے خوب دیکھ لیا۔ پھرتے پھرتے تھک گیا ہے جو تھک کے رہ گیا وہی ثابت قدم رہا۔"

جہاں جایئے یہی آسمان ہے۔ یہی زمین ہے۔ کوئی چیز نئی نہیں ہے۔ یہ آفتاب جو صبح کو نکلتا ہے ازل سے اسی طرح نکل رہا ہے۔ پہلے دن میں اِسے عجیب چیز سمجھا دوسرے اور تیسرے دن روز اسی طرح نکلتے اور غروب ہوتے دیکھکر جی اکتا گیا۔ اب میں اُٹھ کر اِسے نہیں دیکھتا۔ صبح کو آنکھ دیر میں کھُلے تو جگانیوالا کہدیتا ہے کہ آفتاب نکل آیا مگر کوئی دیکھنے نہیں نکلتا۔ ؎

گر آفتاب بعزمِ صبُوحی آید اسیر ۔۔۔ کسے ز گوشۂ میخانہ بر نمے خیزد

ہر سال وہی گرمی۔ جاڑا۔ برسات دیکھ لیجئے۔ آفتاب کے ساتھ دن اور چاند کے ساتھ رات سمجھ لیجئے۔ دُنیا مُنہ پھیر کر دیکھنے کی چیز نہیں کہ تقویمِ پارینہ کو کیا دیکھئے۔ اِنسان کے لئے جو دُنیا میں چالیس پچاس برس رہ لیا کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہیں رہی۔ نئی چیز اگر ہے تو صرف **موت** ہے کہ اِس کا مزہ ابھی نہیں چکھا ہے۔ ؎

ہم کو تو وقتِ نزع بھی ہے تیرا انتظار ۔۔۔ کیوں ورنہ ایسے حال میں ہر سُو نگاہ ہے

کہتے ہیں کہ اِس کا مزہ بہت تلخ ہے۔ لیکن تلخی ایسا بڑا عیب نہیں ہے شراب کی خوبی تلخی سے ہے اور علاج میں دوائے تلخ ہی مفید سمجھی جاتی ہے۔ اُس کی تلخی بہت ناگوار نہیں ہو سکتی۔ ہماری حرکتیں اِسے ناگوار کر دیتی ہیں کہ بسمل جس قدر تڑپے اُسی قدر تکلیف ہوگی اور ذبح کے وقت جانور جس قدر ہاتھ پیر مارے اُسیقدر جانکنی بڑھیگی۔

موت میں رنج کرنا اگر اِنسان کی نیچر میں ہے تو ہم نے بہت سی باتوں میں نیچر کو قابو میں کر رکھا ہے۔ بجلی جو اِنسان کے لئے بلائے جان تھی گرمیوں میں ہمارے سر پر پنکھا ہلاتی ہے اور رات کو مشعلچی کا کام دیتی ہے۔ پیام رسانی کے لئے قاصدی کرتی ہے اور معالجہ میں رگ و پے میں در آتی ہے۔ **موت** میں نا اُمیدی عذرِ گناہ

بدتر از گناہ سمجھنے کہ ادھر تو زندگی میں رنج و آلام کا ساتھ رہا (کون ہے جو رنج و آلام سے بچا؟) ادھر مرنے کے بعد بھی اگر رونا نصیبوں میں ہے تو لا تقنطوا کس دن کام آئیگا۔

دُنیا میں انسان مصیبت کو روک نہیں سکتا مگر ہر اُفتاد کی شامت کو اپنی بیقراری و اضطراب بڑھا لیتا ہے۔ سہ

چند وا فسر کی توقع میں جوانی تو چلی ———— سر نہ ملنے لگے اے حرص چنور سے پہلے

"عروسِ شرمگیں"

از حضرت حافظ غازی پوری

کوئی روٹھے نہ پھر آزردہ وجبیں بہ جبیں ہوکر ———— حرم کو جا رہا ہوں آج میں لیکن کہیں ہوکر

عدم کی جستجو کرتا ہوں دُنیا میں مکیں ہوکر ———— یہ ظاہر ہے وہاں پہونچیں گے سب لیکن یہیں ہوکر

بساطِ آرزو پر ہیں یہ جتنے نقشِ نیرنگی ———— خیالِ ناز میں گم ہیں "نیازِ بالیقیں" ہوکر

یوں ہی اِک محشرِ خاموش تھا سرتاپا کوئی ———— شبابِ حسن نے ڈھایا ستم اور آتشیں ہوکر

نسیمِ صبح میں "بالیدگی کی روح" پنہاں ہے ———— مقرر آرہی ہے یہ "کہیں" "یا کہیں" ہوکر

شبابِ یاسمیں کیا، نشاطِ فطرتِ رنگیں ———— جو چھا جاتا ہے اکثر روئے گل پر شرمگیں ہوکر

مری تعمیر میں پنہاں ہے خود ذاتی شرف اُسکا ———— اِسی سے باعثِ تنزینِ ہستی ہوں امیں ہوکر

یوں ہی نقشِ کفِ پا سے عیاں تھا جوہرِ تاباں ———— شعاعیں پھوٹ نکلیں اور مانوسِ جبیں ہوکر

تجھے جوشِ نمودِ حسن دیتا ہوں قسم تیری ———— بتادے کیوں چُھپا کرتے ہیں وہ حسن آفریں ہوکر

نگاہِ گرمِ رہبر نے کیا اتنا اثر مجھ پر ———— کہ ہمت لے اُڑی منزل سے آگے آتشیں ہوکر

تعیّن کی نظر سے ہٹ کے دیکھیں دیکھنے والے ———— فضائے گل میں ہے کوئی "عُروسِ شرمگیں" ہوکر

وہ اک ربطِ لطافت تھا مری بے ربط ہستی میں ———— کہ جُزوِ دل بنے جلوے ترے دل کے نگیں ہوکر

نشاطِ ذکرِ پیہم سے طبیعت کو تسلی دے
نکل جائے نہ روحِ آرزو حافظ حزیں ہوکر

شعر کیا ہے؟

از نواب شبیر حسین صاحب جوشؔ ملیح آبادی

نوٹ:۔ ہر سچا شاعر اپنے تخیل کی ایک نگری بسا لیتا ہے۔ جو تجلیات ربانی سے چراغاں رہتی ہے! اور جہاں شاعر کی روح سوچ کی پیاری پیاری گھڑیوں میں گلگشت کرکے اوروں کے دل و دماغ بھی جگمگا دیتی ہے۔ اسی عرفانی کیفیت کو حضرت امجدؔ نے بڑی خوبی سے ایک رباعی میں ادا کر دیا ہے فرماتے ہیں ؎

ہر مرتبہ آئینۂ دل دھلتا ہے — کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے

میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں — ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے

ایک دن جناب جوشؔ بھی اپنی روحانی نگری میں خوش خرام تھے اور تصور کو یہ جستجو تھی آخر شعر کیا ہے؟ اب "شعر" کبھی انہیں زمزمۂ داؤدی بنکر سنائی دیتا ہے۔ تو کبھی عکس رخِ یار معلوم ہوتا ہے۔ کبھی دیکھتے ہیں کہ حسنِ تخیل کا ایک بگولہ اُٹھا ہے جس میں خوبصورت ذرے چکر لگا رہے ہیں۔ تو کبھی رات ہو جاتی ہے اور اس سے انہیں ایسی سہانی آواز سنائی دیتی ہے جیسے پنکھڑیوں پر شبنم پڑ رہی ہے۔ یا یہ دکھائی دیتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں رنگین تارے ٹوٹتے ہیں! اور کبھی تو آنکھوں کے سامنے یہ منظر کھل پڑتا ہے کہ حسن کے چاند نے کھیت کیا ہے۔ جوئے قدرت رواں ہے اس جوبار میں ایک طرف اچھلتی ہوئی چاندنی کی بہار ہے تو دوسری طرف کنارے پر ایک من کا دولہا مسند لگائے حقیقت کی نازنین دلہن سے سرگوشی کر رہا ہے۔

سید وزیر حسن

شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام
مشتبہ سا اک اشارہ، ایک مبہم سا کلام

نشہ میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی

چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

پے حقیقت نے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پر اک عکس لامحدود کا

ظلمتِ اجمال میں تنویر تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی

شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا

شعر کیا ہے؟ غور کرتا ہے بلند آواز سے
دل کی سرگوشی حقیقت کی عروسِ ناز سے

جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں

شعر کیا؟ کچھ "سوچنا" دل میں بہ لحنِ دلنشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہکر کچھ نہ کہنے کا یقیں

شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ خیال
شعر کیا؟ عشق اور حکمت کا مقامِ اتصال

ہاتھ میں جھونکوں کے اک بجھتا ہوا دھندلا چراغ
جھلملانا دل کی شمعوں کا سرِ بزمِ دماغ

ترزبانی اور خاموشی کی باہم گفتگو
لفظ و معنی میں توازن کی مسلسل آرزو

نہر میں حسنِ قمر کی اک اچھلتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا!

فرمودات یگانہ

مکتوب

.... دلّی والوں کو اپنی پیاری دلّی سے محبت ہونا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے اُن کا تو پتلا اُسی خاکِ پاک کا بنا ہوا ہے مگر ہم ایسے بادیہ گرد کا بھی دل چیر کر دیکھا جائے تو دہلی کی محبت کسی نہ کسی گوشہ میں موجود ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مسلمان کے لئے مکّہ اور مدینہ کربلا اور نجف اور دیگر مقاماتِ مقدسہ اپنی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے زیارت کے قابل ہیں مگر مجھے اپنی دعا کے مستجاب ہونے کا یقین ہوتا تو بارگاہ ایزدی میں یہی عرض کرتا کہ دہلی میں دو گز زمین مل جاتی تو پھر جنت کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمارے بزرگوں کی ہڈیاں اور ہمارا تمدن دفن ہے۔

ــــہ (یگانہ)

یاد ایامیکہ تھا زندوں میں بھی اپنا شمار — زور تھا اپنے قلم میں بارِ دہ تھی تلوار میں
عمر گھٹنے کیلئے دو وقت کٹنے کے لئے — مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں
ناخدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی تو کھا — فکرِ ساحل چھوڑ لنگر ڈال دے منجدھار میں
نشہ یکرنگ میں دونوں ہیں کیا ڈوبے ہوئے — کیسی جنگِ زرگری ہو کافر و دیندار میں
ایسی پلا کہ ساقیا فکر نہ ہو نجات کی
نشہ کہیں اُتر نہ جائے روزِ شمار دیکھکر

یگانہ لکھنوی

حقیقت

حسن اپنی نظر سے گر جائے ہو سکتا نہیں
ہاتھ اپنے زوال پر ہے ہو سکتا نہیں
دورِ فلک انتقام سے بھی ڈھلے ہو سکتا نہیں
چڑھتا ہوا دن

اعترافِ حق

دلّی کی زبان لکھنؤ کیا جانے
میر و مرزا کی گفتگو کیا جانے
دل درد سے خالی ہو تو بکواس فضول
خاموش! زبانِ عشق تو کیا جانے

میرزا
یگانہ
لکھنوی

چپڑ ڈگڑ

از جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی
بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی

ایک صاحب کا بیان ہے کہ ایک صاحب حج کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوئے۔ نہ معلوم کس طرح بمبئی میں پکڑے گئے، جیل سے لوٹے ہیں تو حاجی لوگ حج سے واپس آرہے تھے۔ یہ بھی کچھ گھوم گھام کے گھر پہنچے تو حاجی! محلہ کے دو ایک حاجیوں نے ان سے پوچھا کہ "میاں تم وہاں حج میں کہاں تھے ہمیں نہیں ملے" انہوں نے جواب دیا "تم خود ہمیں نہیں ملے"

پھر کسی نے شبہ کرکے ان سے پوچھا کہ "بتایئے تو سہی آپ حج کو گئے تھے تو مکہ معظمہ میں عربی میں گھٹنے کو کیا کہتے ہیں؟"

انہوں نے کہا کہ "میاں تم بھی عجیب احمق ہو۔ عرب میں گھٹنا ہی نہیں ہوتا" "کم از کم ہم نے تو دیکھا نہیں۔ لوگ نیچے نیچے لبادے پہنے پھرتے ہیں"

کچھ قائل ہو کر انہوں نے کہا: "اچھا گھٹنے کو جانے دو تم یہ بتاؤ کہ اونٹ کے بڑے سے بچے کو کیا کہتے ہیں جو نہ تو پورا اونٹ ہو اور نہ بچہ ہو"

انہوں نے کہا "یہ بھی وہاں نہیں ہوتا"

وہ قائل کرنے کے لئے تیز ہو کر بولے "یہ کیونکر ممکن ہے!"

انہوں نے جواب دیا کہ "وہ اس طرح کہ وہاں پر اونٹ کے بچہ کو جب بہت چھوٹا ہوتا ہے، تب ہی جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں پھر پکڑتے جب ہیں جب پورا اونٹ ہو جاتا ہے"

(۱)

بس ہمارے مارواڑ کا بھی یہی حال ہے۔ چھوٹی عمر سے نکال دیتے ہیں باہر۔ جب تک وہ ایڈیٹر رہتا ہے باہر رہتا ہے اور جب مارواڑی ہو جاتا ہے تو واپس گھر آجاتا ہے۔ قصہ مختصر ہمارے یہاں ایڈیٹر ویڈیٹر کچھ نہیں ہوتا۔ بالکل۔

سوجت سے ریل میں بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اسی ڈبہ میں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے! (باقی مارواڑی تھے۔ میرے جیسے) میں نہ معلوم کیوں ان آدمی کے پاس جا بیٹھا۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ اتنی غور سے اس کے جواب میں میرے ایک بھائی مارواڑی نے اچھی طرح سونگھ کر جب اطمینان کر لیا کہ یہ مارواڑی ہرگز نہیں اور قطعی آدمی ہے تو نام اور پتہ پوچھ کر ان سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں مدیر ہوں" ان آدمی نے کچھ فخر کا گلا دباتے ہوئے کہا۔

لفظ مدیر کا نام سن کر میں بھی چونکا۔ آج پتہ چلاؤں گا یہ مدیر کیا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ میرے ہموطن نے تعجب سے کہا۔

"مدبر! کا ہے میں..... کیا؟.... مطلب میرا یہ ہے کہ کس عہدہ ..... آپ کہاں ... کون سے ضلع کے

"...میں ...م .... مدیر ہیں؟ ...آپ؟"

"جی۔ جی۔ میں مرتعش کا مدیر ہوں ..... رسالہ مرتعش کا مدیر ہوں ..... یہ پرچہ ......(انہوں نے رسالہ نکالتے ہوئے کہا) یہ پرچہ میرا ہے۔"

انہوں نے پرچہ لیا۔ پہلے اس کو ویسے ہی دیکھا۔ پھر بائیں ہاتھ سے عینک ماتھے پر رکھ کر دیکھا۔ پھر عینک ہی میں سے دیکھکر نہایت اطمینان سے آخر میں عینک کے اوپر سے دیکھنے لگے۔

پرچہ کو الٹ پلٹ کر مدیر صاحب سے پوچھا "اور اس کا اڈیٹر کون ہے؟" (رسالہ پر ایڈیٹر کا نام ڈھونڈھتے ہوئے)

مدیر صاحب نے ناک کے نتھنوں کو کچھ دائیں بائیں جنبش دی۔ مسکرائے۔ پھر بڑے انداز سے بولے "مدیر ایڈیٹر ہی کو کہتے ہیں۔"

ادھر میں خوش کہ میرا قیاس ٹھیک نکلا۔ مگر میرے ہموطن بولے "کیوں؟ یہ مدیر کیوں کہنے لگے؟ ایڈیٹر کو!"

مدیر صاحب بولے "مدیر کے معنی ایڈیٹر ہیں۔"

"عربی میں؟" مارواڑی بھائی بولے۔

"جی ہاں" مدیر صاحب بولے "جب ہمارے ہاں ایک لفظ مخصوص موجود ہے تو پھر کیوں اڈیٹر لکھیں۔"

مارواڑی بھائی کچھ گھبرا کر اس طرح بولے کہ جیسے مدیر صاحب کا نام پولیس میں "زیر نگرانی" ہے اور وہ خود حلقہ انسپکٹر پولیس۔ بولے:۔

"آپ کا کہاں رہنا ہے؟ کون ٹھکانا۔[1] آپ... عرب... عرب میں آپ... مگر"

"وطن؟" مدیر صاحب نے کہا "میں جونپور کا رہنے والا ہوں۔"

"خاص جونپور"

"جی نہیں۔ قصبہ کج گنواں۔ ضلع جونپور۔"

"ہیں!" چونک کے یہ بولے اور کہا "کج گنواں! ...... اجی "ٹیڑہ گنواں" تو نہیں جہاں کے محمد حسین صاحب ہمارے یہاں انسپکٹر تھے۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ پہلے اس کا یہی نام تھا" مسکرا کر مدیر صاحب بولے۔ "مگر اب ہم لوگوں نے گورنمنٹ میں عرضی دیکر اس کا نام بدلوا دیا۔[2] ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ ڈاکخانہ کا نام بھی بدل دیا گیا اور اب ہم لوگوں کی کوشش سے مستقل طور پر سرکاری طور سے اس کا نام کج گنواں ہو گیا۔"

"ہم لوگوں سے آپ کا کیا مطلب؟ کیا عرب لوگ وہاں آ گئے۔ یا ایران سے انڈے منگائے گئے۔"

ہنسکر مدیر صاحب بولے "خوب!"

کچھ بگڑ کر مارواڑی بھائی بولے "تو پھر جب آپ لوگ عرب نہیں تو پھر یہ آپ لوگوں نے کیوں طے کر رکھا ہے کہ

[1] مارواڑی محاورہ۔ [2] یہ ایک عبرتناک واقعہ ہے۔

ہم مارواڑی حیوانات کے سر اتنے بڑے بڑے جمادات سے جوڑیں۔"

یہ کہکر انہوں نے اپنے گلے کی رگیں پھلا کر اور آنکھوں میں ریت کی سی چمک اچھال کر اسی زور میں بولے "اوّل تو یہی آپ بتائیں کہ اس لفظ ایڈیٹر نے کس مدیر کے والد کو صدمہ جانکاہ پہونچایا تھا؟ اور یہ بتائیں کہ آپ نے آخر کب اور کس سے کسی عرب دوشیزہ سے شادی کر لی جو ایڈیٹر ایسے مقبول عام لفظ کے بجائے اپنی سسرال کا لفظ مدیر لے آئے جسے ہم حیوانات مارواڑ بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ کیا ہم روزانہ قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے؟"

اُچھل کر مدیر صاحب بولے "سبحان اللہ کیا تمیز ہے! ...... اجی حضرت کیا ضرورت ہے جو ہم انگریزی لفظ ایڈیٹر کو لیں......"

بات کاٹ کر۔ اور اپنے گلے کی ہر رگ کو ایک ٹھمکی دیکر گویا بھائی مارواڑی نے اپنی پتنگ (مارواڑی کھوپڑی) سنبھالی اور سپٹ پڑے "ہمارے یہاں مارواڑ میں ڈھول اڑ رہی ہے تمیز کا کیا کام۔ پھر لفظ ایڈیٹر .... کچھ انگریزوں کے باپ کا ہے؟ ...... انگریزوں کا اس لفظ پہ کوئی نام لکھا ہے؟ انگریزوں کی ایسی کی تیسی۔ آپ کا ڈر کے مارے انگریزوں کے دم کیوں نکلا جاتا ہے؟ انگریز تو دن دہاڑے لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ان کے یہاں لفظ خانساماں کی انگریزی نہیں؟ یا لفظ نالہ کی انگریزی نہیں؟ یا لفظ باورچی کی انگریزی نہیں؟ یا لفظ خدمتگار کی انگریزی نہیں؟ جو یہ باپ کا مال سمجھکر اردو کی جائداد قبضائے لے رہے ہیں۔ ایک تو ویسے ہی اردو میں لفظوں کی کمی اور اس پر یہ لوٹ مار! گویا آپ نے یہ سوچ رکھا ہے کہ ادہر ہمارا مال انگریز لوٹ لے جائیں گے اور ادہر ہم عربوں کے ہاں دہاڑا ماریں گے۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ انگریز تو اپنی زبان کے لئے یہ عیش مہیا کریں کہ ایک ایک چیز کی دس دس انگریزیاں موجود ہوتے ہوئے بھی جس زبان کا اچھا اور مناسب لفظ پائیں موقعہ سے لوٹ لیں اور جھٹ سے اپنی زبان میں شامل کر لیں اور ادہر آپ ہیں کہ یہ حرکت کر رہے ہیں کہ آئے ادائے لفظ نکال نکال کر پھینکے دے رہے ہیں"

نہ معلوم کیا کیا یہ حضرت اپنے ذہن میں بک گئے اور ختم اس جملہ پر کیا "تو حضرت یہ لفظ مدیر بجائے ایڈیٹر کے نکالا آخر کس نے؟ کیا آپ کسی رسالہ۔ کسی اردو اخبار کے اب سے پندرہ بیس برس پہلے کے کسی بھی پرچہ پر یہ غلط اور مکروہ لفظ لکھا ہوا دکھا سکتے ہیں؟ مجھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بھی ان فیوض میں سے صرف ایک ہے جن کا اجرا جمعیۃ العلمائے ہند نے فرمایا ہے۔ یہ ہمارے مولویوں کا ایک معمولی سا ادبی کارنامہ ہے۔ پبلک میں جس وقت مولویوں کو ہمارے مولانا محمد علیؒ مرحوم لائے تھے اس سے پہلے یہ لفظ "مدیر" قاموس کی "م" کی فہرست میں مزے سے پڑا سو رہا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے دُم پکڑ کر اس کی نکال کر دے مارا ہم مارواڑیوں کے سر پر!"

اب میں بولا "بجا فرمایا جناب نے۔ بیشک قبل اس کے کہ ہمارے علمائے کرام پبلک میں تشریف لائیں اور پریس اپنے ہاتھ میں لیں اس لفظ کا وجود ہندوستان میں نہ تھا"

"آپ کون؟" کچھ مشکوک نظروں سے انہوں نے کہا "کہاں رہنا ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "قبلہ میں بھی خارِ وطن ہوں"

"اچھا!" وہ بولے: "اچھا! آپ بھی مارواڑی....؟"

"جی ہاں"

"تو تو آپ خود غور فرمائیے کہ صاحب یہ لفظ مدیر ہے جسے ہم نہیں جانتے کہ ہے کیا بلا۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ قصور اس میں ہمارا ہی ہے تب بھی لفظ اڈیٹر کو کس بوجھڑ نے اردو سے نکالکر پھینک دیا۔ وہ لفظ جس کو ہر ہندی داں۔ انگریزی داں گجراتی۔ بنگالی۔ میسوری۔ مدراسی اور ہر مارواڑی اور ہر ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور جو اردو زبان میں جذب ہو کر رہ گیا تھا اُس کو یوں نکال کر پھینک دیا"

میری ذہنیت ملاحظہ ہو۔ ہوں نہ آخر مارواڑی ٹھیٹ۔ اپنے ہم وطن کی تائید کرنا میرا فرض منصبی ٹھیرا۔ اس سے بحث ہی نہیں کہ سچ ہو کہ جھوٹ۔ چنانچہ میں نے بھی دھاندلی کی۔ اور حماقت تو دیکھئے میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اردو سے ایسے لفظ ہرگز نہ نکالے جائیں جو عام طور پر (ہر کس و ناکس سے بحث نہیں) ہر مارواڑی سمجھ سکتا ہے۔ یعنی وہ لفظ جو عموماً ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں میں اور اردو میں مشترکہ طور پر لکھے اور بولے جاتے ہیں یا پھر لکھے اور بولے جا سکتے ہیں اور اردو میں اچھی طرح کھپ چکے ہیں یا آسانی سے موزونیت کے ساتھ کھپ سکتے ہیں۔ خواہ وہ انگریزوں کے ہوں یا نگریزوں کے"

مدیر صاحب نے فرمایا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ انگریزی داں حضرات خواہ مخواہ انگریزی الفاظ اردو میں ٹھونستے ہیں اس سے زبان خراب ہو رہی ہے۔

"غلط۔ بالکل غلط" مارواڑی صاحب بولے "اردو زبان میں کون سا لفظ ایسا موجود ہے جس کے بجائے کسی ذمہ دار انگریزی داں نے انگریزی لفظ ٹھونسا ہو۔ ہاں جو جگہ خالی ہے اور ایک لفظ انگریزی کا موجود ہے اور دوسرا عربی کا تو بیشک انگریزی کا لفظ لیا جائیگا اور وہ محض اس لئے کہ اس کو صرف ایک مولویوں کا طبقہ چھوڑ کر سارا ہندوستان آسانی سے سمجھیگا اور وہ بہ نسبت عربی لفظ کے کہیں زیادہ موزوں ہوگا"

قبل اس کے کہ مدیر صاحب کوئی ایسا لفظ انگریزی کا بتا کر مارواڑی احمق کو قائل کریں وہ حضرت زور سے چلائے "اہا! ....ابھی حضرت ... یہ آپ ہیں! آپ!....."

یہ کہہ کر انہوں نے رسالہ "مرتعش" کے ایڈیٹوریل نوٹ بعنوان "ارتعاشات" سے حسب ذیل عبارت پڑھی۔

بمبئی کے علم دوست "بواہیر" نے چند "مواہیر" طلائی رسالہ "مرتعش" کے "خازن" کے نام بھیجی ہیں....."

پڑھکر انہوں نے مدیر صاحب سے پوچھا۔

"کیوں حضرت یہ "بواہیر" اور یہ "مواہیر" اور یہ "خازن"! آخر یہ کیا بلائیں ہیں! یہ میں بہت دن سے تلاش کر رہا تھا کہ یہ بوہرہ کی جمع بجائے بوہروں کے کس نے بنائی ہے اور سونے کی مُہر کی جمع بجائے مُہروں کے مواہیر کس نے بنائی ہے اور یہ بیچارے خزانچی کی ٹانگیں چیر کر کس نے پھینک دیا جو صرف "خازن" رہ گیا۔ آج پتہ چلا کہ یہ آپ حضرت ہیں۔ مگر یہ آخر کس قاعدے سے آپ نے جمع بنائی ہے!"

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور حبِّ وطن کو خیرباد کہہ کر میں بول اٹھا "اجی حضرت یہ عربی قاعدہ سے جمع بنائی گئی ہے ....."

"کیوں؟" وہ بولے "کیا جمع بنانے کا اردو قاعدہ مر گیا؟"

میں نے کہا "قبلہ آپ اس وقت غلطی پر ہیں۔ اردو قاعدہ بالکل بے ڈھنگا ہے اور ہمیں اس بارہ میں مولوی صاحبان کا مشکور ہونا چاہیئے کیونکہ عربی قاعدہ جمع بنانے کا بے حد فصیح و بلیغ ہے اور اردو میں اس کا رواج دینا بے حد ضروری ہے۔ جس لفظ کی آپ بجائے اردو قاعدے کے عربی قاعدے سے جمع بنائیں گے خواہ مخواہ اس میں فصاحت آجائیگی۔"

وہ بولے "مثلاً"

میں نے کہا "اخباروں کے بجائے اخبارات۔ مضمونوں کے بجائے مضامین۔ لفظوں کے بجائے الفاظ۔ حرفوں کے بجائے حروف۔"

وہ حضرت مارواڑی بولے "بہت خوب! واقعی کیا فصاحت و بلاغت آگئی۔ کیوں نہ ہو کیا کہنا ہے۔ مثلاً لوٹے کی لواٹیٹ۔ جوتہ کی جوائیت اور چیزوں کی چوازیز........... آہا! اجی حضرت یہ فاتحہ (فاقیاں) درود! آہاہا۔ ....."

مدیر صاحب ان مارواڑی کی حماقت پر ہنس ہی رہے تھے اور اب بولے "خیر تو ہے جناب"

وہ بولے "یہ ہندوں کا اور پھر وہ بھی جیتے جی درود فاتحہ کیسے ہونے لگا....... (رسالہ کا ایک صفحہ دکھا کر سرخی بتائی) "مہاشہ سدرشن کا ورود"

ہنسکر مدیر صاحب بولے "اجی حضرت آپ تو بچہ ہو گئے۔ مہاشہ جی ادبی حیثیت سے مشہور و معروف آدمی ہیں۔ دہلی آنے والے ہیں۔ اور ورود کے معنی ہیں آنے کے۔ انکی آمد آمد کی خبر سن کر یہ خبر درج کی گئی ہے۔"

"اچھا!" وہ مارواڑی صاحب بولے "یہ ان کے "ورود ورود" کی خبر سنکر یہ خبر لکھی گئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آمد نامہ پھاڑ ڈالا گیا..... آہاہا!... ہا...... ارے!..."

"خیر تو ہے" میں نے کہا "اور کچھ؟"

اب مارواڑی صاحب سنجیدگی سے بولے مدیر صاحب سے "اور کیوں حضرت۔ خیر سے یہ بچوں کی طرح تتلانا اور اٹھلانا بھی کوئی ادبی انداز ہے؟ سنا تھا کہ ایک بڑے سے صاحبزادے اپنی انا کی گود میں تھے۔ کسی نے پوچھا کہ میاں کیا پڑھتے ہو۔ تو شرما گئے۔ اور اٹھلا کر اپنی انا سے فرمانے لگے کہ کہدو ان سے "تُل بلا پلتے ہیں" یعنی قل ہو اللہ پڑھتے ہیں۔ ذرا بتائیے تو یہ ادبی انداز کس طرح ہم مارواڑیوں کے دلوں کو چھینے لیتا ہے۔ ہاتھ ہاتھ بھر کی داڑھیاں اور بچوں کی طرح گردن نیچی کر کے شرما کر اور اٹھلا کر فرماتے ہیں۔

"جامعہ ملیہ دہلی نے اردو "اکادمی" کھولی ہے"

"کیوں صاحب آخر کیا وجہ ہے کہ اٹھلا کر داڑھی پر ہاتھ پھیر کر شرما کر کسی پاس بیٹھنے والے سے کہدیں کہ لوگوں سے

کہدو "جامعہ ملیہ نے اردو کی اکادمی تھولی (کھولی) ہے۔ بچہ ہیں ناب چارے۔ جو لفظ "ڈال" زبان سے نہیں نکلتا .... اجی حضرت ہم تو انگریزوں کی ہیٹ کھا گئے مگر یہ حضرات عربی بلغم کھا گئے کیا۔ جو "ڈ" اور "ٹ" کو طلاق دے دیتے ہیں؟ پھر صاحب ہم آدمیوں کے بارہ میں تو کہہ نہیں سکتے ہاں مارواڑیوں کے بارہ میں خود کہہ سکتے ہیں کہ یہ عین و غین کی بلاغنڈر بود اردو۔ دافع قبض ہو تو ہو مگر ہم مارواڑیوں کے سر پر یہ عربی بلغم کی بارش! .... بخدا مر جائیں گے ہم اس ادبی انفلوئنزا سے "

اب ہمیں بھی خیال آیا کہ یار یہ بادلا ہم وطن اب بات تو ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے پاس جب طرح طرح کے چمکیلے اور رنگیلے اردو رسالے آتے ہیں تو یہ گفار یعنی ہندو جو زعم رکھتے ہیں کہ ہم بھی اردو کے کوئی ہیں (جیسے اردو کے باوا یہی تو ہیں) یہ سمجھ کر دوڑ رتے ہیں کہ ہم بھی اردو پڑھے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں یہ کیا؟ کیونکہ اس قسم کی اردو ان کے سامنے ہوتی ہے:۔

"گورنمنٹ کے وہ مواعید جو اس نے وقتاً فوقتاً جمعیۃ العلمائے ہند و نیز دیگر احرار سے کئے۔ وہ مکبرت الصوت کے ذریعے سے اخبارات و رسائل کثیر الشیوع میں اشاعت پذیر ہوئے"

چنانچہ یہ اردو سے محبت کرنے والے (ظاہری) جانور کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناکام ہوتے ہیں۔ اپنی قسمت پر افسوس کرتے ہیں۔ رسالہ پھینک دیتے ہیں اور شکر کرتے ہیں کہ اچھا ہوا یہ کثیر الشیوع اردو مارواڑ سے لدگئی۔ اور اس کی جگہ سرکاری اور دفتروں (دفاتر) کی زبان ہندی ہوگئی۔ اور وہ دن کب آئیگا جب جیپور سے بھی یہ اردو کان پکڑ کر نکالی جائے گی کیونکہ بوجہ عربی انفلوئنزا کے بیکار ہوگئی ہے۔ کیونکہ یہ جو آپ چاہیں کہ محض اسی عربی زدہ اردو کی وجہ سے ہندو لوگ عربی اور فارسی پڑھنا شروع کر دیں تو یہ تو ناممکن ہے۔

اتنے میں اسٹیشن آگیا اور مدیر صاحب مارواڑ جنکشن پر اتر گئے اور ہم دونوں مارواڑی گدھے رہ گئے۔ لیکن فوراً ہی ایک اور صاحب آدمی نمودار ہوئے۔ کوٹ پتلون پہنے ہیٹ لگائے۔ دہنیں سے بیزار مگر سگار پیتے ہوئے۔ ان کی جیب میں کچھ کاغذات تھے اور ہاتھ میں کچھ کتابیں۔ انہوں نے پہلے تو اپنا مختصر اسباب رکھوایا اور پھر ہم دونوں کی طرف دیکھ کر دہونہیں سے اظہار بیزاری کرتے ہوئے ہمارے پاس آبیٹھے کہ میرے ہموطن بھائی نے پھر اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا اور کچھ عرصہ سے وہ بولے "جب تک یہ مدیر لوگ لفظوں کے بجائے الفاظ رسالوں کے بجائے رسائل اور کتب اور "اس قسم کے لطف" کے بجائے "اس نوع کا تلذذ" کہنا نہیں چھوڑیں گے ہم ان کے کسی رسالہ کو مارواڑ میں نہ گھسنے دیں گے۔ قسم ہے ان لوگوں کو کہ یہ اردو کو مشکل سے مشکل بنائے جائیں عربی ٹھونس ٹھونس کے اور ہمیں بھی قسم ہے کہ نہ اس عربی کی نانی کو کان پکڑ کر راجپوتانہ سے نکال دیں"

میں نے کہا اجی حضرت "آپ تو حد سے بڑھ گئے"

وہ بولے "عزیزم تم کیا جانو۔ کلیجہ میں ناسور ڈال دیا انہوں نے۔ ان آنکھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب مارواڑ کی سرکاری زبان اردو تھی۔ پھر یہاں اردو کی بدقسمتی سے ایسے لوگ آئے جنہوں نے عربی بندشوں اور نت نئے فارسی محاوروں سے ناطقہ

بند کر دیا۔ چنانچہ ایک مجسٹریٹ صاحب نے جو مونوی تھے اپنے فیصلہ میں خواہ مخواہ بجائے "مٹی کے برتن" کے فیصلہ[1] میں لکھدیا "ظروف گلی" وہ نقل ہو کر مارواڑی زبان میں "جرد پھ گلی" ہو گیا۔ فیصلہ بہ سلسلہ اپیل دوسری عدالت میں پہونچا اور وہاں سے تیسری عدالت میں اور اس "گلی جرو پھ" کا معمہ آخرکار یہ رنگ لایا کہ جب ایجنسی یعنی میجر جنرل ہز ہائینس مہاراجہ سر پرتاب سنگھ جی بہادر ریجنٹ کی عدالت العالیہ میں پہونچا تو وہاں یہ تنقیح طلب امر قرار پایا کہ یہ "جرو پھ گلی" کیا بلا ہے۔ کچھ وکیلوں نے اس "گلی" پر اپنی عقل کے ڈنڈے رسید کیے اور کچھ اہلکاروں نے "پکا لیکی" نتیجہ یہ کہ طے ہوا کہ کوئی ماہر بلایا جائے۔ چنانچہ دو چار اہلکاروں نے سر کھپایا اور پھر کسی تل آعوذ یہ کی امداد سے آخر کو حقیقت کا پتہ لگا ہی لیا۔ مہاراجہ سر پرتاب سنگھ ایک اوجڈ اور ٹھیٹ مارواڑی سپاہی آدمی ٹھہرے۔ وہ پیشتر سے ہی جھینک رہے تھے کہ اردو انہیں نہیں بھاتی ہے۔ اب تنگ آگئے۔ اور انہوں نے آخر کو حسب ذیل الفاظ کہے جو اردو کے لئے مارواڑ میں تواریخی ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے کہا۔

"میں ان برتنوں کو پھوڑے ڈالتا ہوں" یہ کہہ کر حکم دیدیا کہ اردو کان پکڑ کر مارواڑ سے نکالدی جائے اور اردو داں اہلکار یا تو اپنی زبان مع عقل کے ٹھیک کریں ورنہ انہیں بھی نکالو۔ بس یہ حکم نافذ ہونا تھا کہ سب کی عقل درست ہوئی اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اب مسلمانوں کا بھی آج مارواڑ میں جو حال ہے تم خود دیکھتے ہو کہ ذاتی خط و کتابت میں اور گھریلو معاملات تک میں بھی اردو کا نام نہیں لیتے"

اب ان نووارد حضرت سے صبر نہ ہو سکا اور وہ بولے۔

"حضرت یہ واقعہ ہے کہ اردو میں عربی کے لفظوں کے مارے ناطقہ بند ہے۔ ساری زبان خراب ہوئی جا رہی ہے۔ بڑی ضرورت اسکی ہے کہ ہم اب قدم آگے بڑھائیں اور........"

یہ کہہ کر وہ بامعنی نگاہوں سے میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ پھر میرے ہم وطن کی طرف اور پھر میری طرف۔ میں سمجھا کہ "قدم آگے بڑھائیں" سے ان کا سوائے اس کے کچھ مطلب نہیں کہ اس قسم کے عربی زدہ لوگوں کو مار ڈالا جائے۔ کم از کم انکے کسی وجہ سے چپ ہو کر اس طرح دیکھنے سے میں تو یہی سمجھا مگر انہوں نے معاملہ صاف کیا:

"بغیر ترمیم اور اصلاح کے یہ اردو ٹھیک نہیں ہوگی"

"وہ کیسے" کچھ ڈرتے ڈرتے میں نے کہا۔

"وہ ایسے" انہوں نے کہا۔ وہ ایسے کہ "اردو میں سے سب سے پہلے وہ تمام ہم آواز حروف نکال ڈالے جائیں جو ہوں۔ ان تمام ایسوں کے لئے اردو لکھنا پڑھنا مصیبت کر رکھی ہے جو عربی فارسی نہیں جانتے۔ ذرا غور فرمایئے۔ ض ز ذ ظ۔ یہ تمام حرف شاید لوگوں کو تنگ کرنے کے لئے ہی رہنے دئے گئے ہیں۔ ہوگا ان کا ضرور فائدہ مگر دیکھئے اب کلان نوں نے کیا لالہ بھائیوں کا ناطقہ بند کیا ہے کہ ض کے بدلے ذ لکھے ڈالتے ہیں اور ز کے بدلے ظ۔ بس اس کا یہ علاج ہے کہ ایک حرف رکھ لیا جائے باقی کو نکال باہر کریں۔"

اب میں نے اپنے بھائی مارواڑی کو دیکھا۔ میں خود کچھ گڑبڑایا۔ اس نے تو میرے ہموطن کے بھی کان کاٹ لئے۔ اب میں

---

[1] یہ واقعہ ہے۔

یہ سوچ رہا تھا کہ کیا رائے ہوگی ان کی۔ چنانچہ وہ بولے:۔

"واہ حضرت یہ تجویز تو کچھ ٹھیک نہیں"

"ہو یا نہ ہو" وہ بولے "ہم نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ جہانتک ہم سے یہ ممکن ہوگا یہی کریں گے۔ چنانچہ اب ارادہ ہو رہا ہے کہ نئے سرے سے اردو کی ہم کایا پلٹ کر دیں۔ دیکھئے میں ابھی آپ کو تمام تجویزیں بتاتا ہوں"

یہ کہکر انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک مسودہ نکالا اور کہا:۔

"یہ میرا رسالہ ہے" اصلاح اردو" چھوٹا سا ہے صرف معمولی سی تجویزیں ہیں سنئے:۔

(۱) عربی قاعدہ تحریر کا ترک کر دیا جائے۔ مثلاً "بالکل" کو "بلکل" لکھا جائے "شمس الحسن" کو "شمسلحسن" لکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) تمام ہم آواز حروف نکال ڈالے جائیں۔

(۳) اور اگر فی الحال یہ ہم آواز حروف نہیں نکالے جا سکتے تو کم از کم ہر کس و ناکس کو اجازت ہو کہ جو حرف جی چاہے استعمال کرے مثلاً "عالم" کو "آلم" چاہے تو لکھ سکتا ہے "محفوظ" کو چاہے "مہفوز" لکھے سب ٹھیک ہے۔

"مگر جناب یہ گڑبڑ تو ٹھیک نہیں ہے" میرے ہموطن نے اس مجوزہ غدر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا "آپ تو اردو کا ستیاناس کر ڈالیں گے ...."

"ارے! ..." انہوں نے کہا "جناب! آپ سن تو لیں پوری تفصیل۔ میں تو ایک انقلاب کی تجویز پیش کر رہا ہوں۔ ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے اردو کو تمام دنیا کی زبانوں سے بے نیاز نہ کر دیا ہو تو میرا نام! پوچھئے وہ کیسے"؟

میں نے تعمیل ارشاد کی اور ان سے پوچھا کہ "وہ کیسے؟"

"وہ ایسے" انہوں نے بیحد خوش ہو کر کہا "وہ ایسے کہ عربی کی غلامی سے سب سے پہلے اردو کو آزاد کرا دونگا۔ دیکھ ہی لیا آپ نے کہ میری تجویز کیمطابق عربی کی غلامی سے آزاد ہو کر اردو کی املا میں کس طرح آسانیاں پیدا ہو گئیں اور اب لیجئے میں فن تاریخ گوئی میں وہ آسانیاں فراہم کئے دیتا ہوں، کہ مادہ نکالنے والے ایک دم سے عربی کی غلامی سے آزاد ہو کر قیامت تک مجھے دعائیں دیتے رہیں مگر قبل اس کے کہ میں بتاؤں کہ میں نے کیا تجویز کی ہے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ قواعد عربی مادہ نکالنے کے جو اردو میں رائج ہیں عجیب ہی لغو ہیں"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"وہ اس طرح کہ آپ خود غور کیجئے کہ اس نامعقول عربی ابجد، ہوز میں کوئی انتظام اردو کے خاص حرفوں کا نہیں۔ نہ تو "ٹ" ہے نہ "ڑ" ہے۔ نہ "چ" ہے مجبوراً "ج" کے عدد اتنے ہی رکھے گئے ہیں جتنے "ج" کے آخر کیا وجہ جو "گ" اور "چ" اور "ٹ" اور "ڈ" وغیرہ کے عدد کیوں نہ ہم مقرر کر لیں اور ابجد کو اس طرح مکمل کر لیں" یہ کہکر انہوں نے مسودہ میرے سامنے رکھدیا اور میرے سامنے مکمل ابجد اس طرح موجود تھی:۔

"ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ، چپٹڑ ڈ گڑ" "چپٹڑ ڈ گڑ" میں نے تعجب سے منہ پھاڑ کر کہا۔ جھٹکے کیساتھ ریل رکی۔ "گڑ" انہوں نے کہا "گڑ"! "ارے چپٹڑ ڈو" میرے ہموطن نے رو کر کہا۔ "اور گڑ" میں نے لاچار ہو کر کہا۔ ہم دونوں ان حضرت کو احترام سے دیکھتے ہوئے اترے اسٹیشن پر چاروں طرف شور قیامت برپا تھا۔ اگر کوئی بکس پٹخ کر "چپٹڑ ڈ" کہتا تھا تو کوئی دوسرا قلی بستر اٹھا کر کہتا تھا "گڑ ڑ.... ڑ.... ڑ..."

داستانِ عبرت

از جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب دہلوی بی۔ اے

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ		بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

رشید۔ دیکھو بھئی حسن، ہم تم کو پہلے بھی سمجھا چکے ہیں اب پھر جتاتے ہیں کہ تم اس وقت بڑی غلطی کر رہے ہو، اس طرح اندھا دھند روپیہ اُڑانا ٹھیک نہیں۔

حسن۔ اماں، لاحول ولاقوۃ، تم کو ہمیشہ روپے ہی کی فکر لگی رہتی ہے۔ روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے آتا جاتا ہی رہتا ہے، دنیا میں دھرا ہی کیا ہے کھاؤ پیو مزے کرو۔

رشید۔ سچ ہے مگر تمہاری طرح آنکھوں پر پٹی باندھ لینا بھی دور اندیشی سے بعید ہے۔

حسن۔ آخر ابا جان نے کونسی دور اندیشی کی کہ تمام عمر مصیبت میں بھرکی اور چلتے بنے۔

رشید۔ میاں اگر وہ چلن کے نہ ہوتے تو آج تم کو یہ ساٹھ ہزار روپیہ کہاں سے ملتا وہ تمہاری طرح روپیہ پھونکنے والے نہیں تھے۔ ہاں موقع پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے مگر فضول خرچ نہ تھے۔

حسن۔ تو میں کونسی فضول خرچی کر رہا ہوں، دوست، روپیہ ہوتے ساتھی تو پاؤ نہیں بیلے جانے، خود اللہ میاں نے کلوا وانشر بوا کا حکم دیا ہے۔

رشید۔ شاباش میاں شاباش۔ کلوا وانشر بوا کے ساتھ کیا ولاتسرفوا کو بھی کھا جاؤ گے، اپنے مطلب کی باتیں بنانا تو بہت آسان ہے۔ خیر بھئی تم جانو تمہارا کام ہمارا کام سمجھانا تھا مانو نہ مانو تم کو اختیار ہے۔ زمانہ کی ٹھوکریں کھا کر خود سمجھ جاؤ گے۔ یہ جو تمہارے دوست فیضو و دینو ہیں تمہارا سر سہلا کر بھیجا نہ کھا جائیں تو ہمارا ذمہ، اچھا لو خدا حافظ۔

حسن۔ ارے یار کیا بالکل خفا ہی ہو گئے سنو تو سہی۔

رشید۔ اب مجھ کو اسٹیشن جانا ہے میرا تبادلہ ہو گیا ہے، اتنا وقت نہیں کہ ٹھیروں زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔

رشید نے یہ کہکر گھر کی راہ لی اور حسن نے کچھ تامل کے بعد اپنے احباب کا رُخ کیا اور رنگ رلیوں میں محو ہو گیا، رشید کی نصیحت کا اس پر اثر نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ وہ جوانی کے نشہ میں سرشار تھا اُس کے والد کو مرے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا، اُس نے جواہرات کی تجارت میں ہزاروں روپیہ پیدا کئے تھے، قسمت کا دھنی تھا جس چیز کو چھُوتا پارس ہو جاتا جس کام میں ہاتھ ڈالتا وارے نیارے ہو جاتے، مختصر یہ کہ موتی رُولے تھے مگر اس کے باوجود بھی آدمی چلن کا تھا، اللے تللے نہیں کرتا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ مرتے وقت اتنی دولت چھوڑ مرا کہ اگر سلیقہ سے خرچ کی جاتی تو کئی پیڑیوں کے لئے کافی ہوتی۔ مگر حسن کسی بنئے کا بچہ تو تھا ہی نہیں کہ اُس کو دولت برقرار رکھنے یا بڑھانے کی فکر ہوتی، وہ تو باپ کی گاڑھے پسینہ کی کمائی اُڑانے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ خرچ کے معاملہ میں اس کا ہاتھ ابتدا ہی سے کھُلا ہوا تھا، دس کی تھی نہیں کی جو ہاتھ لگتا اُڑا ڈالتا۔ خدا بھلا کرے اس دولت کا تعلیم بھی ٹھیک طرح نہ ہونے دی، جوں توں کر کے

کالج کی ابتدائی جماعتوں میں پہنچا تھا کہ گھوڑ دوڑ کے شوق نے دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ اسی لت کے باعث کالج کو خیرباد کہا۔ یار دوستوں کے ساتھ کبھی کلکتہ جا کر روپیہ ہار آتا۔ کبھی بمبئی۔ باپ بچارہ اپنی تجارت میں لگا رہتا۔ بیٹے صاحب یہ گلچھرے اڑاتے رہتے۔ باپ کے مرنے کے بعد تو میدان بالکل صاف ہو گیا اور اس کو لاٹ کی بھی پرواہ نہ رہی صبح سے شام تک وہ تھا اور یار دوست۔ گھڑ دوڑ ہوتا، ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں، شراب و کباب اُڑتے اور زندگی کے پورے پورے لطف اٹھائے جاتے۔ جہاں دولت کی افراط ہو وہاں بھلا دوستوں کی کیا کمی۔ حسن کے ارد گرد بھی ہر وقت مصاحبین کا ایک حلقہ رہتا اور میاں حسن سے ملک کے نواب بنے رہتے۔ دنیا میں ایسے ہوشیار لوگوں کی کمی نہیں جو ایسے موقعوں پر بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے میں دیر نہیں کرتے۔ چنانچہ یار لوگوں نے ان کی حماقت سے خوب فائدہ اٹھایا۔

البتہ رشید ہی ایک ایسے دوست آدمی تھے جو اس طرح فائدہ اٹھانے کو حرام سمجھتے تھے۔ اُن کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ حسن کو راہِ راست پر لے آئیں مگر وہ حضرت ایسے چکنے گھڑے ہو گئے تھے کہ ذرا اثر نہ ہوتا۔ رشید کی باتیں اس کان سنتے اس کان اڑا دیتے۔ آخر جب رشید نے دیکھا کہ کسی طرح حسن پر اثر ہوتا ہی نہیں تو اس کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا اور علیحدگی اختیار کر لی۔

رشید کا دم بھی غنیمت تھا اس کی وجہ سے حسن کے جانثاروں کو اپنے دل کے حوصلے نکالنے کا موقع ذرا کم ملتا تھا۔ ہر وقت کی روک ٹوک کے باعث رشید ان کی نظر میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ اور وہ دعا کرتے تھے کہ اس نیلی چھتری والا ... ذرا اس کو ... ہو۔ آخر مراد بر آئی ... رشید علیحدہ ہو گئے اور گھی کے چراغ جل گئے۔ اب کیا تھا جس طرح مردہ پر گدھ آ کر گرتے ہیں اسی طرح ان نمک حراموں نے اس بچارے نئے نواب کو لوٹنا شروع کر دیا۔ کوئی شراب کے نشہ میں اس پر ہاتھ صاف کرتا۔ کوئی عورت کے پھندے میں پھنسا کر اس کو الّو بناتا اور کوئی امداد کے پردہ میں بچارے کا سر مونڈتا۔ غرضیکہ اسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ دولت آخر کب تک چلتی۔ ایسے اندھا دھند کارخانوں کے لئے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوتا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں جو کچھ نقدی تھی وہ سب شراب و کباب اور دوست احباب کی نذر ہو گئی اور اب یاروں کی نظریں جواہرات پر پڑنے لگیں۔ اور طرح طرح سے شہ ملنی شروع ہوئی۔ اُدھر خود حسن کو جو شراب وغیرہ کی چاٹ پڑ گئی تھی اس نے اس کو بالکل اندھا بنا دیا تھا۔ دوستوں نے جو مشورہ دیا اس پر آمنّا و صدّقنا کہا اور جو چیز مانگی لا کر حوالہ کر دی۔ دوستوں نے ہزار کی چیز کے پانسو اور پانسو کی چیز کے سو لا کر دئے۔ چیز اپنے ڈھب میں رکھی اور طرّہ یہ کہ جو رقم لا کر دی اس میں سے الگ حصہ اینٹھا، مختصر یہ کہ ایک لُوٹ مچی ہوئی تھی۔ ہر ایک اپنی دوستی اور وفاداری کا یقین دلا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہا تھا یہانتک کہ ایک ایک کر کے سب چیزیں خالصہ لگ گئیں۔ مگر ابھی یہ غمخوار دوست کب ماننے والے تھے۔ شہد کی مکھیوں کی طرح اب بھی لپٹے ہی رہے۔ لیکن اب نہ تو نقدی تھی نہ جواہرات۔ اب انہوں نے جائداد کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ جب ضرورت لاحق ہوتی فوراً قرض لینے کا مشو

دیا جاتا اور حسن اس کو فوراً قبول کر لیتا۔ کبھی کوئی دوست صاحب خود قرض لا کر دیتے مگر اس انداز سے کہ ہزار دیئے تو پانچ ہزار کی دستاویز پر دستخط لے لیے۔ کبھی مارواڑی سے لا کر قرض دیا جاتا اور مارواڑی سے حصہ الگ ٹھیرایا جاتا۔ مارواڑی کی ذات بھلا کب چوکنے والی ہے۔ وہ چند ہی روز میں سود در سود کے حساب سے اصل سے دس گنا اور بیس گنا لگا کر نواب صاحب کی گردن دبانی شروع کر دیتا۔ تب ایک طرف سے تقاضوں کا بوجھ دوسری طرف سے نالش کا ڈر ہوتا۔ دوست احباب مشورہ دیتے کہ فلاں مکان اگر فروخت کر دیا جائے تو اس مصیبت سے چھٹکارا ہو جائیگا اور بالآخر کسی نہ کسی طرح حسن کو اس پر راضی ہی کر لیتے اور [illegible] پونے داموں مکان بیچ ڈالتے۔ بیچنے کیا خود ہی خرید لیتے۔ اور معمولی سی رقم لا کر نواب صاحب کے حوالے کرتے۔ [illegible] طرح شدہ شدہ جائداد بھی خاک میں مل گئی۔

تنگی ترشی میں بسر کرتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک [illegible] مصیبت آ نازل ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبتیں تنہا نہیں آتیں۔ حسن کو بیماری نے آگھیرا [illegible] ہو گیا۔ [illegible] گل گئے حالت روز بروز بد سے بدتر [illegible] ہی گئی۔ مگر کیا کرتے نہ پیسہ پاس نہ کوئی مونس و غمگسار [illegible] سوائے آپریشن کے دوسرا علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ آپریشن کے واسطے [illegible] رقم کی ضرورت تھی۔ یہ رقم آئے تو کہاں سے [illegible] غم اور بیماری میں گھل گھل کر کانٹا ہو گئے۔ ان کے لنگوٹیا یار نصو اب بھی برابر آتے اور ہر طرح زبانی تسلی و تشفی [illegible] رہتے مگر گانٹھ کے کچے نہ تھے جو دوست کو کچھ لا کر دیدیتے۔

[illegible] ہی مایوسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا فیضو صاحب تشریف لائے بہت دیر تک بیٹھے [illegible] دلاسے دیتے رہے، آخر کہنے لگے "ارے میاں آخر یہ آپریشن کیوں نہیں کرا ڈالتے کب تک [illegible] لیے بیٹھے رہو گے"

[illegible] نے جواب دیا کہ کس طرح کراؤں روپے کی ضرورت ہے اور میرے پاس [illegible] ہے نہیں۔ لاؤ تم ہی [illegible] دیدو ایسا بھی کیا ہے کہ تم بالکل خالی ہاتھ ہو"

"[illegible] بھئی خوب کہی۔ میں اور روپیہ ارے میاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں" روپیہ تم سے بڑھ کر نہیں [illegible] میں دریغ کرتا واللہ میری حالت بس خدا ہی خوب جانتا ہے کل ہی کی بات ہے کہ بیوی کی ہنسلی رہن [illegible] سیٹھ پنا مل کا قرض ادا کیا ہے۔

تعجب ہے، سلیم کہتے تھے کہ تمہارے پاس کئی ہزار روپے بنک میں جمع ہیں۔

نہیں بھائی بالکل غلط ہے ہاں البتہ میرے خسر نے اپنا ایک مکان بیچ کر بنک میں روپیہ جمع کرایا ہے [illegible] بڑے کنٹک ہیں۔

[illegible] یار خیر ان ہی سے لا دو ہم خیرات تو مانگ نہیں رہے۔ قرض حسنہ کے طریقہ پر دیدیں [illegible] بعد ادا کر دیں گے ذرا ہماری حالت پر رحم کھاؤ اس وقت بھی کام نہ آئے تو پھر کب کام آؤ گے

فیضو۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم کو میری بات کا اعتبار نہیں، بخدا تمہارے لئے جان بھی حاضر ہے مگر کیا کروں میرے پاس اس وقت کچھ نہیں خیر میرے بس میں جو کچھ ہے کرتا ہوں میں نے خود ان سے آج تک ایک پیسہ طلب نہیں کیا مگر تمہاری خاطر جاتا ہوں خدا کرے کام بن جائے۔ یہ کہکر فیضو صاحب گھر سے نکلے تھوڑی دیر تک ادہر اُدہر چکر کاٹتے رہے اس کے بعد پھر واپس آئے کہنے لگے۔

فیضو۔ بھئی واللہ تمہاری خاطر آج وہ کام کیا ہے جو اپنے لئے بھی کبھی نہ کرتا اوّل تو انہوں نے پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا مگر بہت کچھ منت سماجت سے بعد راضی ہوئے مگر کہتے ہیں کہ بغیر ضمانت کے کچھ نہیں دوں گا کوئی چیز رہن رکھوا دو اور روپیہ لے لو میرے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہوتی تو واللہ خوشی سے تم پر سے صدقہ کر دیتا، مگر اس وقت بالکل ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔

حسن۔ تو اب کیا صورت ہوسکتی ہے۔

فیضو۔ ہاں ایک شکل ہے تمہارے ہاتھ میں جو یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے اس کو رکھوا دو میں انشاء اللہ بہت جلد اور کوئی انتظام کر کے اس کو چھڑا کر تم کو لا دوں گا۔

یہ سنکر حسن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس نے رو کر کہا کہ یہ انگوٹھی میری ماں کی آخری نشانی ہے، ہائے افسوس اس سے بھی مجھکو جدا ہونا پڑتا ہے۔

یہ کہہ کر مجبوراً انگوٹھی اتار فیضو کے حوالے کی فیضو کی تو دلی مراد بر آئی فوراً انگوٹھی لے خوش خوش گھر آئے انکو معلوم تھا کہ انگوٹھی کئی ہزار کی مالیت کی ہے اور مدت سے ان کا اس پر دانت تھا۔ بارے آج کامیابی نصیب ہوئی، دل ہی دل میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہوئے گھر پہونچے فوراً اپنے کمرہ میں گئے، کیش بکس کھولا اسمیں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی سو سو کے پانچ نوٹ اس میں سے الگ کئے، انگوٹھی اس میں حفاظت سے رکھی اور صندوقچہ بند کر کے پھر حسن کے پاس آموجود ہوئے۔

حسن۔ کہو بھائی کیا ہوا۔؟

فیضو۔ ارے بھائی مفلسی میں آٹا گیلا کا مضمون ہے۔ میں سمجھا تھا کہ انگوٹھی قیمتی ہے اتنی رقم مل جائے گی کہ کام چل جائیگا۔ مگر خسر صاحب نے اول تو خود پرکھی پھر مجھ کو لیکر ہیرالال جوہری کے پاس لے گئے اس نے بہت غور سے دیکھا اور کہا کہ یہ نگینہ اچھا نہیں ہے اس وقت بازار میں سات سو سے زیادہ اس کی قیمت نہیں اُٹھے گی یہ سُن کر میں نے انگوٹھی واپس لے لی اور خود جا کر کئی دُکانوں پر پرکھوایا مگر واقعی سات سو سے زیادہ کوئی نہیں جانچتا تھا مجبوراً پھر خسر صاحب کے پاس گیا اور بڑی مشکل سے ان سے اس پر پانچ سو لایا ہوں، اگر تم چاہو تو رکھ لو ورنہ انگوٹھی واپس لے آؤں۔

حسن۔ ارے یار غضب ہے وہ تو تین ہزار سے زیادہ کی ہے خود والد مرحوم نے اس کی قیمت بتائی تھی۔

فیضو۔ دیکھو بھئی اب تمہاری مرضی، کہو تو انگوٹھی واپس لے آؤں۔

حسن۔ اب تو ضرورت ہے اُن کی ہنسے بھی دو چند روز کے بعد تو چھڑا ہی لیں گے چلو خیر اس وقت تو کام نکل جائیگا، خیر بھئی شکریہ تم تھے تو اس آڑے وقت میں کام تو آ گئے اوروں نے تو ادھر کا رُخ کرنا بھی چھوڑ دیا خیر میاں یہ وقت ہمیشہ نہیں رہے گا۔

فیضو۔ ارے یار وہ دوست ہی کیا جو وقت پہ کام نہ آئے۔ دنیا میں اور دھرا ہی کیا ہے۔ میرے پاس تو اگر اس وقت کچھ ہوتا تو خوشی سے تمہارے قدموں پر لا کر ڈال دیتا۔ مگر مجبوری ہے خیر خدا مشکل آسان کر ہی دیگا۔

غرض یہ کہ اب ڈاکٹر صاحب آئے آپریشن ہوا اور کوئی تین ہفتہ تک میاں حسن مریض رہے اس عرصہ میں اُن کا خادم کلو ان کی دیکھ بھال کرتا رہا فیضو شروع شروع میں تو دو ہی رہا کئے اس کے بعد جوں جوں حسن کو افاقہ ہوتا گیا اُن کی حاضری کم ہوتی گئی یہاں تک کہ جب وہ بالکل اچھے ہو گئے تو میاں فیضو بھی غائب ہو گئے، اب ان کا کہیں بھی پتہ نہ تھا بچارے کلو نے بہت تلاش کیا مگر سوا اس کے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ شہر سے باہر چلے گئے ہیں۔

حسن خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہو گیا تھا مگر سچ پوچھو تو اس کی حالت اب بالکل ابتر ہو گئی تھی بیماری سے کیا اٹھا گویا خواب سے آنکھ کھل گئی۔ اور پوری حقیقت روشن ہو گئی کہ دنیا کس چیز کا نام ہے اور دوست کس کو کہتے ہیں۔ انگوٹھی کے معاوضہ میں جو روپیہ ملا تھا وہ ڈاکٹروں کی فیس دواؤں کی قیمت اور بعض دوسری ضروریات کی تکمیل میں خرچ ہو گیا اب نہ کھانے کو روٹی تھی اور نہ پہننے کو کپڑا کلو کے ذریعہ کسی سے قرض مل گیا تو روزی ورنہ روزہ فاقہ کشی سے حالت اور بھی بدتر ہو گئی نہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلا سکتا تھا اور نہ اپنی زبان سے حال کہہ سکتا تھا۔ بس اللہ یاد آ گیا۔ دن رات پڑا روتا اور اپنے کیئے پر پشیمان ہوتا مگر اب پچھتائے کیا ہوتا تھا جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت، اب اس عالم تنہائی و بیکسی میں۔ یاں رشید اور ان کی نصیحت کو یاد کر کے اپنے پر لعن طعن کرتا۔

الغرض چند روز تک تو اسی طرح فاقہ کشی سے زندگی گزارتا رہا لیکن آخر کب تک ایک مرتبہ جب تین وقت فاقے گذر گئے تو آخر نہ رہا گیا قلم دوات لی رشید کو خط لکھکر میز پر رکھا اور کمرہ کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک سر دونوں ہاتھوں میں لئے بیٹھا سوچتا رہا آخر فیصلہ کر لیا کہ اس بے غیرتی کے جینے سے مرنا بہتر ہے کرسی پر سے اٹھا الماری میں سے افیون کی ایک پڑیا نکالی خدائے تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور افیون کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا بیماری اور فاقہ کشی سے حالت تو پہلے ہی رہ گئی تھی فوراً افیون نے اپنا اثر کرنا شروع کیا ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے رگیں کھچنے لگیں آنکھیں پتھرا گئیں اور بیہوشی طاری ہو گئی۔

خدا کی شان دیکھئے کہ اُسی روز رشید ایک عرصہ کے بعد وطن آیا۔ یہاں آ کر حسن کی بیماری اور آپریشن کا حال سنا فوراً بے قرار ہو گیا۔ سیدھا مکان کا رُخ کیا ڈیوڑھی پر کلو سے کچھ حال پوچھا اس نے مختصر سی کیفیت بیان کی آیا دیکھا کمرہ بند ہے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو حسن کی حالت غیر نظر آئی بے تاب ہو گیا تھوڑی دیر کی

زور آزمائی کے بعد کسی نہ کسی طرح دروازہ کھول ہی لیا۔ اندر گھسا حسن کو دیکھکر نہ رہا گیا۔ بے قابو ہوکر اس سے لپٹ گیا آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا جب ذرا تسکین ہوئی اور سر اٹھایا تو میز پر خط نظر آیا اس کو اٹھالیا اور پڑھنا شروع کیا

پیارے رشید

تم سے معافی مانگے بغیر دنیا سے رخصت ہونا بے مردنی ہوگی اور شاید وہاں بھی یہ خلش باقی رہیگی کہ ہائے افسوس میں نے تمہاری نصیحت کی قدر نہ کی اس لئے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ دنیا میں میرے اقبال کا ستارہ شہاب ثاقب کی طرح چمکا اور غائب ہوگیا میری دولت کا آفتاب بہت آب و تاب سے نکلا اور دور تک اپنی کرنیں پھیلائیں اور پھر اندھیرے اور کالے بادلوں میں ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ میرے ساتھی جو دوستی کا دم بھرتے تھے مجھ کو لوٹ کھسوٹ کر چلتے بنے ہائے افسوس میں نے اپنی دولت کا کتنا بُرا استعمال کیا نہ مذہب کی خدمت کرسکا اور نہ قوم کی میری داستانِ غم داستانِ عبرت ہے میری قوم کے مجھ جیسے بہت سے بے وقوف اور ناعاقبت اندیش افراد ذلت کی زندگی بسر کرچکے ہیں کر رہے ہیں اور کریں گے۔

قوم آخر کس کس کو روئے گی اور کس کس پر ماتم کریگی مجھ کو معلوم ہے دنیا مجھ کو ذلت اور حقارت سے یاد کریگی مگر پیارے رشید خدا کے واسطے تم مجھ کو نہ بھول جانا میری خطا معاف کردینا اور میرے لئے دعائے مغفرت کرنا میں اب دل قابو میں نہیں ہے اس دنیا کی تکلیفیں تو سہہ لیں اب دیکھئے وہاں کیا ملتا ہے مگر اُسکی رحمت پر بھروسہ کرکے اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں، لو خدا حافظ۔

تمہارا ناعاقبت اندیش دوست حسن

خط ختم کرتے کرتے رشید از خود رفتہ ہوگیا اور بے قابو ہوکر حسن کو لپٹ گیا مگر لپٹتے ہی فوراً علیحدہ ہوا کیونکہ وہ تو حسن کو مردہ سمجھے ہوئے تھا مگر اب اس کو معلوم ہوا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہے فوراً کلو کو بلایا اور سواری کا انتظام کرکے اس کو قریب ہی کے دواخانہ میں لے گیا ڈاکٹر صاحب نے افیون کا اثر دیکھکر فوراً قے کرائی اور زہر کے توڑ کی اور دوسری دوائیں پلائیں مگر حسن کو ہوش نہ آیا۔ رشید چار پانچ گھنٹے اسکے سرہانے بیٹھا خدا سے دعا مانگتا رہا آخر خدا نے اس کی دعا سن لی حسن کو تھوڑا بہت ہوش آیا اور اس نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں، سامنے رشید کو کھڑا دیکھا فوراً منہ سے نکلا "بھائی رشید" اس کے بعد پھر آنکھیں بند ہوگئیں۔ غرضیکہ سارے دن بے ہوشی کا عالم رہا رات کو کہیں جاکر ذرا طبیعت سنبھلی دوسرے روز پولیس اور ہسپتال کے جھگڑوں سے بڑی مشکل سے چھٹکارہ پاکر رشید حسن کو اپنے گھر لے آیا۔ اب میاں حسن اور رشید دونوں بھائیوں کی طرح ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ حسن کو جب کبھی اپنی پہلی حالت اور بے وفا دوستوں کا خیال آتا ہے تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے مگر خود کردہ را علاج نیست کا خیال کرکے خاموش ہو جاتا ہے۔ رشید اس کے لئے تلاشِ معاش میں مصروف ہے تاکہ وہ آئندہ آرام سے زندگی بسر کرے۔

راحت کدہ

از جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

نوٹ۔ جوان موت کا دھکا کہ یونہی کیا تھوڑا ہوتا ہے لیکن اگر اس جوانمرگی میں بیوی کی محبت بھی شامل ہو تو قیامت کا سامنا سمجھئے کہ عزیز شریکِ زندگی کا جدا ہونا روح کا تن سے جدا ہونا ہے۔ ذیل کے قطعات حضرت اثر صہبائی کے ان خون شدہ تاثرات میں سے چند ہیں جو انکی رفیقۂ حیات راحت کی جگر دوز مفارقت کی سوگوار تنہائی میں قلمبند ہو گئے ہیں۔ یا آنسوؤں کے چھالے ہیں جن سے راحت کی یاد تازہ رکھی گئی ہے۔

ہمیں صاحب موصوف سے دلی ہمدردی ہے اور دعا ہے کہ ان کے پریشان خاطر کو سکون اور مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔
"شاہد"

تمہاری یاد میں بیٹھا ہوا ہوں شامِ ہجراں میں
رواں عجب سکونِ غم ہوئی قلبِ پریشاں میں
تری صورت دلِ ویراں میں یوں آباد رہتی ہے
کہ جیسے چودھویں کا چاند ہو دشت و بیاباں میں

دلِ برباد میں تیرے خیال اس طرح آتے ہیں
شبِ تاریک میں جیسے ستارے جگمگاتے ہیں
[illegible] سی شب کی تیری معمور رہتی ہے
[illegible] عالمِ مستی میں تیرے گیت گاتے ہیں

شامِ ہجر کی افسردہ تنہائی میں بھر آتا ہے دل
یاد کر کر کے تری باتوں کو بھر آتا ہے دل
میرے سینے میں بپا ہوتا ہے اک طوفانِ غم
اور اس طوفانِ غم میں ڈوبتا جاتا ہے دل

آوارہ و سرگشتہ و آشفتہ نظر ہوں
درماندہ و افسردہ دل خستہ جگر ہوں
دامن سے ترے چھوٹ کے کیا حال ہوا ہے
بیچارہ و وحشت زدہ و خاک بسر ہوں

جُرعاتِ تازہ

از حضرت سرشار کسنڈوی

زیارت کرنے والو بیدلوں کی بزمِ امکاں میں
ہمیں دیکھو کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں گلستاں میں

خدا ہی جانے کیا دیکھا نظر نے بزمِ جاناں میں
مرا ہر لفظ اب ڈوبا ہوا ہے رنگِ عرفاں میں

قیامت کی ہے شوخی دیدۂ بے باکِ جاناں میں
بلائیں پرورش پاتی رہیں آغوشِ انساں میں

معاف اے دل ٹپکتی ہیں جو بوندیں سُرخ اشکوں کی
کہاں اخفائے رازِ عشق اب آنکھوں کے امکاں میں

نجات اس قید سے کیا قیدِ ہستی سے بھی ممکن ہے
بہار آتی ہے دیوانے نہ گھبرا قیدِ زنداں میں

جوانی کیا گئی سب زندگی کا لطف کھو بیٹھے
کسی صورت سے جی لگتا نہیں اب بزمِ رنداں میں

ہمیں ان مشتبہ نظروں سے کوئی دیکھتا کیوں ہے
ہوا کھانے نکل آئے ہیں ہم بھی باغِ امکاں میں

جہاں صیاد ڈنکا بج رہا ہے تیرے ظلموں کا
کبھی اپنا بھی طوطی بولتا تھا اُس گلستاں میں

مری رنگیں مزاجی کام کس کس کے نہیں آئی
مرا افسانہ ہے اب ہر دلِ گبر و مُسلماں میں

مجھے اے صور کیوں دیتا ہے تو مژدہ قیامت کا
بہت کچھ پا لیا آرام میں نے کُوئے جاناں میں

ہزاروں بجلیاں سرشار دل پر گر پڑی ہوتیں
کبھی آیا گیا ہوتا جو میں بزمِ حسیناں میں

سہیلی کی نصیحت

میں نے ایسے گھر میں جنم لیا جہاں عورتوں کے لئے تعلیم غیر ضروری ہی نہیں بلکہ عیب سمجھی جاتی تھی۔ اللہ بخشے اماں پرانے خیال کی آدمی تھیں۔ اُنہوں نے میرے لئے صرف اس قدر تعلیم کافی سمجھی کہ بہشتی زیور اور اسی قسم کی چند کتابیں سمجھ لیا کروں۔ قرآن شریف محلہ کی اُستانی نے مجھے پڑھایا تھا اور اماں کی تاکید تھی کہ روزانہ اس کی تلاوت کرتی رہوں۔ لکھنے لکھانے کی وہ شدت سے مخالف تھیں۔ میرے ہاتھ میں اگر کبھی قلم دیکھ لیتیں تو فضیحتے کر ڈالتیں۔ ابا تعلیم اسواں کے خلاف تو نہ تھے مگر اماں کے سامنے اُن کی ایک نہ چلتی تھی۔ بارہا اُنہوں نے اماں کو سمجھایا کہ اب وہ اگلا سا زمانہ نہیں ہے۔ دُنیا کہیں سے کہیں جا پہونچی وقت کا تقاضا ہی یہی ہے کہ عورتیں اعلیٰ تعلیم پائیں تاکہ بہتر بیٹیاں۔ بہتر بیویاں اور بہتر مائیں بن سکیں مگر اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں اور یہی کہتی رہیں کہ "صاحب خیر میں نے کہاں تعلیم حاصل کی؟ آپ کو مجھ میں آخر کیا بُرائی نظر آتی ہے؟ ساری عمر آخر آپ ہی کے ساتھ گذاری ہے۔ یہ چونڈا دھوپ میں تو سفید نہیں کیا ہے۔ لڑکیوں کو پڑھا کر کیا نوکری کرانی ہے؟ شریف بہو بیٹیوں کے لئے بس اتنی تعلیم چاہیئے کہ اللہ رسول کے احکام سمجھ سکیں۔ رہا گھر بار کا سلیقہ تو یہ تعلیم سے زیادہ تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میری نکہت کو دیکھو۔ آٹھوں اُنگلیاں آٹھوں چراغ۔ نہ آج کل کی لڑکیوں کی سی دیدہ دلیری ہے اور نہ ہوائی دیدہ۔ پکانے ریندھنے میں مجھ سے بھی پیش پیش ہے۔ ٹانکا ایسا بھرتی ہے کہ سانی کا سینے والیاں بھی دیکھ کر حیران ہوتی ہیں۔ اِس ننھی سی عمر میں گھر کا سارا خرچ خود اُٹھاتی ہے۔ نہیں صاحب میں تو ایسی پڑھائی وڑھائی کی روادار نہیں جس میں پڑکر لڑکیاں کسی جوگی نہیں رہتیں۔ اگر ایک دن بھی ماما ناغہ کر جائے تو تعلیم یافتہ صاحبزادی سے نہیں ہو سکتا کہ کھانا پکالیں۔ اللہ نے چاہا تو بازار ہی سے منگایا جائیگا۔ دُور کیوں جاؤ۔ یہ تمہارے پڑوس میں ہی حمید الدین جو رہتے ہیں اُن کی لڑکی کو بلُوا کر ذرا ایک دن روٹی تو ڈلواؤ۔ دیکھنا کیسی نور بھری روٹیاں اُترتی ہیں۔ سبب اگر پوچھو گے تو صاحبزادی ترلخ کر فرمائینگی "ہم کسی باورچن کی جنی تو ہیں نہیں جو روٹ تھوپتے پھریں؟" میں تو ایسی جاہل لڑکی کو جو گھر کے کام کاج کر سکے اُس لڑکی سے کہیں بہتر سمجھتی ہوں جو کالج میں تعلیم پانے کے بعد صرف کتابوں کا کیڑا بن کر رہے پھر صحت الگ خراب رہنے لگتی ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی روگ کھڑا ہوتا رہتا ہے۔ ذرا کوئی زور سے بولا اور اُن کے سر میں درد ہونے لگا۔ صاحب میں تو اپنی نکہت کو یوں جان بُوجھ کر کنوئیں میں دھکا دینے سے رہی"۔

اِس نسوانی منطق کے آگے بھلا ابا کی کیا چلتی۔ خاموش ہو رہتے مگر میرے شوق کو دیکھکر اُن کا بھی جی نہ مانتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُنہوں نے مجھے خالی وقت میں پڑھانا شروع کیا۔ میری تعلیم چونکہ امورِ خانہ داری میں مخل نہ تھی اِس لئے اماں کو بھی اس پر چنداں اعتراض نہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں مَیں نے کئی کتابیں ختم کر لیں۔ اماں سکول کی تعلیم کی شدت سے مخالف تھیں، اِس لئے اسکول کا تو خیال ہی عبث تھا۔ اِس سے ایک فائدہ تو ضرور ہوا کہ جو کتابیں اسکول میں پورے سال بھر میں پڑھائی جاتی تھیں وہی کتابیں میں گھر پر چھ مہینے میں ختم کر لیا کرتی تھی۔ لیکن جہاں یہ فائدہ پہونچا وہاں یہ نقصان

بھی رہا کہ مبادلۂ خیالات و توسیعِ معلومات سے محروم رہی۔ غرض ایسی فضا میں اتنی ہی تعلیم کو میں تو بسا غنیمت سمجھتی تھی۔

میری عمر اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی مگر میری کوئی "بات" ڈھنگ ہی کی نہ آتی تھی۔ یوں جہاں بیٹی ہوتی ہے پیغام آیا ہی کرتے ہیں مگر جو رشتہ آتا تھا اُس میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتی تھی۔ لڑکوں کا آجکل کچھ ایسا کال ہو گیا ہے کہ گھس لگانے کو بھی نہیں ملتے۔ اماں نے چوڑی والی مہندی والی سب ہی سے تو کہہ رکھا تھا مگر اُن کا یہی کہنا تھا کہ "بیوی ! ہمیں خود تم سے زیادہ خیال ہے۔ تمہاری لڑکی کے جوڑ کا کوئی لڑکا ملے تو کچھ کہیں سُنیں بھی"۔ آبا الگ پریشان رہنے لگے۔ اماں جُدا اِسی سہم میں گھُلی جاتی تھیں کہ بچّی سیانی ہو گئی ہے۔ کنواری لڑکیوں کو گھر بٹھانا ہمارے ہاں بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ ایک بیوی آتیں اور کہہ جاتیں "جوان بیٹی جس گھر میں ہوتی ہے وہاں خون برستا ہے"! دوسری آتیں اور کہتیں "لڑکی پرایا دھن ہے اس کو گھر میں زیادہ نہ بٹھانا چاہیئے"۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ تھا کہ آخر لڑکی کو کس سے بیاہ دیا جائے ؟ ان طعنوں سے اماں اور گھُلی جاتی تھیں یہاں تک کہ انہیں بخار ٹھہر گیا اور میری شادی کی آرزو لئے ہوئے جنت کو سدھار گئیں۔ آبا اب اور بھی متفکر رہنے لگے۔ اِن سے بھلا گھر کی دیکھ بھال اور میرا رکھ رکھاؤ کیسے ہوتا ؟ دن بھر دفتر میں رہتے۔ شام کو وہاں سے تھکے ہارے واپس آتے تو کھانا کھاتے ہی مُنہ لپیٹ کر پڑ رہتے۔ اماں کے مرنے کا ایسا دھاکہ بیٹھا تھا کہ مجھ سے بات بھی بہت کم کرتے تھے۔ ایسی حالت میں دو سال اور گذر گئے۔ میں گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھی۔ جو وقت بچتا اُس میں خود ہی کچھ لکھ پڑھ لیا کرتی۔ میرا وقت تو یوں گذرتا ہوا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا مگر اس عرصہ میں آبا کی ہڈّی سے چمڑا لگ گیا تھا۔

ایک دن خلافِ معمول آبا دفتر سے بہت سویرے واپس آ گئے چہرہ پر بھی بجائے غم کے آثار کے خوشی کی جھلک نظر آتی تھی۔ دروازہ میں سے گھُستے ہی سیدھے میرے پاس آئے اور مجھ کو گلے لگا کر پیار کیا۔ نہ معلوم اس وقت میرا جی آپ ہی آپ کیوں بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے آنکھیں صاف کر کے آبا کی طرف دیکھا تو آنسوؤں کی دو لڑیاں اُن کے چہرہ پر بھی نظر آئیں۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ سیلابِ اشک دونوں طرف سے اُمنڈ پڑا یہاں تک کہ روتے روتے ہم دونوں کی ہچکی بندھ گئی رونے سے دل کی بھڑاس نکل گئی اور دل ٹھہرا تو رونے کے سبب پر میں نے غور کیا۔ بظاہر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی تھی سوائے اس کے کہ آبا کے اظہارِ شفقت سے دل کو ٹھیس لگی تھی اور ضبط ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ لیکن زیادہ غور کرنے پر میں آبا کے آج کے طرزِ عمل سے معاملہ کی نوعیت کو سمجھ گئی اور کچھ شرمندہ سی ہو کر رہ گئی۔ آبا نے مجھ سے صرف اسقدر کہا کہ "بیٹی ! آج تمہاری پھوپی کو بلاوے کا خط بھیجا ہے۔ شاید پرسوں تک وہ آ جائیں"۔ میرا گمان اب یقین سے بدل گیا اور میں اپنے میں اتنی جرأت نہ پاتی تھی کہ آبا سے پھوپی کے بلانے کی وجہ پوچھوں۔ اب آبا بہت خوش خوش نظر آتے تھے۔ دو دن بعد پھوپی بھی آ گئیں۔ اُنکے ساتھ اُن کی لڑکی جمیلہ بھی آئی۔ میں نے بچپن میں جمیلہ کو دیکھا تھا۔ اب تو اُس نے کچھ ایسے ہاتھ پیر نکالے تھے کہ میں ایکا ایکی تو اُسے پہچان بھی نہ سکی۔ میں تو سمجھی کہ پھوپی کے ساتھ کوئی لکھنؤ کی بیگم آئی ہیں مگر جمیلہ نے مجھے دیکھتے ہی

میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا "کیوں نکہت! کیا تو اپنی بہن جمو کو بھول گئی جو یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے؟" مجھے تو اس وقت جمیلہ کا سان گمان بھی نہ تھا۔ بچپن میں ہم دونوں میں بڑا سہاگ تھا۔ ہم دونوں نے محلہ کی استانی جی سے قرآن شریف پڑھا تھا اور ایک ہی ساتھ ختم کیا تھا۔ گڑیاں کھیلنے میں جمیلہ ہی میری شریک ہوتی تھی۔ کبھی وہ گڈے کی اماں بنتی تھی۔ اور میں گڑیا کی اماں اور کبھی وہ گڑیا کی اماں بنتی تھی) اور میں گڈے کی اماں۔ غرض ہم دونوں ایک دوسرے کی اس طرح سمدھنیں بنتی تھیں۔ خوب خوب شادیاں رچائی جاتی تھیں۔ ان دنوں کا ایک واقعہ مجھے اب بھی جب کبھی یاد آجاتا ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ ہوا یہ کہ میرا گڈا تھا اور بی جمیلہ کی گڑیا۔ بات ٹھہر گئی میٹھی ٹکیاں تقسیم کی گئیں۔ جوڑے بننے شروع ہوئے۔ میں نے کہا "بی جمیلہ سات جوڑے کارچوبی کے بھاری بھاری تمہیں جہیز میں دینے ہونگے۔" جمیلہ نے کہا "بی میں تو تین جوڑے دونگی۔ اس سے زیادہ نہ دونگی۔" یہ بات اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ میں نے بالآخر فیصلہ کر لیا کہ برات اٹھالی جائے۔ مگر بی جمیلہ کب اس بدنامی کو ٹھنڈے پیٹوں گوارا کرنے والی تھیں۔ انہوں نے تیہے میں آکر کہا "دیکھو بی سمدھن! جو تم نے برات اٹھائی تو میں اپنا خون پانی ایک کر ڈالونگی۔" مگر مجھ پر بھی ضد سوار تھی۔ میں نے کہا "اب تو برات اٹھے ہی گی۔" جمیلہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دولہا (گڈے) کی گردن پکڑلی۔ میں نے بہتری چھڑانے کی کوشش کی مگر اس نے نہ چھوڑی اور مجھ سے چھین کر اس کی ٹانگیں چیر دیں۔ اس پر میں نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ ادھر سے اماں دوڑیں اور ادھر سے پھوپی۔ یہاں کہرام مچا ہوا دیکھا تو دونوں کے چہروں پر پہلے تو ہنسی سی آئی مگر پھر اماں نے میری خبر لی اور پھوپی نے جمیلہ کی۔ اس واقعہ کی وجہ سے کئی دن تک ہم دونوں میں بات چیت بند رہی مگر ہر وقت کی یکجائی سے ہم میں پھر سلوک ہو گیا اور شیر و شکر ہوگئے۔ گڈے گڑیوں کی شادیاں پھر بھی ہوئیں مگر چپ چپاتے ساری باتیں طے ہوجاتیں۔ جب میں دسویں میں پڑی تو ابا کا تبادلہ دلی سے لاہور کا ہوگیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ جمیلہ سے جدائی مجھے اس قدر شاق گذری کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ محلہ کی لڑکیوں میں مجھے اگر کسی سے محبت تھی تو صرف جمیلہ سے۔ روانگی کے وقت جمیلہ کا بھولے منہ سے کہنا "دیکھنا جی ہمیں بھولنا مت" اور پھر بسور کر رو دینا مجھے ابھی تک یاد ہے۔ بس اس دن کے بعد آج جمیلہ کو دیکھا تھا۔ اب اس میں زمین آسمان کا فرق ہو چکا تھا مگر اس کی شوخی اور شرارت اب بھی ویسی ہی تھی بلکہ اس میں اور بھی زیادتی ہو گئی تھی۔ ہائے! وہ بچپن کا زمانہ! جب اس وقت کی حالت کا موجودہ حالت سے موازنہ کرتی ہوں تو دل بھر آتا ہے اور بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔

جمیلہ کی شادی ہو چکی تھی مگر شوہر بی۔ اے پاس کرنے کے بعد دو سال کے لئے ولایت چلا گیا تھا۔ یہ میکہ آئی ہوئی تھی۔ ابا کا خط دیکھکر پھوپی کے ساتھ یہ بھی چلی آئی تھی۔ مجھ سے عمر میں چند مہینے بڑی تھی۔ بچپن میں جو شرارت مزاج میں تھی عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑھتی گئی تھی۔ آتے ہی مجھ سے تو اس قدر گھل مل گئی گویا سدا سے میرے ہی ساتھ رہی تھی۔ باتیں اس غضب کی کرتی تھی کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ مجھے بھی اس سے کچھ ایسی محبت ہو گئی کہ سگی بہنوں میں شاذ ہی ہوتی ہو۔ پھوپی تو خیر بڑی بوڑھی آدمی تھیں۔ ان سے تو مجھے بات کرتے

ہوئے بھی لحاظ آتا تھا۔ مگر جمیلہ کے آنے سے مجھے تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ صبح کدھر ہوتی ہے اور شام کدھر۔ ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ہنسی خوشی میں سارا دن گذر جاتا تھا یا یہ حال تھا کہ پہاڑ سا دن کاٹے نہ کٹتا تھا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگی "بہن نگہت! تو تو مجھ سا بھی کوئی مُردہ دل ہو۔ تیرے تن میں تو کسی بوڑھیا کی روح سمائی ہے جو آج کل کی لڑکیوں کی سی پھرتی ہی نہیں۔ میں تو جانتی ہوں جب سے ممانی مری ہیں تیرا دل بھی مر گیا۔ نہ آرزوئیں ہیں اور نہ امنگیں۔ مجھے تو اسی پر تعجب ہے کہ اس ڈھنڈار سے گھر میں اکیلی تن تنہا تو کیسے رہتی ہوگی"

میں نے کہا "بہن۔ جیسی کسی پر پڑتی ہے سہنی پڑتی ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسے واقعات میں اگر دل نہ مرجائے تو اور کیا ہو؟ اکیلا آدمی نہ ہنستا بھلا معلوم ہو اور نہ روتا۔ اب تو آئی ہے تو میں جانتی ہوں کہ میرا زندوں میں شمار ہے ورنہ تو جان میں تو اپنی زندگی سے بیزار ہوگئی تھی"

جمیلہ بھلا سنجیدہ گفتگو کب کرنے والی تھی۔ اس کو تو موقع بے موقع مذاق ہی سوجھتا تھا۔ میرے چہرے پر جو افسردگی کی جھلک دیکھی تو لگی قہقہے لگانے۔ بچپن میں بھی اس کی یہی عادت تھی کہ ذرا کسی کو روتے ہوئے دیکھا اور اس نے ہنسنا شروع کیا۔ وجہ یہ بیان کرتی تھی کہ رونے میں جو طرح طرح کی شکلیں بنتی ہیں اُن کو دیکھکر ہنسی ضبط نہیں کی جاسکتی۔ غرض مجھ کو دیکھکر پہلے تو خوب ہنسی اور پھر میرے گدگدیاں کرنی شروع کیں یہاں تک کہ ہنساتے ہنساتے مجھے بے حال کر دیا۔ جب میں نے بدقت تمام کہا کہ "بہن للہ مجھے معاف کر" تو کہنے لگی چپکے ہی چپکے کھل کھل کرتی تو، بتا یہ بڑھاپا اگر بیا اب کیا مرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا بھر کی غم کی باتیں کئے جاتی ہے۔ میں تو تجھے مرنے دونگی نہیں" یہ کہہ کر پھر گدگدانے میری طرف بڑھی مگر جب میں نے ہاتھ جوڑکر کہا "اب میں ایسی باتیں نہ کرونگی۔ میری توبہ ہے" تو اُس نے دوڑ کر میرے گلے میں باہیں ڈالدیں اور کہا "نگہت مجھے تو تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں تو تو اپنے پرانے قصے لے بیٹھی" میں نے کہا "بہن میں نے کیا تجھے منع کیا ہے؟ جو کچھ تجھے کہنا ہے شوق سے کہہ۔ میں سُن رہی ہوں" جمیلہ بولی "اچھا تو پچھلے واقعات کو تو بھول جا۔ اور آنے والی زندگی پر غور کر۔ دنیا میں سدا ایک سی کسی کی نہیں گذرتی۔ تیرے مصیبت کے دن ختم ہوئے اور اب تیری زندگی کا نیا دور شروع ہونے والا ہے"

جمیلہ کے منہ سے سنجیدہ گفتگو سُنکر مجھے ازحد تعجب ہوا۔ میں نے بھی چھیڑنے کی غرض سے چندرا کے پوچھا "کیسا نیا دور؟"

جمیلہ بھلا کب چوکنے والی تھی۔ کہنے لگی "اوہو! بچاری ننھی! اسے کچھ خبر ہی نہیں جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ ٹھم جا۔ بتاتی ہوں تجھے ابھی" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہی تھا جو میں نے کہا "اچھی میری بہن۔ معاف کر مجھے میں سمجھ گئی۔ تو بھی تو گھم میں باتیں کرتی ہے" مگر یہ عذر بھلا وہ کب قبول کرنے والی تھی۔ اُس نے تو پکڑ کر مجھے ایسا گدگدایا کہ بس رُلاتے رلاتے ہی چھوڑا۔ پھر کہا "اب تیری خیر اسی میں ہے کہ میری باتوں کو غور سے سُنے اور اُنکا ٹھیک ٹھیک جواب دے" میں نے حامی بھری اور اس نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"ہاں تو میں کہہ یہ رہی تھی کہ اب تیری زندگی کا نیا دور شروع ہونے والا ہے یعنی اب ماشاء اللہ تجھے پرائے گھر

جاتا ہے۔ دیکھو بی نکہت! اِس میں شرمانے ورمانے کی تو کوئی بات ہے نہیں۔ تمہارا مجھ سے اور میرا تم سے ہوا و کُھلا ہوا ہے۔ مجھ میں اور تم میں اتنی غیریت نہیں ہے کہ شرما شرمی کو اُس میں دخل ہو۔ تم میری ہم عمر ہو بلکہ کچھ چھوٹی ہی ہو اس لئے میں ضروری سمجھتی ہوں کہ تم کو اُن باتوں سے آگاہ کردوں جن سے تم کو سابقہ پڑنے والا ہے۔ سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہاری شادی ایک روشن خیال بیرسٹر سے ہونے والی ہے۔ تم نے گھر ہی میں رہ کر اچھی خاصی تعلیم پائی ہے۔ تربیت کے اعتبار سے (میں منہ دیکھے کی نہیں کہتی) تم ماشاء اللہ عام لڑکیوں سے کہیں بہتر ہو۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ابھی مزاج شناسی تم میں نہیں ہے کیونکہ یہ بات حاصل ہوتی ہے باہمی میل جول سے۔ تم بھولی رہیں بلکہ جوان ہوئیں۔ سب سے الگ تھلگ رہیں۔ تمہاری دنیا کنوئیں کے مینڈک کی طرح صرف اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود رہی مگر اب تمہیں ایسے گھر جانا ہے جہاں بالکل نئے اور انجان لوگوں سے واسطہ پڑیگا۔ جن کی عادات وخصائل سے تم یکسر ناواقف ہو ان میں سے ہر ایک کا دل تمہیں اپنی مُٹھی میں لینا پڑیگا۔ سب سے پہلے تمہیں اپنے شوہر سے ہم خیال ہونا پڑیگا یا شوہر کو اپنا ہم خیال بنانا پڑیگا۔ اس کے لئے تمہیں کچھ صبر کرنا پڑے گا اور کچھ جبر۔ پھر ساس، نندیں ہیں۔ اُن کے مزاج کے رکھ رکھاؤ میں بعض اوقات شوہر کو بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اپنی اس نئی زندگی کو کامیاب یا ناکامیاب بنانا ہر لڑکی کے اختیار میں ہے۔ تمہاری اُفتادِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم اپنی زندگی کو خوش گوار بناؤگی۔ تمہارے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ ماموں تک کہہ رہے تھے کہ بہت سمجھدار اور خوش مزاج بھی ہیں۔ عورتیں ہی مردوں کی بنانے اور بگاڑنے والیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے یوں سمجھو کہ تمہاری اور تمہارے شوہر کی آئندہ زندگی کا انحصار صرف تمہارے ہی طرزِ عمل پر ہے۔ ہر چند کہ مجھ میں اور تم میں عمر کے لحاظ سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، مگر میں چونکہ سسرال کی کھکھیڑ اٹھا چکی ہوں۔ اور تمہیں ابھی اُٹھانی ہے اس لئے یہ میرا فرض ہے کہ تم کو واقعات ... سے آگاہ کردوں۔ ... ہمارا گھرانا مولویوں کا ... شرع کا خیال رکھا جاتا ہے ... میں بھی گھر میں ... سسرال پہونچی تو وہاں کا رنگ ہی کچھ اور نظر آیا۔ یہاں جتنی عورتیں نظر آئیں سب ... مجھے بھی یہی وضع اختیار کرنی پڑی ورنہ خواہ مخواہ کھٹ پٹ ہوتی اور زندگی اجیرن ہوجاتی۔ یہ ایک معمولی واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ جو رنگ تم اپنی سسرال کا دیکھو اُسی میں تم بھی رنگ جاؤ۔ نکہت! عورت کی زندگی میں شادی ایک ایسا انقلاب ہوتا ہے جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ یہ عورت ہی کی ہمت ہے کہ اپنی فطرت ... انقلاب کے نظر کر دیتی ہے۔"

جمیلہ کی باتیں سُنتے سُنتے نہ جانے کیوں میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جمیلہ نے جو مجھے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ پھر کچھ سنبھل کر کہنے لگی "ہائیں! نکہت یہ تجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہوا؟" مگر اس کے اس سوال سے ... اور بھی ... لگی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جمیلہ نے طرح طرح سے مجھے سمجھایا۔ دلاسا دیا اور گلے لگا کر پیار کیا تو ... رونے سے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد جمیلہ کی باتوں پر میں پھر قہقہے لگا رہی تھی۔

وہ دن بھی آگیا جس کا ہر ایک کو سخت انتظار تھا۔ اللہ اللہ! کیسا صبر آزما وقت ہوتا ہے کہ جس کو پالا پوسا۔ دکھ درد جھیل کر بڑا کیا اس کو ہنسی خوشی دوسروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ گویا ایک مہمان ہوتا ہے جس کی مفارقت گو شاق گذرتی ہے تاہم دل پر جبر کر کے اُس کو بخندہ پیشانی رخصت کرنا پڑتا ہے۔ نکاح پڑھایا گیا۔ دولہا زنانخانہ میں بھیجا گیا۔ جمیلہ نے اپنی شرارتیں اب بھی نہ چھوڑیں اور ساری رسمیں ادا کرائیں۔ آرسی مصحف میں جمیلہ کا اصرار تھا کہ بیرسٹر صاحب "بیوی میں تیرا غلام آنکھیں کھول" کہیں۔ وہ خاموش رہے تو اُس نے کہا "یہ تو آپ کو کہنا ہی پڑے گا ورنہ ہم لوگ اسے بدشگونی سمجھیں گے"۔ غرض انہیں اس درجہ مجبور کیا کہ بالآخر انہیں یہ کہتے ہی بن پڑی اور مجھے بھی مجبوراً آنکھیں کھولنی پڑیں۔ پلک جھپکاتے ہیں میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں مگر آئینہ میں مجھے جو کچھ نظر آیا اُس کے بارے میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ اگر کسی عورت کو خوبصورت شوہر ملنے کی خوشی ہوتی ہے تو مجھے بھی ہوئی۔

میکہ سے وداع ہو کر میں سسرال پہونچی۔ یہاں کا سماں میں کیا بیان کروں۔ میرے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ جس کمرہ میں مجھے اُتارا گیا وہ مغربی طرز پر آراستہ تھا اور میں نے دیکھا کہ مجھے دلّی کی بیگماتی خصوصیات سے زیادہ مغربی تہذیب کی تقلید کرنی پڑے گی۔ میری ساس نندیں بھی آزاد خیال عورتیں ہیں۔ گھونگھٹ کو یہاں جُہلا کی رسوم میں شامل کیا جاتا ہے چنانچہ اگر ذرا بھی میں گھونگھٹ نکالتی تو کوئی نہ کوئی آکر اُٹھا دیتا۔ بیرسٹر صاحب تو ہر بات میں حفظانِ صحت ہی کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے گھونگھٹ کا تو ذکر ہی کیا پردہ بھی اُن کی نظروں میں ایامِ جہالت کی یادگار ہے۔ پہلے پہل تو مجھے بہت ہی جھجک سی آتی تھی مگر اب کچھ تو بی جمیلہ کی ہدایات پر عمل کرنے اور کچھ ماحول کے اثر سے میں بھی اس نئی طرزِ بود و باش کی خوگر ہو گئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تک تو کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہوئی نہیں۔ ساس اتنی شفقت کرتی ہیں کہ اماں کا غم اُنہوں نے بھلا دیا۔ بڑی نند اپنے گھر بار کی ہو رہیں۔ چھوٹی ایک منٹ کو مجھ سے جُدا ہونا نہیں چاہتی۔ پرسوں بی جمیلہ بھی آئی تھیں۔ پہلا ہی سوال یہ کیا کہ "میاں کے ساتھ کیسی گذر رہی ہے؟" میں نے کہا "بہت اچھی"۔ پھر مجھے چھیڑنے کی غرض سے کہا "آخر تجھ میں ایسی کونسی خوبی ہے جو تجھ پہ وہ یوں ریجھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا "مجھے تو معلوم نہیں۔ ہاں تو نے جو مجھے لکھ پلایا تھا اُسی پر عمل کر رہی ہوں"۔ اِس پر اُس نے مجھے پکڑ کر خوب ساگدگدایا۔ یہ بھی تو خیال نہ کیا کہ ہنسنے کی آواز اور سُنیں گے تو کیا کہیں گے کہ آج دُلہن کو کیا ہو گیا ہے جو یوں بے تحاشہ ہنسے جاتی ہیں؟ جب اُس نے دیکھ لیا کہ اب ہنسی کا اختتام اور رونے کی ابتدا ہونے والی ہے تب کہیں جا کر مجھے چھوڑا۔ میں نے بھی کہا "رہ تو جا۔ آنے دے اپنے خصم کو ولایت سے۔ نہ تیری بھی یہی دُرگت بنائی ہو اُس کے سامنے تو کہیو"۔ غرض دن بھر یونہی اُدھم مچاتی رہی۔ شام ہوتے گھر روانہ ہوئی مگر اِس وعدہ پر کہ "پرسوں آؤنگی تو تجھے بھی اپنے ساتھ لے چلونگی"۔

"شاہد"

اختر کی سرگذشت

از جناب ممتاز حسین صاحب بی۔ اے (آنرز) دہلوی

(۱)

اہلِ مشرق عموماً اور ان میں سے اہلِ ہندوستان خصوصاً فلسفی کو ایک ایسے شخص کا مترادف خیال کرتے ہیں جسے عملی زندگی سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا کہ ایک مادہ پرست سائنسدان کو خدا سے۔ ان خام خیال حضرات کے مفروضات بیچارے فلسفی کے کردار کے متعلق یہیں ختم نہیں ہوجاتے بلکہ فلسفی کو نہ صرف حیوانِ ناطق بلکہ حیوانِ مطلق کے دائرہ سے بھی نکال کر محض پتھر کا ایک بُت یا مجسمہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ جسے قوت احساس تو قطعی ودیعت ہوئی ہی نہیں اور جسے فطرت نے صرف قوت متخیلہ ارزانی فرمائی ہے۔ تاکہ وہ کائنات کے نہ حل ہونیوالے راز ہائے سربستہ کے انکشاف کی سعیٔ نامشکور کرتا رہے اور انکی نگاہ میں "محبت" تو ایک ایسا لفظ ہے جو فلسفی کے ذہنِ نارسا کے لئے "شرمندۂ معنی" ہی نہ ہوا۔ مطالعۂ فلسفہ اور احساسِ محبت کے اجتماع کو اتنا ہی متضاد سمجھا جاتا ہے جتنا مشرق و مغرب کے ایک محاذ پر آنے کو۔ حقیقت یہ ہے کہ محبت کا جو عامیانہ مفہوم عام لوگوں کے دہنوں پر مسلط ہے۔ وہ اسقدر نفرت آمیز اور بہیمانہ ہے کہ اس کا تصوّر ایک تربیت یافتہ دماغ کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

لیکن "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد"۔ ہر زمانہ اور ملک میں چند ہستیاں ایسی ضرور موجود ہوتی ہیں۔ جو اعلیٰ آئڈیلز کو اپنا منتہائے نظر بناتی ہیں۔ اور اس نصب العین سے ذرا بھی پیچھے ہٹنے کو اپنی شخصیت کی توہین سمجھتی ہیں۔ سوسائٹی کے "روشن دماغ" افراد کے تمسخر اور مضحکہ کا پُنبہ در گوش ہوکر مقابلہ کرتی ہیں۔ اختر بھی اسی فلسفی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اختر کو فطرت سے ایک ایسا ذہن رسا ودیعت ہوا تھا جو مابعد الطبیعات کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر ایسی موشگافیاں کرتا اور ہر مسئلہ پر ایسے واضح طریقہ پر روشنی ڈالتا کہ وہ مسئلہ سُننے والوں کے لئے کسی زبان کی ابجد و ہوز سے زیادہ مشکل نہ معلوم ہوتا۔ طرزِ تکلم، اندازِ بیان اور اظہارِ مدعا کے لئے انتخابِ الفاظ اتنا پاکیزہ ہوتا کہ وہ طلبا، جو فلسفیانہ مباحث کو محض مجذوب کی بڑ اور پاگلوں کی بکواس سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس کی گفتگو میں ہمہ تن گوش ہوجانے پر مجبور ہوجاتے۔ عام قابلیت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ تعلیم کی یہ تعریف کہ علم[ا] کی کسی ایک شاخ پر کما حقہ عبور ہونا اور ہر شاخ سے کم و بیش واقف ہونا اس پر تمام کمال صادق آتی تھی۔ اگرچہ خود تو شاعر نہ تھا لیکن شعر کے حسن و قبیح اور خوب و زشت کے امتیاز کی کافی استعداد رکھتا تھا۔ اختر تمام اخلاقِ حسنہ کا حامل تھا۔ اور یہ اس کا ایمان تھا کہ اخلاقِ فاضلہ کا درجۂ کمال کو پہنچ جانا اور اوصافِ خداوندی سے متصف ہوجانا ہی قربِ باری تعالیٰ کا مترادف ہے۔ چکبست کا یہ شعر اکثر نہایت مزے لے لیکر پڑھا کرتا ؎

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا　　آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

اختر کے والد زمانہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک شریف و نجیب خاندان کے فرد تھے لیکن کچھ متمول آدمی نہ تھے اس لئے

ا Education means to know everything of something and something of everything.

اختر کو اپنی تکمیل تعلیم میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ مشکلات اس کے عزم راسخ اور سعی پیہم کے سامنے نقش برآب تھیں۔ اُس نے اِن رکاوٹوں کو اپنے راستہ سے مردانہ وار مقابلہ کرکے دور کردیا۔

(۲)

اختر کے احباب کا دائرہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ اور اُس کا دوست تو صرف ایک ہی تھا جس کی وہ صادق ہونے کی وجہ سے بہت عزت کیا کرتا۔ اختر کو محمود سے اس سے اُنس تھا کہ محمود میں سادگی اور صداقت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ تصنع، بناوٹ اور زمانہ سازی سے جو مغربی تعلیم کا اثر ہے محمود کی ذات بالکل مبرا تھی۔ بالفاظ دیگر محمود خلوصِ مجسم تھا۔ اگرچہ اختر خیالات ورجحانات طبعی کے لحاظ سے محمود کے لئے ایک معمہ تھا لیکن پھر بھی محمود اسے اس عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا جس سے ایک خورد اپنے بزرگ کو دیکھتا ہے۔ محمود ہمیشہ اختر کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ تاکہ دوستی کی بنیادیں اور زیادہ مستحکم ہوجائیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ دوستی اس وقت تک ناکمل ہے جب تک دونوں میں فکری ہم آہنگی احساسِ یک رنگی اور جذبات میں یکسانیت نہ پیدا ہوجائے۔ محمود جب بھی فرصت کے اوقات میں اختر سے ملتا تو ایسے موضوع پر گفتگو چھیڑتا جس کے متعلق اُسے غلط فہمی ہوتی یا جس کے متعلق اُسے اختر کے خیالات معلوم کرنے مقصود ہوتے۔ چنانچہ محمود آج بھی کسی خیال کو دل میں لئے ہوئے اختر کے مکان پر پہنچا۔ لیکن اختر گھر پر موجود نہ تھا۔ محمود نشست گاہ میں اختر کے انتظار میں جا بیٹھا۔ سب سے پہلی چیز جس پر اُس کی نگاہ پڑی وہ "میری کریلی" کی شہرۂ آفاق کتاب "حیاتِ دوام" تھی۔ کتاب کھلی ہوئی تھی جس کے صفحہ کی ان دو سطور کے نیچے ایک گہرا خط کھینچا ہوا تھا۔ "زندگی کی مسرت محبت کرنا ہے نہ کہ محبت کیا جانا" محبوب اس لازوال خوشی جو محبت کی خلشِ پیہم سے پیدا ہوتی ہے اتنا زیادہ لطف اندوز نہیں ہوسکتا جتنا ایک عاشق۔ "محبت اگر فانی ہے اور اس کی قیام حیات صرف اسی وقت تک محدود ہے جب تک محبت کرنیوالا اس دنیائے آب وگل میں مقید ہے تو محبت محض بے معنی چیز ہے۔ حقیقی محبت کے لئے غیر فانی ہونا لازمی ہے۔" محمود نے وقت گذارنے کے لئے "حیاتِ دوام" کی ورق گردانی شروع کردی۔ اس کی نگاہ ایک ایسے صفحہ پر پڑی جس پر پنسل سے جابجا نشان لگے ہوئے تھے۔ نشان کردہ سطور کا مفہوم یہ تھا۔ کائنات کے اُن رازہائے سربستہ کو جو فلسفہ اور سائنس کی سرحد سے دور ہیں اور جنکے وجود کو محض افسانہ اور انسانی تخیل کا زائیدہ بتایا جاتا ہے، صرف "اصولِ محبت" ہی پر کاربند ہوکر وا کیا جاسکتا ہے۔ عقل انسانی کائنات کے صرف آثار ومظاہر کا علم حاصل کرسکتی ہے لیکن وہ موجودات جن کا ادراک صرف احساسِ باطنی سے متعلق ہے اور جن کی ماہیت، علتِ غائی اور سبب کا حل عقل وسائنس وفلسفہ کے قانونِ تجزیہ کے تنگ دائرہ میں نہیں آتا، محبت کے "اصولِ اولین" سے روز روشن کی طرح عین الیقین کی حد تک واضح ہوجاتے ہیں۔

محمود یہیں تک پہنچا تھا کہ نشست گاہ میں کسی کے داخل ہونیکی آہٹ سنکر اُس نے دروازے کی طرف مڑکر دیکھا۔ اُسکی نگاہیں اختر کے متبسم چہرے پر پڑیں، رسمی سلام اور مزاج پرسی کے بعد محمود کا سب سے پہلا سوال یہ تھا۔ "اختر، کیا تم آجکل اس کتاب کا مطالعہ کررہے ہو؟" اُس نے "حیاتِ دوام" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں نہایت سنجیدگی اور گہری دلچسپی سے۔" اختر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

محمود۔ میں نے تمہاری غیر موجودگی میں اس کتاب کے چند صفحوں پر یونہی سرسری سی نگاہ ڈالی تھی جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصنفہ "محبت" کی بڑی قائل ہے اور اسکو کلید کائنات بتاتی ہے۔ لیکن محبت تو تمہارے نزدیک بے معنی سا لفظ ہے اور مزید براں تمہارا یہ کہنا کہ میں اس کتاب کا سنجیدگی اور دلچسپی سے مطالعہ کر رہا ہوں مجھے حیرت میں ڈال رہا ہے۔"

اختر۔ "لیکن شاید تم نے یہ نہیں دیکھا کہ مصنفہ کا مطلب محبت سے وہ جذبہ نہیں ہے جو عمر کے ایک خاص حصہ پہ پہنچکر انسان کے دل میں صنف مخالف کے چہرے کی خوشنما اور متناسب ساخت اور شباب کی دل آویزیوں کو دیکھکر ہیجان اعصاب کے ماتحت پیدا ہو جاتا ہے اور جو اگر اس کے تسکین کا سامان مہیا کر دیا جائے تو فوراً ہی بلبلے کی طرح فنا بھی ہو جاتا ہے اور وہ نام نہاد نہیں بلکہ ننگ محبت ہمیشہ کے لئے سرد پڑ جاتا ہے۔ اسی جذبہ کو جسے میں جذبۂ شہوانی کے نام سے موسوم کرتا ہوں مہذب "متمدن" لوگ محبت کہتے ہیں۔ جہانتک اس جذبہ کا تعلق ہے۔ حیوان اور انسان دونوں برابر کے مدعی ہیں۔ اور رہا اس محبت کا ذکر جس کی "میری کریلی" حامی ہے۔ اس سے میں لفظ بلفظ متفق ہوں۔"

محمود۔ بھئی اختر تم تو اگر فرشتہ ہوتے تو بہتر تھا اور اسی وقت شاید یہ باتیں تمہارے منہ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتیں۔ تمہارے نظریۂ محبت کا سمجھنا ایک حقیر انسان کے ادراک سے باہر ہے۔ تم تو خیالی دنیا میں رہتے ہو۔ اسی قسم کے یوٹوپیاز (UTOPIAS) اکثر کتابی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں۔ جن پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ قابل عمل ہی نہیں ہیں اور جو اصول قابل عمل نہ ہو اس پر خامہ فرسائی کرنا یا اسکی نشر و اشاعت کرنا تضیع اوقات ہے۔

اختر۔ کیا تمہارے خیال میں اصول اخلاق پر کاربند ہونا اور فضائل حسنہ سے متصف ہونا بھی لغو اور لایعنی ہے۔ کیونکہ ان پر عمل کرنا بھی سہل انگار اور غیر مستعد لوگوں کے نزدیک آسان نہیں۔ جذبات شہوانیہ اور ضمیر کی کشمکش میں عزم راسخ اور صحیح الدماغی سے کام لیکر ضمیر کا ہمنوا ہونا بھی تو معمولی کام نہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان شخصیتیں یہاں آکر ڈگمگا جاتی ہیں۔ جو شخص یہاں سے پاک دامن اور بے داغ نکل گیا وہی اصلی معنوں میں خلیفۂ خدا کے عظیم الشان لقب کا مستحق ہے۔ یہی حال محبت کا ہے۔ یہ غیر قابل عمل نہیں۔ بلکہ اس کا بار پست ہمت شانے برداشت نہیں کر سکتے۔

محمود۔ "اچھا اختر کیا تم اس اصول کے قابل عمل ہونیکے شہادت میں کوئی زندہ مثال بھی پیش کر سکتے ہو۔ ایک انسان بھی ایسا موجود ہے جو اس پر عامل ہو؟

اختر۔ میرا خیال ہے دنیا کبھی ایسے شریف انسانوں سے خالی نہیں رہی اور نہ ہے۔ خواہ وہ معدودے چند ہی کیوں نہ ہوں۔

محمود۔ کہیں وہ ذات شریف آپ ہی تو نہیں ہیں؟

اختر۔ فرض کیجئے اگر وہ شخص میں ہی ہوں تو کیا تمہیں اسپر یقین کرنے میں عذر ہوگا۔ کیا میں اسکا اہل نہیں ہوں؟

محمود۔ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نوکر نے حاضر ہو کر کہا کہ ناشتہ طیار ہے۔ محمود اور اختر ناشتہ کی میز پر جا بیٹھے۔ اختر پر اب ایک سکوت سا طاری تھا اور آغاز گفتگو سے اب تک ایک روحانی مسرت آمیز کرب کے آثار اسکے

خوبصورت چہرے پر نمایاں تھے۔ دورانِ گفتگو میں اختر نے اپنے نظریہ کو سچا ثابت کرنے میں اس گرمجوشی کا ثبوت دیا کہ جس کا اظہار محض اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص ایک پاکباز انسان پر جھوٹے الزام لگائے اور وہ اپنی بریت کے لئے بے چین ہو کر ثبوت پیش کرے۔ اسوقت اختر کچھ کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا کئی کئی منٹ تک انگور کے ایک ایک دانہ کو انگلیوں میں لئے بیٹھا رہتا۔ اور پھر محمود کی طرف متوحش آنکھوں سے دیکھکر اُسے مُنہ میں ڈال لیتا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا۔ جو اُس کی ذہنی کیفیت کا پتہ دے رہا تھا۔ انسان کی شکل اسکے دل کا آئینہ ہے اور چہرے کے تغیر و تبدل کو دیکھکر ایک قیافہ شناس شخص دوسرے شخص کے پوشیدہ خیالات اور کیفیاتِ قلب کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اوّل الذکر سیاق و سباق کو بھی ملحوظ رکھے اور منطقی طریقۂ استنباط پر بھی حاوی ہو۔ محمود یہ دیکھ چکا تھا کہ اختر نے اپنی عادت کے خلاف آج محبت کے متعلق نہایت خوش اعتقادی کا ثبوت دیا اور جس وقت سے سلسلۂ کلام ناشستہ آجانے کی وجہ سے منقطع ہوا تھا۔ وہ اب تک ایک گہری فکر میں مستغرق تھا اور کبھی کبھی غیر ارادی طور پر اُس کے دل سے دبی دبی آہیں بھی نکل جاتی تھیں۔ محمود کے پاس یہ کافی قوی دلائل تھے جن سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ اختر ضرور کسی کی نگاہِ غلط انداز کا نشانہ بن چکا ہے اور آخر محمود نے اس تکلیف دہ سکوت کو اس طرح توڑا۔

محمود۔ اختر۔ آج تم از خود رفتہ معلوم ہوتے ہو۔ کیا کوئی خاص فکر لاحق ہے۔

اختر۔ ایک خواب سے بیدار کردہ انسان کی طرح سے چونک پڑا اور نہایت حواس باختہ ہو کر محمود کی طرف دیکھنے لگا اور پھر سوچکر بولا "کوئی خاص بات نہیں ہے"۔

محمود۔ اختر کیا تم مجھے راز داری کا اہل نہیں سمجھتے! جو تم اپنے خیالات کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہو۔

اختر۔ راز تو اسی وقت تک راز ہے جب تک۔ وہ اُس شخص کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں ہے جس کا وہ راز ہے۔ اور یہ سعی لاحاصل کیوں کہا تم نے؟

محمود۔ اس لئے کہ تمہاری گفتگو سے بڑی حد تک تو میں سمجھ چکا ہوں کہ اس خاموشی، محویت اور از خود رفتگی کی کیا وجہ ہے۔ صرف تمہارے مُنہ سے سُننا چاہتا ہوں۔

اختر۔ اچھا اس سے قبل کہ میں کچھ اُسکے متعلق کہوں۔ تم اپنا قیاس بتاؤ۔

محمود۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم جیسا وجود انسانی جس سے سوسائٹی کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں اب اپنے مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔ یعنی تمہارے دل میں آتشِ عشق سوزاں ہے جو تمہیں چند دن میں جلا کر خاکستر کر دیگی اور تم عضوِ باطل کی طرح بیکار محض ہو جاؤ گے۔

اختر۔ محمود۔ تمہارا قیاس درست ہے لیکن اسکے بعد کی رائے جو تم نے میرے متعلق قائم کی ہے، وہ بہت ہلکی ہے۔

محمود۔ خیر زمانہ تمہیں خود بتا دیگا۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ کون پیکرِ حسن ہے، جس نے تمہیں اسقدر وارفتہ کر دیا ہے۔

اختر۔ وہ محسن جس نے مجھے محبت جیسی روحانی نعمت سے آشنا کیا بیرسٹر محمد حنیف صاحب کی دختر نعیمہ ہے۔ میں کبھی کبھی

بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پر جایا کرتا تھا۔ ایک دن میری موجودگی میں نعیمہ اپنے والد سے کہنے لگیں کہ مجھے مابعد الطبیعات اور فلسفۂ اخلاق میں بہت سی مشکلیں پیش ہیں۔ امتحان نزدیک آگیا ہے۔ کس سے مدد لوں بیرسٹر صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے حل کر لیا کرو۔ امتحان تک اختر صاحب تمہیں اپنا کچھ وقت دیدیا کریں گے۔ نعیمہ نے میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ تو میں جواب میں بولا "حاضر ہوں جو میرے لائق خدمت ہو" اُس دن سے میں بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پر روزانہ جانے لگا۔ اول اول تو میرے دل میں نعیمہ کی خداداد قابلیت اور جدت طبعی کی وجہ سے ایک جذبۂ پسندیدگی پیدا ہو گیا۔ لیکن پھر یہی جذبہ امتداد زمانہ اور نعیمہ کے ہمہ صفت موصوف ہونے کی وجہ سے بڑھ کر انس اور پھر الفت اور اب محبت میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک تو نعیمہ کے رعب حسن اور مزاج سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اظہار محبت کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن ایک دن مجبور ہو کر میں نے اظہار کر ہی دیا۔

محمود۔ لیکن اختر تمہاری محبت یہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بیرسٹر صاحب اس رشتہ کو کبھی منظور نہیں کریں گے۔ تم شاید اُن کے اصولوں سے واقف نہیں۔

اختر۔ اگر یہاں نہیں تو دوسری دُنیا میں تو ممکن ہے۔

محمود۔ اختر تم پھر دل جلوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

اختر نے محمود کے اِس فقرہ کا جواب "جی ہاں درست فرمایا" کہہ کر دیا اور خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اختر نے موضوع گفتگو بدل دیا اور کچھ دیر کے بعد محمود اختر سے رخصت ہو کر چل دیا اور کہتا گیا کہ میں بھی آج بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پر آؤنگا

(۳)

موجودہ تعلیم کا اگر ایک طرف ہندوستانیوں کی ذہنی نشوونما کی ترقی میں نمایاں حصہ ہے۔ تو دوسری طرف اسی تعلیم نے انسانیت سوز غلط اصولوں کی ترویج بھی کی ہے۔ بیرسٹر صاحب اگرچہ نہایت روشن دماغ اور روشن خیال آدمی تھے اور اپنے پیشہ کے لحاظ سے کافی مشہور بھی تھے۔ لیکن اخوتِ انسانی بنی نوع انسان سے ہمدردی اور جذبۂ ایثار کا ان میں قطعی فقدان تھا۔ پردہ کو زمانہ جہالت کے دوسرے باقیات صالحات میں سے سمجھتے تھے۔ لیکن اس معاملہ میں مغربیت کی کورانہ تقلید سے بھی متنفر تھے۔ عورتوں کے غیر مردوں سے بے حجابانہ اور غیر ضروری خلط ملط کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ نعیمہ بیرسٹر صاحب کی اکلوتی بیٹی کٹھر رو ابر میں تعلیم پائی تھی۔ فلسفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے بی۔ اے میں فلسفہ کا آنرز کورس لیا تھا۔ شکل وصورت کے لحاظ سے کسی شاعر کا "بُتِ تنازمُاہ جبیں" یا "رشکِ قمر" تو نہ تھی۔ مگر چہرے کے نقش ونگار تمام متناسب تھے غلافی نشیلی آنکھیں جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ فگن۔ رنگ صبیح مگر ملاحت لئے ہوئے۔ کشادہ پیشانی، اُٹھی ہوئی ستواں ناک۔ طبیعت کے لحاظ سے نہایت باحیا اور سنجیدہ لڑکی تھی فطرت نے طبیعت میں ہر معمولی چیز سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ودیعت کی تھی۔ تعلّم کے اس تین ماہ کے عرصہ میں اختر نے نعیمہ کو کبھی ملول خاطر یا رنجیدہ ہوتے ہوئے نہ دیکھا۔ نعیمہ فلسفۂ رجائیت کی قائل تھی۔ اُس کا یہ ایمان تھا کہ

اس دُنیا کی تخلیق بہترین طریق پر کی گئی ہے۔ اور اس سے بہتر نظام کائنات نہیں ہو سکتا۔

اختر بھی مردانہ حسن کا مالک تھا۔ اگرچہ اتنا حسین نہیں کہ اسکی ایک ایک چیز دیکھنے دکھانے کے قابل ہو۔ مگر اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی۔ مقناطیسی کشش۔ جہاں ایسی دو ہم خیال ہستیاں یک جا مل جائیں کہ ایک دوسرے کے کردار کے مطالعہ کا بخوبی موقع ملے وہاں محبت کے پاکیزہ جذبات کے نشوونما میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ اختر اظہارِ محبت کرچکا تھا۔ لیکن نعیمہ کی طرف سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا تھا۔ اور نہ کوئی ہمت شکن تردید کی گئی تھی۔ اختر آج بھی حسبِ معمول بیرسٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ نعیمہ پہلے ہی سے نشست گاہ میں موجود تھی اور "مرقع چغتائی" کے "ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی" کے مصور مصرعہ پر نگاہ تھی۔ اور خیالات میں اس قدر غرق کہ اختر کے داخل ہونے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ اختر نے دُور ہی سے نظر ڈالکر معلوم کر لیا کہ نعیمہ کی نظر کس مصرعہ کی "مصور تشریح" پر ہے۔ اختر دروازہ کے قریب کی ایک کرسی پر سہارا لیتے ہوئے بولا "نعیمہ کیا تمہیں غالب کے اس مصرعہ سے اتفاق ہے کیا ساقی کا جلوہ ایمان و آگہی کا دشمن ہو سکتا ہے"۔ نعیمہ اختر کی آواز پر چونک پڑی اور جواب میں یوں گویا ہوئی۔ اختر صاحب ساقی مفہوم ہے دشمنِ ایمان و آگہی ہے۔ اگر ساقی کا جلوہ ہوش و حواس گم نہ کردے تو وہ جلوہ کہلانے کا مستحق نہیں اور ایمان جیسی بیچیز شئے ساقی کی درگاہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اختر۔ نعیمہ جہانتک تمہارے نظریہ یا یوں کہئے غالب کے نظریہ کا تعلق ہے یہ درست ہی لیکن بقول علامہ اقبال ؎ "نشہ پلاکے گرانا تو سب کو آتا ہے ٭ مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی"۔ ایمان و آگہی سے تہیدست کرنے کے بعد ساقی پر یہ فرض بھی تو عائد ہوتا ہے کہ اپنے ہم مشربوں کے خمار کا اتار بھی تو مہیا کرے۔

نعیمہ۔ اختر صاحب خمار تو اُس وقت ہوتا ہے جب نشہ کا اثر زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ساقی کا جلوہ تو وہ خود فراموشی اور محویت پیدا کرتا ہے جس سے ہوش میں آنیکا نام فنا ہے۔ اصلیت بھی یہی ہے کہ رندانِ حقیقت آشنا اس استغراق اور محویت کے مقابلہ میں ہوش و شعور کی تمنا کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔

اختر۔ معاف کیجئے۔ میں اپنا مفہوم اچھی طرح ادا نہ کر سکا۔ میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ محبوب کو اس قدر تغافل کیش اور مستغنی نہ ہونا چاہیئے۔ اور محبت کا جواب محبت ہونا چاہیئے نہ کہ نفرت و بے نیازی۔ جسکی زندہ مثال تم خود موجود ہو۔

نعیمہ۔ کیا آپ کی محبت کے لئے یہ لازمی ہے کہ میں بھی محبت کروں۔ یا اگر مجھے آپ سے محبت ہو تو اسکا اظہار بھی کروں؟

اختر۔ نہیں۔ نعیمہ۔ ہرگز نہیں۔ میں تو برعکس اسکے یہ سمجھتا ہوں کہ "زندگی کی مسرت محبت کرنے میں ہے نہ کہ محبت کئے جانے میں۔ محبوب نشاطِ ابدی سے جو محبت کا لازمی نتیجہ ہے اس قدر لطف اندوز نہیں ہوتا جس قدر عاشق" لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبت اسوقت تک معراجِ کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ جب تک دو ہم آہنگ روحیں کیف آفریں خلشِ محبت سے برابر متاثر نہ ہوں۔ اور یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ محبت اگر وہ حقیقی محبت ہے تو وہ سمندر کے مد و جزر کی طرح ایک دفعہ اُبھر کر دب نہیں جاتی۔ یہ ریڈیم کی طرح ہمیشہ برسرِ ترقی رہتی ہے۔ محبت وہ چشمہ ہے۔ جس کی سوتیں کبھی خشک نہیں ہوتیں۔ یہ ایک سدا بہار درخت کی طرح ہمیشہ سرسبز رہتی ہے۔ اِسے خزاں کے مسموم جھونکے کبھی نہیں مرجھا سکتے۔

نعیمہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری محبت ایک وقتی یا فوری جذبہ یا موسمی ہیجان اعصاب نہیں ہے" اختر یہ کہہ کر جواب کے انتظار میں خاموش کھڑا ہوگیا۔ نعیمہ نے ایک دلربایانہ انداز میں کہا۔ "بیٹھ جائیے" اور خود بھی سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک گہری فکر میں غرق ہوگئی۔ اختر نعیمہ کے چہرہ کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد نعیمہ بولی "اختر صاحب" "عشق اول در دل معشوق پیدا می شود" اور یہ سمجھنے کے بعد تو مزید سوال کی ضرورت ہی باقی نہیں۔ ہنی یہ کہکر نعیمہ نے میز پر سے اخلاقیات کی کتاب اٹھائی اور اختر کی طرف مخاطب ہوکر بولی۔

نعیمہ۔ اختر صاحب کیا آپکے خیال میں ضمیر خدا کی ودیعت کردہ مادی چیز ہے۔ یا وہ ایک کیفیت و عرض ہے جو انسان پر اس کی دماغی تربیت، تمدنی ماحول اور نظامِ اجتماعی کے ماتحت لاحق و طاری ہوتی ہے۔

اختر۔ میرا خیال یہ ہے کہ ضمیر روح کی طرح قائم بالذات چیز نہیں بلکہ دماغی تربیت حالات گردوپیش اور نظامِ اجتماعی کے ماتحت نشو نما پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف اقوام ایک ہی فعل کے متعلق مختلف اور متضاد آرا رکھتی ہیں" اختر اپنے بیان کی دلیل میں کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ بیرسٹر صاحب معہ محمود کے کمرہ میں داخل ہوئے اور رسمی مزاج پرسی کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیرسٹر صاحب سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولے "آج موسم کس قدر خوشگوار ہے۔ صبح سے ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمان پر گردش کر رہے ہیں"

محمود۔ زمانۂ حاضرہ کے نو ایجاد تکلیف دہ تکلفات اور گوناگوں دلچسپیوں نے انسان کو فطرت سے اسقدر دور ڈالدیا ہے کہ فطرت کی رنگینیاں، بعض مصنفین کے نزدیک انسانی ذہن کے تخلیق کردہ فنونِ لطیفہ و دیگر ایجادات کے سامنے ماند نظر آتی ہیں میرے خیال میں فطری منظر جو ذہن پر نقش قائم کرتا ہے اور جو دل میں وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے وہ کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے اور وہ کیفیت بدرجہا از خود رفتہ کرنے والی ہوتی ہے وہی فن زیادہ مکمل کہلاتا ہے جو زندگی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر ہو۔ خدا جانے دنیا کیوں تصنع اور بناوٹ سے اس قدر دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے"

اختر۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی مادہ پرستی نے شعور انسانی کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ غلط اور صحیح نظریوں میں امتیاز کی قوت تمیز بھی جاتی رہی اور اسی وجہ سے انسانیت اور آدمیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔

بیرسٹر صاحب۔ اختر صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت سے بیان فرمایئے۔

اختر۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ انسان کو فطرت کی ہم نشینی اور رنگینیوں ہی سے صرف دوری نہیں ہوتی جاتی بلکہ افرادِ انسانی میں سے ہمدردی کا احساس بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ انسانیت کے اسی قسم کے دوسرے لوازمات کے فقدان کو غلط فلسفیانہ نظریات کے ماتحت عین فطرت کے موافق سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے نظریات "انتخاب طبعی" اور "تزاحم فی الحیات" کا۔

بیرسٹر صاحب۔ کیا آپکو ان نظریوں کی صحت میں کچھ کلام ہے! ان مسائل پر سیر حاصل کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ نظریے اب مفروضات کی حد سے گذر کر عین الیقین تک پہنچ گئے ہیں فطرت کا یہ قانون ہے کہ وہ قیامِ حیات کی جدوجہد

میں کمزور افراد کو پائمال کر دیتی ہے اور قوی افراد کو قایم رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ اس لئے ہمدردی کے معنی لفظ ہے جس کا فطرت کے کسی شعبہ میں پتہ نہیں۔ اس کی دلیل میں میں ان پودوں اور جانوروں کی مثال پیش کرتا ہوں جو حادثاتِ زمانہ کے سامنے مجبور محض ہونے کیوجہ سے اور قوتِ مدافعت نہ رکھنے کی وجہ سے دنیا سے قطعی نابود ہو گئے ہیں اور ان کی نوع کا اب کرۂ ارض پر کہیں بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے جب یہ فطرت کا قانون ہے تو ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی جان پہ عذاب مول لیں اور نظامِ اجتماعی کے کمزور افراد کو اپنے کندھوں پر چڑھائے پھریں۔

اختر۔ بیرسٹر صاحب جہانتک نباتات، شجرات، اور حیوانات کا تعلق ہے آپ کا فرمانا کسی حد تک درست ہے لیکن یہ قانون انسانوں پر کسی حد تک بھی عائد نہیں ہو سکتا۔ اول تو ان کم درجہ شعبہ جاتِ حیات میں بھی ایک ہی نوع کے افراد جہد للبقا میں کبھی ایک دوسرے کو برباد نہیں کرتے۔ کوئی جانور یا پودہ اپنے کمزور ہم جنس کو پائمال نہیں کرتا۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک نوع کا فرد دوسرے نوع کے فرد کو اپنا لقمہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں حیوان کو اپنا چراغِ راہ بنانا کہاں تک قرینِ مصلحت ہے۔ انسان اگر حیوانوں کے نقشِ قدم پر چلے تو کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات صرف اسی وجہ سے مانا جاتا ہے کہ وہ نفسِ ناطقہ رکھتا ہے عقلِ انسانی جو نصب العین اس کے سامنے پیش کرتی ہے وہ صرف قیامِ حیات ہی نہیں ہے۔ بلکہ تکمیل شخصیت ہے۔ اس لئے قیامِ حیات تو صرف ایک ذریعہ ہے ایک اعلےٰ مقصد کی تکمیل کا۔ اور اس مقصد کے لئے اپنے ہم جنسوں کی معاونت لازمی ہے۔ کوئی شخص تنہا ان مدارجِ اعلیٰ تک نہیں پہنچ سکتا جو اُس نے اپنا منتہائے نظر بنائے ہیں۔ زمانہ طفلی سے ایامِ پیری تک انسان اگر مجبور محض نہیں ہے تو بالکل آزاد بھی نہیں ہے۔

بیرسٹر صاحب۔ "میاں صاحبزادے ان فلسفیانہ موشگافیوں میں کیا رکھا ہے۔ دولت کماؤ اور اس چند روزہ زندگی کو عیش و عشرت سے بسر کرو۔ اس سے زیادہ زندگی کا کچھ مقصد نہیں۔ ان مخمصوں میں پڑکر کون اپنی جان کو ضیق میں ڈالے"

اختر اِس بے ربط سلسلۂ کلام کو سن کر اور وہ بھی ایک تعلیم یافتہ معمر انسان کی زبانی حیران سا رہ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیرسٹر صاحب نے نہایت سنجیدہ گفتگو شروع کی ہے اور یہ سلسلہ اسی سنجیدگی اور متانت سے قایم رہے گا۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے بیرسٹر صاحب کو موضوع گفتگو سے الگ ہٹ کر خارج از بحث اور نہایت عامیانہ جواب دیتے ہوئے سُنا۔ کچھ عرصہ کے لئے کمرہ میں خاموشی طاری ہو گئی تھوڑی ہی دیر کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سیاسیات حاضرہ پر خیال آرائیاں ہوئیں اور آخر میں ایک ہندوستانی فلم ساز کمپنی کے ایک ڈرامہ پر تنقید ہوئی اور یہ صحبت برخاست ہو گئی۔

(۴)

کسی کا قول ہے کہ "مشک اور عشق چھپ نہیں سکتے" جب کوئی جذبہ دل میں کارفرما ہو یہ ناممکن ہے کہ چہرہ اُسکا

آئینہ دار نہ ہو۔ اس کلیہ سے نعیمہ اور اختر بھی مستثنیٰ نہ تھے اب اکثر بجائے پڑھنے پڑھانے کے ایک دوسرے کے صحیفۂ رُخ کی تلاوت ہوا کرتی گھنٹوں ایسی محویت میں ایک دوسرے کا مُنہ تکا کرتے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بات بھی یہی ہے کہ اظہار محبت کے لئے بہترین ذریعہ قوت نطق یا تکلم نہیں بلکہ خاموشی اور سکوت ہے۔ دونوں پر عجیب وجدانی کیفیت طاری رہتی۔ اگر نعیمہ خاموش تبسم سے پھول برساتی تو اختر اپنی نور پاش اور محبت ریز آنکھوں کے ذریعہ اپنے اعماق قلب کا اظہار کرتا۔ اگر نعیمہ ادائے مجسم بنی ہوئی بیٹھی رہتی تو اختر از سرتا پا آرزو۔ چنانچہ ایک دن اختر بڑے دن کی چھٹیوں میں بیرسٹر صاحب کے مکان پر محو نظارہ جمال یار تھا اور نعیمہ ایک بے نیازانہ انداز سے میز پر پنسل سے کچھ بے ربط نقش بنا بنا کر بگاڑ رہی تھی۔ نعیمہ کے بائیں ہاتھ کی نازک کلائی پر ایک زریں اور خوبصورت چین میں ایک گھڑی بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کلائی پر کسی قدر گہرے نشان پڑ گئے تھے۔ اختر نے ان نشانوں کو اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا "اُف! کس قدر ظالم ہے یہ چین۔ ایسی نازک کلائی پر کیسے گہرے نشان ڈال دئے ہیں"۔ اختر کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے کہ بیرسٹر صاحب کے سوال نے دونوں کو چونکا دیا۔ بیرسٹر صاحب "کیا مطالعہ ہو رہا ہے! کیا کسی خاص مسئلہ پر غور و خوض ہو رہا ہے"۔ نعیمہ اپنی جگہ سہم کر رہ گئی اور زبان سے کچھ بھی نہ نکل سکا اختر فوراً سنجیدہ شکل بنا کر کھڑا ہوگیا۔ بیرسٹر صاحب "تشریف رکھیئے"۔ یہ کہکر خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اختر نے محسوس کیا کہ بیرسٹر صاحب کچھ برہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن محبت انسان کو خواہ وہ کتنا ہی سنجیدہ اور سُلجھا ہوا کیوں نہ ہو بعض اوقات بہت زیادہ فریب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ واقعات پر نظر رکھتے ہوئے اختر کو سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ بیرسٹر صاحب کے چیں بہ جبیں ہونے کا باعث خود اختر کی ذات ہے بیرسٹر صاحب نعیمہ کی حالت سے اندازہ لگا چکے تھے۔ کہ نعیمہ کیوپڈ کے تیر کا نشانہ بن چکی ہے صرف عینی مشاہدہ باقی تھا سو وہ آج ہوگیا۔ لیکن اختر نے تجاہل عارفانہ سے نہیں بلکہ ان کی برہمی کی اصل وجہ نہ سمجھ کر بیرسٹر صاحب سے مزاج پرسی کے لہجہ میں دریافت کیا "آج آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے چہرے پر افسردگی برس رہی ہے۔ خیریت تو ہے؟" اختر کے اس سوال نے زخم پر نمک پاشی کا کام دیا اور بیرسٹر صاحب نہایت رُوکھے لہجہ میں بولے "اختر صاحب آج کل ایسے لوگ تقریباً عنقا ہیں جن پر پورے طور پر اعتماد کیا جا سکے۔ سخت غصہ اور افسوس ہوتا ہے جب ایسے لوگ جو اپنے آپ کو ظاہر میں اخلاق کا مجسمہ پیش کریں لیکن ایسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کر بیٹھیں جس سے کسی کی اچھی خاصی پُرامن زندگی میں خلل پڑ جائے۔ اکثر اور بیشتر اشخاص ایسے ملیں گے جو اپنی ذمہ داری کو محسوس کئے بغیر محض فوری جذبات کے ماتحت اس چیز کی بنیاد ڈالدیتے ہیں جو آئندہ دوسروں کے لئے بہت مہلک اور ناخوشگوار ثابت ہوتی ہے۔ انسان کا ایک غلط قدم اس کی تمام زندگی خراب کرنے کیلئے بہت کافی ہے"۔ اختر بچہ نہ تھا جو اس تقریر کا مطلب نہ سمجھتا اور رہا سہا شُبہ بیرسٹر صاحب نے یوں رفع کر دیا "زمانہ کی فریب کاریوں کا گلہ کس سے کیا جائے۔ ہاں آپ کے امتحان میں اب تو بہت تھوڑا ہی سا عرصہ رہ گیا ہوگا"۔

اختر۔ جی ہاں! تین ماہ باقی ہیں۔ اپریل کے وسط میں شروع ہونا ہے"۔

بیرسٹر صاحب۔ بھئی۔ اب آپ کو اپنے امتحان کی بھی تیاری کرنا چاہیئے۔ آپ نے اپنا عزیز وقت صرف کرکے نعیمہ کی مدد

کی میں اس کا بہت مشکور گذار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کی ہمدردی اور عنایت سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اب آپ تکلیف نہ فرمائیں۔" نعیمہ کی طرف مخاطب ہو کر بیرسٹر صاحب بولے "اب تو کوئی مشکل پیش نہ آتی ہوگی؟" نعیمہ صرف "جی نہیں" کہکر خاموش ہوگئی۔ بیرسٹر صاحب نے نعیمہ کو یہ کہکر کہ تمہیں تمہاری امی نے بلایا ہے زنانخانہ میں بھیج دیا۔ بیرسٹر صاحب سے اختر کی یوں ہی اکھڑی اکھڑی گفتگو ہوئی اور وہ دس پندرہ منٹ کے بعد اٹھ کر چلدیا۔

(۵)

رات کا وقت ہے کوئی نو بجے کا عمل ہوگا۔ بیرسٹر محمد حنیف اپنی نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے کسی معاملہ پر گفتگو کر رہے ہیں چہرے پر بہت سنجیدگی، ملال اور غصہ کے آثار نمایاں ہیں بیرسٹر صاحب "تم خود سوچو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ میں آنکھوں دیکھے نعیمہ کو کنوئیں ڈالدوں۔ مانا اختر تعلیم یافتہ ہے، شریف النسب ہے اور شکل صورت کا بھی برا نہیں ہے لیکن کیا تعلیم، شرافت اور شکل وصورت کو اوڑھا بچھایا جائیگا۔ آج دولت ہونا سب سے بڑی بات ہے۔ اور اس جنس میں سے اس کے پاس ایک حبہ نہیں۔ اسکے والدین نہایت معمولی حیثیت کے آدمی ہیں۔"

بیوی:۔ "تمہاری نگاہ میں بہا اسے کہیں نوکری ہی نہیں ملیگی۔ تم کہتے ہو کہ لڑکا قابل ہے ایم۔ اے پاس کر کے کہیں نہ کہیں ہو ہی جائیگا۔ خواہ مخواہ بچی کا دل مسوسنا جب تم نے اسے اتنی آزادی دی ہے انگریزی تعلیم دلائی ہے تو اس معاملہ میں بھی اسے آزادی دو۔ اور تم تو خود اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ میں لڑکیوں کی شادی کے بارے میں بہت آزاد خیال ہوں پھر اب وہ آزاد خیالی کہاں گئی؟"

بیرسٹر صاحب۔ "لیکن آزاد خیالی کے یہ تو معنی نہیں کہ میں ایک نادار قلاش شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دیدوں۔"

بیوی۔ "کچھ عرصہ انتظار کرو۔ جب اختر نوکر ہو جائے تو اس وقت کر دینا ایسی افراتفری کیوں ہے۔ ابھی تو نعیمہ کو بھی امتحان دینا ہے۔"

بیرسٹر صاحب۔ عجلت کی وجہ یہ ہے۔ کہ پھر ایک زریں موقعہ ہاتھ سے نکل جائیگا۔ ڈپٹی وزیر احمد صاحب کا لڑکا بشیر احمد ابھی ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر معمور ہوا ہے اور وزیر احمد صاحب اپنے بیٹے کی شادی میں عجلت کر رہے ہیں اور تم جو کہتی ہو کہ اختر امتحان پاس کر کے کہیں اچھی جگہ نوکر ہو جائیگا تو شاید تم نے نوکری نانی جی کا گھر سمجھ لیا ہے کہ فوراً مل جائے گی۔ تمہیں ملک کی اقتصادی حالت بھی معلوم ہے۔ وہ لوگ جن کے تعلقات بہت وسیع ہیں اور جو اعلیٰ افسروں تک سفارشیں پہنچا سکتے ہیں۔ وہ بھی آجکل "جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں۔" اب تم خود ہی بتاؤ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا میں وزیر احمد صاحب کی درخواست کو ٹھکرا دوں اُن سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ بچپن سے اب تک ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے ہیں۔ اب رہا نعیمہ کے متعلق جسے تم محبت کہتی ہو یہ تو بچوں کی باتیں ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد خود ہی خیال جاتا رہے گا۔ زیادہ اٹھنے بیٹھنے اور میل جول سے ایک قسم کا انس پیدا ہو جاتا ہے۔ اب میں نے اختر کی آمد و رفت بند کر دی ہے چند ہی دن کے بعد یہ سب محبت کا ولولہ دب جائے گا۔ ذرا نعیمہ کو بلاؤ تو لو اُس کی بھی رائے لیلیں۔" بیوی نعیمہ کے خواب گاہ کی طرف جاتی ہے۔ نعیمہ کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولکر اندر

قدم رکھتی ہے۔ نعیمہ ایک کرسی پر بیٹھی ہے، بال پریشان ہیں۔ دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر پڑا ہوا ہے۔ سر میز پر ہے اور آہستہ آہستہ کر یہ کناں آہیں بھر رہی ہے۔ بیرسٹر صاحب کی بیوی اپنی بیٹی کے قریب پہنچ کر اور اُسکے سر پر ہاتھ پھیر کر نہایت شفقت سے پوچھتی ہے "نعیمہ کیا بات ہے۔ نصیبِ دشمنان کچھ جی تو خراب نہیں ہے اس طرح کیوں بیٹھی ہو" نعیمہ جلدی سے دوپٹے سے آنسو خشک کرکے اور حواس کو جمع کرکے اوپر گردن کرتے ہوئے بولی "کچھ نہیں ذرا سر میں درد ہے۔ آج صبح سے طبیعت بھاری بھاری ہو رہی ہے اور ہاتھ پیر بھی گرے رہے ہیں"

جمیلہ (نعیمہ کی والدہ) "اور تو کوئی بات نہیں۔ خیر سونے کے بعد ٹھیک ہو جائیگی۔ آؤ ذرا میرے ساتھ تو چلو تمہارے ابا بلا رہے ہیں"

نعیمہ کرسی پر سے اُٹھی، دوپٹا ٹھیک کرکے اوڑھا اسپر دوشالہ اوڑھ اپنی ماں کے ہمراہ ہولی نشست گاہ میں پہنچکر بیرسٹر صاحب کو آداب کرکے ایک کرسی پر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔ نعیمہ کے چہرے کا رنگ بالکل سپید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے نعیمہ کی طرف غور سے دیکھکر کہا "نعیمہ کیا تیری طبیعت کچھ علیل ہے، یہ آنکھوں میں حلقے کیسے پڑے ہوئے ہیں"

نعیمہ۔ "جی ہاں صبح سے بخار کی حرارت ہے اور سر میں بے حد درد ہے"

بیرسٹر صاحب۔ "تم نے صبح سے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا" اپنی بیوی سے "گر اسکی طبیعت خراب تھی تو لے کیوں آئیں پھر دیکھا جاتا"

نعیمہ۔ "جی نہیں۔ کچھ ایسی زیادہ تکلیف نہیں ہے۔ آپ نے کیوں یاد فرمایا تھا"

بیرسٹر صاحب۔ "تم سے کچھ مشورہ لینا تھا۔ پھر سہی اب تو تم جا کر آرام کرو"

نعیمہ۔ "حاضر ہوں فرمایئے۔ ذرا میری بھی طبیعت بہلیگی"

بیرسٹر صاحب۔ "آج وزیر احمد صاحب نے اپنے صاحبزادے بشیر احمد ایم۔ اے کا رقعہ بھیجا ہے بشیر احمد کا ابھی ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر تقرر ہوا ہے۔ بشیر احمد شکل وصورت کے لحاظ سے جیسا تم بھی جانتی ہو خوبصورت آدمی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے اور خدا کے فضل وکرم سے عزت دار آدمی ہے۔ میں اور تمہاری والدہ تو قطعی رضامند ہیں اب صرف تمہاری رائے اور لینا ہے"

نعیمہ۔ "اباجان اگر واقعی آپ میری رائے دریافت فرمانا چاہتے ہیں آپ تو مجھے اجازت دیدیجئے تاکہ میں اپنی آزادانہ رائے پیش کر سکوں۔ اور یقین دلا دیجئے کہ میری رائے وقعت کی نظر سے دیکھی جائیگی اور اگر آپ پیشتر ہی سے طے فرما چکے ہوں تو میرا کچھ عرض کرنا بیکار ثابت ہوگا"

بیرسٹر صاحب۔ "نورچشم۔ اگر تمہاری رائے صائب ہوگی تو ضرور مانی جائیگی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسے وقعت کی نظر سے نہ دیکھا جائے"

نعیمہ۔ "اباجان ابھی تو مجھے کچھ عرصے کے لئے معذور رکھیئے"

بیرسٹر صاحب۔ "ابھی سے میرا مطلب آج کل یا ماہ دو ماہ نہیں ہے میری خواہش یہ ہے کہ میں وزیر احمد صاحب کو اثبات

میں جواب دیدوں اور تمہارے امتحان کے بعد شادی کر دی جائے۔"
نعیمہ۔ "میں ابھی شادی ہی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ اکثر فرما چکے ہیں کہ میں آپ کی طرف سے اس معاملہ میں آزاد ہوں میری درخواست ہے کہ آپ اس جگہ میری نسبت نہ ٹھیرائیں۔"
بیرسٹر صاحب۔ "آخر تمہیں اس نسبت پر اعتراض کیا ہے۔ کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔"
نعیمہ۔ "اعتراض تو کچھ نہیں ہے۔ لیکن میں یہاں نہیں چاہتی۔"
بیرسٹر صاحب۔ "بیوقوف مت بنو۔ عقل سے کام لو۔ بشیر احمد میں ہر وہ چیز موجود ہے جو تمہارے لائق اور شایاں ہے، علم، شرافت، دولت، اور مردانہ حسن، اور تمہیں کیا چاہیئے؟ بغیر کسی وجہ کے تو میں تمہاری رائے ماننے کیلئے طیار نہیں ہوں۔"
نعیمہ۔ "آپ میرے قبلہ و کعبہ ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے عرض حال کرتے شرم آتی ہے۔ کاش آپ میرا منشا خود ہی سمجھ لیتے تو مجھے اپنی زبان سے عرض نہ کرنا پڑتا۔"
بیرسٹر صاحب۔ "میری نور نظر، خدا تمہیں باحیا اور باشرم ہونے کی اس سے بھی زیادہ توفیق دے۔ لیکن اس معاملہ میں تمہیں صاف گوئی سے کام لینا چاہیئے۔ یہاں شرم اور حیا کا کیا ذکر۔"
نعیمہ نے نیچی آنکھیں کرلیں اور خاموش ہوگئی۔ آخر بہت ہمت کرکے نہایت دبی زبان سے بولی "مجھے اختر صاحب سے محبت ہے۔" نعیمہ کہنے کو تو کہہ گئی لیکن پیشانی پر پسینہ آگیا۔ تمام جسم میں غیرت کی وجہ سے ایک بجلی دوڑ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس ذرا سے فقرہ کے اظہار نے نعیمہ کی خیالی دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ امید و بیم کی کشمکش شروع ہوگئی۔ کبھی تو ذہن پُربہار منظرہ کھاتا اور کبھی غم، رنج اور مایوسی کی تاریکی میں لا پھینکتا۔ بیرسٹر صاحب بھی ایک گہری فکر میں غرق ہوگئے۔ وہ پہلے بھی اس راز سے واقف تھے لیکن صرف سودے کا اُبال تصوّر کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ اب تک طبیعت میں تغیر پیدا ہوگیا ہوگا۔ لیکن بیرسٹر صاحب صرف محبت کی خاطر نعیمہ کی شادی اختر جیسے نادار شخص سے نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پیشتر ہی اس امر کا فیصلہ کر چکے تھے۔ نعیمہ سے مشورت تو محض مُنہ جھوٹانے کی غرض سے تھی چنانچہ بیرسٹر صاحب نے نہایت فیصلہ کن لہجہ میں کہا "نعیمہ محض اس وجہ سے کہ تمہیں اُس سے محبت ہے میں تمہاری شادی اُس کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ میں اختر کو بشیر احمد پر ہرگز ترجیح نہیں دونگا۔ اور نہ کوئی صاحب عقل ایسا کریگا۔ تم محض بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ یہ جنون جب تمہارے سر سے اُتر جائیگا تو تمہیں پچھتانا پڑیگا۔"
نعیمہ۔ "میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ آپ کے فیصلہ کے سامنے میری رائے اور خواہش کوئی وزن نہیں رکھتی۔ معاف فرمائیے میں نہیں سمجھ سکتی کہ والدین اپنی اولاد اور وہ بھی تعلیم یافتہ اولاد کے لئے شریک زندگی کے انتخاب میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ میں آپ کے انکار کا اصلی سبب سمجھتی ہوں یعنی یہ کہ اختر صاحب کے پاس دولت و ثروت نہیں ہے۔ مجھے صرف یہی عرض کرنا تھا۔ آخر میں اتنا اور گوش گذار کئے دیتی ہوں کہ اگر آپ اختر صاحب سے مناکحت کے خلاف ہیں تو مجھے شادی سے قطعی معذور سمجھیے۔ میں کسی اور کے ساتھ ہرگز شادی نہ کرونگی۔"

بیرسٹر صاحب "نعیمہ۔ تمہاری یہی غیرت اور حیا تھی۔ تمہیں لڑکی ہو کر اتنی جسارت نہیں کرنی چاہیئے۔ میں صرف تمہاری ہی بھلائی کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا" بیرسٹر صاحب یہ نادرشاہی حکم دیکر اپنی خوابگاہ کی طرف چلدئے۔

(۶)

انسان کی ذہنی کیفیات نہ صرف اپنے ماحول ہی سے اثر پذیر ہوتی ہیں بلکہ اکثر صرف ایک لفظ کا ردوبدل ان کیفیات میں ایک عظیم الشان قیامت برپا کر دیتا ہے۔ ایک خوشگوار صبح کو اختر نہایت مسرور اپنی نشست گاہ میں بیٹھا ہوا انگریزی اخبار کے ایک خاص کالم کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ کالم تھا جس میں اختر کی روشن اور نمایاں کامیابی کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اختر ایک ممتاز اور اعلیٰ درجہ حاصل کر کے ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق پُر فریب خواب دیکھ رہا تھا ابھی وہ اسی "خواب بیداری" میں اپنی پوری پروازِ خیال کے ساتھ اُڑ رہا تھا کہ اُسے ڈاکیہ کی "خط لیجاؤ" کی غیر شاعرانہ آواز نے چونکا دیا۔ اس نے خود جلدی سے اُٹھ کر ڈاکیہ سے خط لیا اور لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کا مضمون یہ تھا ؎

"ضیف منزل"
دریا گنج دہلی

"جگر اُمید کی آخر کو یاس نے لیلی
فضا بدل گئی دنیائے یار پرور کی"

آہ! محبت بھی کس قدر پُر فریب جذبہ ہے جس نے مجھے آج تک اسی دہوکہ اور مبالغہ میں مبتلا رکھا کہ آپ بے وفا نہیں بلکہ محض تغافل کیش اور بے نیاز ہیں۔ لیکن آپ کی اس بے رخی اور طویل خاموشی نے میری اُمیدوں کی دُنیا کو یاس میں تبدیل کر دیا۔ دل تو نہیں چاہتا کہ آپ کو بے وفا یا سنگدل کہوں لیکن واقعات مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں ایسا سمجھوں ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاک اہلِ دُنیا جل گیا

"کیا میں آپ سے یہ اُمید رکھوں کہ آپ میری آخری آرزوئے دید کو پورا کرنے کی زحمت گوارا فرمائینگے"

آرزوئے دید کی مُتمنّی
نعیمہ

"افسوس میری مصلحت آمیز خاموشی نے نعیمہ کو مبالغہ میں ڈالدیا میں سمجھا تھا کہ میری خاموشی اور یہ پہلو تہی جو سراسر نعیمہ کے مفاد پر مبنی تھی، میری یاد کو اُس کے دل سے محو کر دیگی لیکن نتیجہ اُس کے بالکل برعکس ہوا" یہ تھے خیالات جو اختر کے دماغ میں نعیمہ کا خط پڑھنے کے بعد چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے دوبارہ خط کو اُٹھایا اور پھر پڑھا اور خط کے آخری فقرے پر آکر ٹھہر گیا اسکے دماغ میں ان الفاظ نے ("میری آخری آرزوئے دید") ایک تلاطم پیدا کر دیا۔ اِس سے نعیمہ کا کیا مطلب ہے۔ یہ لفظ "آخری" کے کیا معنی؟ کیا نعیمہ نے اپنی حالت اسقدر ناگفتہ بہ بنالی کہ اسے اب اپنی زندگی کی

بھی آس نہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ اُس کے دماغ کا ایک فریب ہے" یہ الفاظ اختر نے باآواز بلند کہے اور نہایت بے چینی سے کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ یکایک اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُس نے یہ کہتے ہوئے کہ "میں ابھی جاکر نعیمہ کو تسلی اور تشفی دے کر سمجھاتا ہوں تاکہ اس کا اضطراب رو بہ سکون ہو" کھونٹی پر سے اچکن اُتاری اور چل دیا۔

(۷)

"بیرسٹر صاحب تو لاہور گئے ہوئے ہیں۔ دو تین دن میں آئینگے۔ میاں اختر اب تو آپ آتے ہی نہیں" خادمہ نے اختر کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

اختر۔ (خادمہ کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے) "گھر پر تو سب اچھی طرح ہیں۔ چھوٹی صاحبہ خیریت سے ہیں"؟

خادمہ "سرکار۔ چھوٹی صاحبہ کی طبیعت تو کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ دن رات اپنے کمرہ میں بند پڑی رہتی ہیں۔ اور ہاں آج مجھ سے کہا تھا کہ اختر میاں آئیں تو مجھے خبر کرنا۔ آپ کمرہ میں بیٹھیں میں اطلاع کرتی ہوں" یہ کہہ کر خادمہ اندر زنانخانہ میں چلی گئی اور اختر نشست گاہ میں جا بیٹھا۔ خادمہ کو گئے ہوئے کچھ دیر نہ گذرنے پائی تھی کہ نعیمہ ایک پیکرِ یاس و حرماں بنی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ نقاہت کی وجہ سے پیر ڈالتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا چہرہ طویل علالت کے باعث دُھلے ہوئے کپڑے کی مانند سپید ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اختر نعیمہ کو اس حالت میں دیکھکر تصویرِ حیرت و استعجاب بن کر رہ گیا۔ نعیمہ آگے بڑھی لیکن کمزوری کی وجہ سے اُس کے قدم لڑکھڑائے اور اگر اختر نہ سنبھالے تو نعیمہ زمین پر گر پڑتی۔ اختر نے اُس کا شانہ پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ بہت دیر تک خاموش ایک دوسرے کو بیٹھے دیکھا کئے۔ لیکن اختر نے اس موقع کو غنیمت جان کر سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

اختر "نعیمہ۔ تم نے یہ کیا اپنی حالت بنالی۔ دامنِ صبر ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ نعیمہ خدارا تم مجھے ان مشکوک نگاہوں سے مت دیکھو۔ میں بے وفا ہرگز نہیں ہوں۔ میری طویل خاموشی محض اس لئے تھی کہ بیرسٹر صاحب کے دل میں جو غلط خیال ہماری طرف سے جاگزیں ہو گیا ہے وہ دور ہو جائے اور تم پر کوئی حرف گیری نہ کرسکے۔ اور تمہارے دامنِ عصمت پر کوئی غلط داغ نہ آئے۔ تمہیں استقلال اور ہمت سے کام لینا چاہیئے"۔

نعیمہ نہایت دردانگیز آواز میں بولی "اختر۔ میں اپنی اس حالت کا ذمہ دار تمہیں نہیں ٹھیراتی تم سے مجھے صرف اتنی شکایت ہے کہ تم نے میری یاد کو بالکل فراموش کر دیا"۔

اختر "نعیمہ میں تمہیں اس امر کا کس طرح یقین دلاؤں کہ اُس دن سے اب تک کوئی لمحہ تمہاری یاد سے خالی نہیں گذرا اور اس کے مزید ثبوت کے لئے میں اب وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی سبیل ضرور ایسی نکالونگا کہ ہم کبھی کبھی مل لیا کریں"۔

نعیمہ "افسوس اب اسکی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔ اول تو اب مجھے اپنے جانبر ہونے کی کوئی آس نہیں اور اگر میں سخت جان بچ بھی گئی تو جلد از جلد دوسرے کے قبضہ میں ہو جاؤنگی"۔

اختر: "یعنی یہ کہ اب تم کسی کے ساتھ رشتۂ مناکحت میں منسلک کی جانے والی ہو۔ نہایت مبارک لیکن اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ ازدواج کے تو محض یہ معنی ہیں کہ تم ایک شخص کو اپنا شریکِ زندگی بنا کر اپنی اس دنیوی زندگی کو نہایت خوش اسلوبی سے گذار جاؤ مگر یہ رشتۂ ازدواج ہماری محبت میں سدِ راہ تو نہیں ہو سکتا۔"

نعیمہ: "کیوں نہ اسی شخص کو شریکِ زندگی بنایا جائے جس سے ہمیں محبت ہے تاکہ یہ سفرِ حیات اور زیادہ خوشگوار طریقہ سے طے ہو جائے۔"

اختر: "مگر نعیمہ تم نے یہاں ایک نہایت اہم بات کو نظر انداز کر دیا۔ محبت ایک خلشِ پیہم کا نام ہے۔ جو محض اسی وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اسکی تسکین کا سامان مہیا نہ ہو۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ تلاش محض اسی وقت تک ہے جبتک مقصد حاصل نہ ہو۔ حصولِ مقصد کے بعد جستجو کا ہونا بے معنی ہے۔ اگر تم محبت میں "ابدی مسرت" حاصل کرنا چاہتی ہو تو ازدواجِ محبت کا خیال چھوڑ دو تاکہ ہم اس عارضی زندگی کے بعد اس آنیوالی حیاتِ دوام میں ہمیشہ ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہیں۔"

نعیمہ یہ تقریر سنکر دم بخود ہو کر رہ گئی۔ جذبات کا وہ ہجوم تھا کہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود زبان سے ایک حرف تک نہ نکال سکی۔ تمام آرزوئیں پامال ہو گئیں۔ تمام امیدیں جو نعیمہ نے اختر سے وابستہ کی تھیں نقش برآب ثابت ہوئیں۔ نعیمہ پر اسوقت عجیب استغراق کا عالم طاری تھا۔ اس کی نگاہیں اختر کے چہرے پر گڑی تھیں اور تن بدن سے قطعی بے خبر تھی کہ اختر کی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ جو یہ کہہ رہا تھا "نعیمہ۔ خدا حافظ" ابھی نعیمہ اچھی طرح ہوش میں بھی نہ آنے پائی تھی کہ کمرہ خالی تھا اور اختر جا چکا تھا۔

۵

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عین اس وقت جب کہ بیرسٹر محمد حنیف کے مردانے میں شادی کی خوشی سے چہل پہل ہو رہی تھی اور باراتی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے آپس میں مسکرا مسکرا کے خوش گپیاں کر رہے تھے ایک خادمہ نہایت بیتابانہ بھاگی ہوئی بیرسٹر صاحب کے پاس آئی اور نعیمہ کے اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے موت کی جانفرسا خبر سنا کر زار زار رونے لگی۔ شادی کی خوشی صفِ ماتم میں تبدیل ہو گئی۔ بیرسٹر صاحب اب بجائے نعیمہ کے جہیز کا سامان باہر نکلوانے کے اسکی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ شہر کے تمام شرفا نعیمہ کو آخری منزل پہنچانے کے لئے قبرستان تک میت کے ہمراہ گئے، دفن اور فاتحہ کے بعد اس سنسان گورستان میں سوائے دو شخصوں کے اور کوئی بھی نہ رہا۔ جن میں سے ایک اختر تھا اور دوسرا اسکا دوست محمود۔ محمود نے اختر کی نازک حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے نہایت تسلی آمیز لہجہ میں کہا "بھائی اختر مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا چارہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان مجبورِ محض ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ صبر کرنا چاہیئے۔" اختر نے محمود کی طرف نہایت مجنونانہ طریقہ سے دیکھا اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر ایکدم چلا اٹھا "کیا تم تنہا یہ سفر طے کرو گی۔ نہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں تمہیں ایسے شریکِ زندگی کی ضرورت ہے جسے تم سے محبت ہو حقیقی اور ابدی محبت ہو۔ یہاں کا [illegible] ہو گا۔" اختر نے [illegible] کہی اور ہمیشہ کے لئے زمین پر گر کر [illegible] ہو گیا۔

غزلیات

ہے عجب حال سرِ گورِ غریباں انکا
لاکھ ہنستے ہیں مگر دل ہے پشیماں اُن کا

مجھ سے چھپتے ہیں مگر چھپ کے کہاں جائینگے
یہ دلِ صاف ہے آئینۂ حیراں اُن کا

چاک کر کے جیب سے پھیروں کفِ افسوس ملے
ہاتھ سے چھوٹ گیا گوشۂ داماں اُن کا

چھوڑے جاتے ہیں مجھے قافلے والے، کیا غم
وہی میرا ہے نگہباں جو نگہبان اُن کا

اس کو وحشت سے سروکار اُسے زینت سے
ایک دامن ہے مرا، ایک گریباں اُن کا

اِک سہارا تو لگا رہتا ہے اِک آس تو ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ پورا نہ ہو پیماں اُن کا

نرگس و لالہ و گُل، سنبل و شمشاد سہی
قصہ کوتاہ، گلستاں کا گلستاں اُن کا

عمر بھر چاک کیا بیٹھ کے اپنا دامن
ایک دن دیکھ لیا جس نے گریباں اُن کا

ترے وحشی نہ ہوئے دستِ جنوں کے محتاج
آپ ہی آپ ہوا چاک گریباں اُن کا

چاک کرنے کی نہ ہمت ہو مجھے پر باسط
اپنے دامن کو سمجھ لوں جو گریباں انکا

باسط بسوانی

برتر خیال و وہم سے دنیائے عشق ہے
حسن اثر کے ساتھ تماشائے عشق ہے

آشوبِ روزگار تماشائے عشق ہے
کہتے ہیں جس کو حشر وہ فردائے عشق ہے

دو نام رکھ لئے ہیں نگاہِ مجاز نے
ورنہ جہانِ حسن بھی دنیائے عشق ہے

باایں ہمہ کمال یہ ذوقِ عبودیت
حسنِ جمیل ناصیہ فرسائے عشق ہے

بدمست کردے ساقیِ بزمِ ازل مجھے
خم خانۂ الست میں صہبائے عشق ہے

سرمایۂ سرور و خوشی رنج و غم کو جان
اے مائلِ نشاط یہ دنیائے عشق ہے

وہ چیز عرفِ عام میں کہتے ہیں جس کو دل
دیکھا تو زیب و زینتِ دنیائے عشق ہے

اس مرحلہ میں کام نہیں عقل و ہوش کا
ہو سب سے بے نیاز یہ ایمائے عشق ہے

حسنِ لطیف کو ملے کیا دل فریب نام
یہ جانِ آرزو یہ تمنائے عشق ہے

ممکن نہیں کہ نورِ محبت میں ہو کمی
ہر زخمِ دل کا حوصلہ افزائے عشق ہے

شمشی نامراد کو تم جانتے نہیں
محرومِ التفات ہے رسوائے عشق ہے

شمسی (الہ آباد)

مبارک خضر کو کس طرح عمرِ جاودانی ہے
وبالِ جان یاں تو چار دن کی زندگانی ہے

جوانی کی کہانی خواب کی سی اب کہانی ہے
نہ وہ جوشِ طبیعت ہے، نہ شغلِ نغمہ خوانی ہے

ترا بیمارِ فرقت اب تو کوئی دم میں فانی ہے
نہیں کھلتی ہیں آنکھیں تک یہ زورِ ناتوانی ہے

گئے وہ دن کہ ہر ذرّے سے اک مستی نمایاں تھی
نشاطِ رفتہ کی اب یاد ہے اور نوحہ خوانی ہے

وہ دن بھی تھے کہ میں بیفکر رہتا تھا مگر اب تو
کشاکش ہائے گوناگوں سے مشکل زندگانی ہے

تمہاری کم نگاہی نے مجھے یہ دن دکھائے ہیں
مری جانِ حزیں پامالِ جورِ آسمانی ہے

کیا یہ خوگرِ بندِ قفس قیدِ مسلسل نے
کہ اب فکرِ رہائی ہے، نہ ذوقِ پرفشانی ہے

عزیز از جان و دل کیونکر نہ ہو داغِ جگر مجھ کو
کہ یہ بچھڑے ہوئے اک دوست کی پیاری نشانی ہے

یہ سچ ہے۔ دل میں ہمت ہو تو پھر پتھر بھی ہو پانی
یہاں تو شدتِ غم سے کلیجہ اپنا پانی ہے

نگاہِ شوق میری رخنہ کر چھوڑے گی پردے میں
مجھے کچھ غم نہیں ان کو جو وردِ لنترانی ہے

خودی کو ترک کرکے تو خدا کا قرب حاصل کر
طریقِ عشق میں مٹنا ہی اصلِ زندگانی ہے

غریقِ بحرِ عصیاں ہم رہے تا زیست، اے حسان!
سزا دے وہ تو کیا شکوہ۔ جو بخشے، مہربانی ہے

حسان جعفری

اشکِ بےتاب کو بیگانۂ داماں کرلے!
یعنی خاموشی کو شرحِ غمِ پنہاں کرلے!

ہو کے غلطیدۂ خوں دیکھ تماشائے بہار
جیب و دامن کو بھی ہم رنگِ گلستاں کرلے

منتشر دم میں ہو آشفتہ مزاجوں کا نظام
وہ اگر کاکلِ شبرنگ پریشاں کرلے

اپنے ہر فعل میں اندازِ جنوں پیدا کر
اپنی ہر بات میں وحشت کو نمایاں کرلے

منحصر ہے تری ہمت پہ یہ اے مرغِ اسیر
تو جو چاہے تو قفس کو بھی گلستاں کرلے

راز بنگش کوہاٹی

سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کیا نیرنگِ عالم ہے
یہ آخر بات کیا ہے جس کو دیکھو موردِ غم ہے

تمہاری بزم میں جا کر نیا غم مول لے آئے
جگر میں درد ہے، دل میں الم ہے، آنکھ پُرنم ہے

ہمیں مرنے کا اپنے غم نہیں، اک روز مرنا تھا
ستم اُن کے بہت سے رہ گئے، اس بات کا غم ہے

انہیں یہ کس طرح سمجھاؤں وہ یہ کس طرح سمجھیں
بظاہر ہنس رہا ہوں دل مرا مصروفِ ماتم ہے

عزیزِ زار تیرا راز اب چھپنا نہیں ممکن
یہ آنسو تیرے شاہد ہیں کہ تو مصروفِ ماتم ہے

عزیز ردولوی

بہارِ باغِ عالم بے ثباتی کی نشانی ہے — یہ دنیا اِک نمائش گاہ ہے اور وہ بھی فانی ہے
یہ عالم ہے کہ اب مرنے سے بدتر زندگانی ہے — کسی پر دل کا آجانا بلائے ناگہانی ہے
نہ جینا ہی میسر ہے نہ مرگِ ناگہانی ہے — الٰہی کس غضب میں عاشقوں کی زندگانی ہے
کہاں وہ بادۂ پُرجوش ہیں بھی ادھر سے ساقی — تری نظروں میں جو کیفِ شرابِ ارغوانی ہے
کئے دیتی ہے سب انشا صدائے بے صدا بنکر — غضب کی ترجمانِ دل زبانِ بے زبانی ہے
گراں ہے اب تو احساسِ محبت بھی محبت میں — کہوں کیا چارہ گر تجھ سے جو حالِ ناتوانی ہے
بچا کر چلتے ہیں دامن کو وہ گورِ غریباں سے — شہیدانِ وفا سے ان کو اب تک بد گمانی ہے
مسیحائی نہیں حاجت مریضانِ محبت کو — پیامِ مرگ پیغامِ حیاتِ جاودانی ہے
مجھے دیکھو لئے بیٹھے ہو کیا افسانۂ مجنوں — حقیقت پھر حقیقت ہے کہانی پھر کہانی ہے
اٹھے گی اب کوئی افتادِ تازہ کس طرح یارب — خود اپنا سر نہیں اٹھتا یہ بارِ ناتوانی ہے
مآلِ قصۂ اُلفت ہو آغازِ حکایت میں — کوئی ایسا بھی افسانہ ہے ایسی بھی کہانی ہے
ہمیں کو دوست کہتے ہیں ہمیں سے کھنچ کے ملتے ہیں — ہمیں پر ناز ہے اُن کو ہمیں سے بدگمانی ہے

نہاںؔ آخر کہو تو حالِ دل یہ ماجرا کیا ہے
کہ لب ہیں خشک آنکھیں تر ہیں رنگت زعفرانی ہے

نہاںؔ آفریدی رامپوری

اندھا عاشق

از لارڈ ڈلٹن۔ مترجمہ جناب نورالحسن برلاس
بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (علیگ)

میکلن میں دوپہر کا وقت ہے۔ گرجا کے گھنٹہ کی آواز سُن کر شہر کے باشندے اتوار کی نماز کے لئے جوق جوق چلے آرہے ہیں۔ لوگ پہلے ہی سے گرجا کے احاطہ میں جمع ہونے لگے تھے گھنٹہ ختم ہوتے ہوتے سب اندر داخل ہوگئے۔

ایک نوجوان نیچی نگاہ کئے ہوئے بازار میں کھڑا ہے۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے کیونکہ آنکھیں اٹھائے متفکرانہ انداز سے ہر طرف مُڑتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی پتلی زنجیر جس کا سرا زمین پر پڑا ہے اور وہ ٹھیر ٹھیر کر غمگین لہجہ میں پکارتا ہے "فیڈو! فیڈو! واپس آجا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے؟" لیکن فیڈو واپس نہ آیا۔ کتا قید سے گھبرا کر زنجیر سے نکل بھاگا ہے اور اپنے ہمجنسوں سے ملنے کہیں چلا گیا ہے۔ نابینا آقا کو اکیلا چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح ہو سکے خود اپنی قیام گاہ کو چلا جائے۔

تھوڑی دیر میں بازار میں قدم کی آہٹ سنائی دی اور نوجوان اجنبی کے چہرہ پر مسرت کے آثار ظاہر ہوئے جس جگہ آواز سنی تھی اس طرف مُڑ کر اس نے کہا "تکلیف معاف فرمائیے گا۔ آپ کا حرج نہ ہو تو مارٹن ہوٹل کا راستہ بتا دیجئے۔"

جس سے اس نے خطاب کیا وہ ایک نوجوان عورت تھی جس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، اس نے جواب دیا "جناب ہوٹل یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ اگر آپ سیدھے سو قدم چلے جائیں اور دوسرے موڑ پر مڑ جائیں ....."

اجنبی نے بات کاٹ کر دلگیر لہجہ میں کہا "افسوس! آپ کی ہدایت سے مجھے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ میرا کتا مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے اور میں اندھا ہوں۔"

ان الفاظ میں اور اس کی آواز میں کچھ ایسا اثر تھا کہ عورت کے دل پر چوٹ لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے جواب دیا "معاف فرمائیے! میں نے آپ کی اِس ....." اس کے منہ سے "مصیبت" کا لفظ نکلنے والا تھا لیکن اس کی فطری نزاکت نے زبان روک لی۔ "مجھے اپنا ہاتھ دیجئے میں آپ کو دروازہ تک پہنچائے دیتی ہوں" پھر یہ دیکھ کر کہ اسے تامل ہے کہا "نہیں جناب! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں مجھے فرصت ہے میرا کوئی حرج نہ ہوگا۔"

اجنبی نے اپنا ہاتھ اس عورت کے ہاتھ میں ڈال دیا۔ اور اگرچہ لوسی فطرتاً ایسی شرمیلی تھی کہ خود اس کی ماں نیکی کی اس افراط پر مذاق سے طعنہ دیتی تھی لیکن اس نے اپنے تئیں ایک ایسے اجنبی کے ساتھ جس کی وضع قطع سے ظاہر ہوتا تھا کہ اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، میکلن کے بازاروں میں اکیلا چلتا ہوا پا کر کچھ شرم محسوس نہ کی۔

اجنبی نے کچھ توقف کے بعد کہا "آپ کی آواز نرم ہے۔" اور ایک خفیف سی آہ بھر کر کہا "اور یہی ایک مقیاس ہے جس کے ذریعہ سے میں نوجوانوں اور خوبصورتوں کو پہچانتا ہوں۔" لوسی کا چہرہ شرم سے سُرخ ہوگیا اور شرم میں کچھ رنج بھی ملا ہوا تھا کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ خوبصورتی کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اجنبی نے پوچھا "کیا آپ اسی شہر کی رہنے والی ہیں؟"

"جی ہاں۔ میرے والد آبکاری میں ایک چھوٹی خدمت پر ملازم ہیں اور ہم ماں بیٹیاں لیس بُن کر کچھ اور پیدا کر لیتی ہیں۔ ہم غریب کہلاتے ہیں مگر ہمیں مفلسی محسوس نہیں ہوتی"

نابینا نے حسرت آمیز لہجہ میں جواب دیا "آپ خوش قسمت ہیں! دل کی دولت یعنی قناعت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے"

لوسی کو اپنے اوپر غصہ آیا کہ میں نے اجنبی کے دل میں ایک قدرتی رشک پیدا کر دیا۔ اور بات ٹالنے کی غرض سے کہا "اور جناب کیا عرصہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں؟"

"کل ہی آیا ہوں میں ان اطراف میں سیاحی کر رہا ہوں۔ شاید آپ کو ایک اندھے کی سیاحت پر تعجب ہوگا لیکن اندھا بھی ہمیشہ ایک جگہ رہنے سے گھبرا جاتا ہے۔ شہر کے مناظر کا لطف تو میں اٹھا نہیں سکتا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ گرجا کے وقت بازار خالی ہوں گے اور اپنے کتے کی مدد سے کم از کم ہوا کا لطف اٹھا لونگا۔ مگر بعض لوگ ایسے بدقسمت ہوتے ہیں کہ کتا بھی ان کا دوست نہیں بن سکتا"

نابینا نے یہ کلمات حسرت بھری آواز سے کہے۔ کتے کے بھاگ جانے نے اس کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ لوسی نے اپنی آنکھیں رومال سے پوچھیں اور دریافت کیا "کیا آپ اکیلے سفر کرتے ہیں؟" ابھی تک اس نے اجنبی کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اب اس نے چہرہ پر غور سے نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں ہے "کیا آپ کے والد یا والدہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟" والدہ کے لفظ پر اس نے زور دیا۔

اجنبی نے جواب دیا "میں یتیم ہوں اور میرا کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے"

اس نابینا کی تنہائی نے لوسی کا دل پگھلا دیا۔ اس کے دل پر کبھی ایسا اثر نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں عجب طرح کی دھڑکن سی ہونے لگی جس نے ایک مخفی اور سچی ہمدردی کی شکل میں اس کے اور اجنبی کے درمیان ایک تعلق پیدا کر دیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کاش کہ میں اس کی بہن ہوتی!

فقدانِ بصر نے اس کی چستی چالاکی برباد کر دی تھی اور جوانی کی اُمنگیں خاک میں ملا دی تھیں۔ حُسنِ صورت اور جوانی پھر اس پر اندھے پن کی مصیبت! اجنبی نے لوسی کے دل میں جو جذبات پیدا کئے تھے وہ اس اختلافِ حالات سے اور بڑھ گئے۔ اس کے خط و خال موزوں تھے اور اس کے چہرہ سے شرافت ٹپکتی تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا اور اعضا میں تناسب تھا مگر وہ قدم پھونک پھونک کر رکھتا تھا اور اس کی رفتار سے زندہ دلی مفقود تھی۔

ہوٹل کو جاتے جاتے وہ ایک تنگ بازار میں پہنچ گئے تھے کہ پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز سنائی دی اور لوسی نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو بلجیم کا ایک رسالہ سرپٹ آتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ اپنے ہمراہی کو دیوار کے قریب لے گئی اور اس کی سلامتی کے خوف سے کانپتی ہوئی اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ رسالہ تیزی کے ساتھ بازار میں سے گزرا۔ سواروں کے ہتھیاروں کی جھنکار سے اور ان کے بھاری بھرکم گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ سے نابینا پر جو اثر ہوا اگر لوسی غور سے دیکھتی تو معلوم ہو جاتا کہ اس کا اُداس چہرہ جوش سے شاداں ہو گیا ہے اور اس کا سر اپنی معمولی خمیدہ حالت سے اُٹھ گیا ہے۔ رسالہ تقریباً گزر چکا تھا کہ لوسی نے کہا "خدا کا شکر ہے! خطرہ جاتا رہا" مگر اس کا خیال غلط تھا۔ آخری دو سوار

جو پہلو بہ پہلو جا رہے تھے ان میں سے ایک بدقسمتی سے شریر گھوڑے پر سوار تھا۔ سوار کی مہمیز نے اس کی بے صبری اور تیزی بڑھادی اور وہ تنگ بازار میں اِدھر اُدھر دولتیاں چلانے لگا۔

جونہی گھوڑا بھڑک کر لوسی اور اجنبی کے قریب آیا سوار نے چلا کر کہا "تم دونو پاگل ہو گئے ہو؟ بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"

"خدا کے واسطے میرے ساتھی کو بچا دو، وہ اندھا ہے۔" یہ کہہ کر لوسی اجنبی کے اور نزدیک آگئی۔

اجنبی نے کہا "میری مہربان رہنما تم خود تو بچ جاؤ" لیکن لوسی کے خواب و خیال میں بھی اسے چھوڑ کر بھاگ جانے کا ارادہ نہ تھا۔ سوار نے گھوڑے کو ان کے پاس سے ہٹایا۔ مہمیز لگنے سے گھوڑے نے غصہ سے دولتی چلائی اور لوسی چونکہ دونو کو نہیں بچا سکتی تھی نابینا کے سامنے آکھڑی ہوئی اور گھوڑے کی لات جو اجنبی کے لگنے والی تھی اس کے لگی۔ اس کی نازک کلائی ٹوٹ کر لٹک گئی اور گھوڑا آگے نکل گیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ بچ گئے!" یہ الفاظ تھے جو لوسی نے گھوڑے کے نکل جانے پر کہے اور درد اور خوف سے مغلوب ہو کر اجنبی کے ہاتھوں میں جو بلا ارادہ پھیل گئے تھے گر پڑی۔

اجنبی نے کہا "میری رہنما! میری مہربان! تمہارے چوٹ آئی ہے تم ......"

لوسی نے بات کاٹ کر دھیمی آواز میں کہا "نہیں جناب میں اب اچھی ہوں --- براہ مہربانی یہ ہاتھ ...... اب آپ کا ہوٹل دُور نہیں ہے"

مگر اجنبی کا سامعہ اور سے بہرا تار چڑھاؤ سے آشنا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ لوسی درد سے بے چین ہے۔ لوسی نے رُک رُک کر چوٹ کا اقبال کر لیا لیکن اس فیاض لڑکی نے یہ نہیں کہا کہ یہ چوٹ محض اس کی حفاظت میں لگی ہے۔ اب اجنبی نے اس کے ساتھ اسکے گھر تک چلنے پر اصرار کیا۔ لوسی درد کے مارے بے قرار ہو رہی تھی اور اسے چلنا دوبھر ہو گیا تھا مجبورًا راضی ہو گئی۔ دوسرے موڑ پر چند قدم آگے اس کا مکان تھا۔ وہ وہاں پہنچ گئے اور لوسی گھر میں قدم رکھتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اجنبی کو واقعات کی تشریح کرنی پڑی اور اس نے لوسی کے والدین سے فورًا جراح کو بلانے کی درخواست کی اور کہا "جو نہایت ہوشیار اور مشاق ہو اُسے بلائیے۔ فیس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ میں امیر ہوں اور آپ کی لڑکی کی فیاضی کا یہ ادنیٰ سا معاوضہ ہے۔ اس نے خطرہ میں بھی ایک اجنبی کا ساتھ نہ چھوڑا!"

اس نے اپنا بٹوا نکالا لیکن باپ نے لینے سے انکار کیا اور اس موقعہ پر اس کا اندھاپن کام آیا کہ وہ دیکھ نہ سکا کہ یہ حقیر معاوضہ کس سچی ناراضگی سے رد کیا گیا تھا ورنہ شرمندگی اٹھانی پڑتی۔

نوجوان اجنبی جراح کے آنے اور ہاتھ جوڑ کر باندھنے تک ٹھیرا رہا اور اس وقت تک نہ گیا جب تک لوسی کی ماں سے اقرار نہ کرا لیا کہ صبح کو اسے اطلاع کرا دیگی کہ لوسی نے رات کیسے کاٹی۔

اس کا ارادہ تھا کہ دوسرے روز ایسے شہر سے چلا جائے جہاں سیاح کی دلبستگی کا سامان نہیں ہے لیکن دن پر دن گزرنے گئے اور وہ وہیں ٹھیرا رہا یہاں تک کہ لوسی خود اپنی صحت کا یقین دلانے کے واسطے اپنی ماں کے ساتھ آنے لگی۔

یقینًا پہلی ملاقات پر محبت کا ہو جانا بھی واقعات سے ہے، دو اجنبی اشخاص میں ایک عجیب اور بے وجہ رشتہ پیدا ہو جاتا ہے جو کشش باہمی کا سبب ہوتا ہے۔ گویا کہ افلاطون کا یہ مقولہ صحیح ہے کہ ہماری روحیں ستاروں کا جزو ہیں، روحیں باہمی

کشش میں ستاروں سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں اور اپنی پہلی یکجائی کی خواہاں رہتی ہیں۔ تاہم ایسے روزانہ مشاہدہ میں آنے والے معمہ کو اس خیالی اصول سے حل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ قدرتی بات ہے کہ جوجین بربینڈ کی جیسی تنہائی اور بیکسی میں ہر ایک کو اس شخص کی جانب میل ہو جاتا ہے جس نے لوسی کی طرح اس کی خاطر ایسی بےغرضی سے تکلیف برداشت کی ہو۔

اگرچہ وہ تاریکی میں مخفیہ تھا لیکن اس کے دل میں خوبصورتی کے خیالات موجود تھے اس کے پہلو میں ہمدردی کا قدرداں دل تھا اور ہمیشگی کی اور بیکاری کی تنہائی میں اس کا تصور ہمیشہ مشغول رہتا تھا۔

اس نے سچ کہا تھا کہ میرے نزدیک خوبصورتی کا معیار خوش نوائی ہے اور اس نوجوان لڑکی کے سوا کبھی ایسی نرم اور گدگدی پیدا کرنے والی آواز اس کے کان میں نہیں پڑی تھی۔ گھوڑے کی لات سے لوسی کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا لیکن اس پر بھی اس نے اپنی تکلیف کا خیال نہ کیا اور کس سادگی سے یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے آپ بچ گئے۔ لوسی کا یہ فقرہ اس کے کانوں میں گونجتا تھا اور اس نے اپنے تئیں ایسے لطیف و خوشگوار جذبات کے سپرد کر دیا جن کی حقیقت نہ وہ سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ کبھی اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی حادثہ سے جو اس کی خاطر لوسی پر گزرا تھا لوسی کے دل میں بھی اس شخص کی دلچسپی بڑھا دی تھی جس کے متعلق پہلے اس خیال سے ہمدردی پیدا ہوئی تھی کہ عین جوانی میں وہ زندگی کا لطف اٹھانے سے محروم ہے اور برسوں کی رات گزارنا اس کا مقدر ہے۔ عورتوں کی خوبصورت اور مہربان جنس میں حفاظت کرنے کا مادہ قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ اسی مادہ کی وجہ سے وہ بیماروں کے لئے فرشتہ ہوتی ہیں، بوڑھوں کی ضعیفی میں زندگی کے سہارے کا کام دیتی ہیں اور بچوں کی پرورش کے واسطے غمخوار دایہ کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ یہ جذبہ لوسی میں بہت بڑھا ہوا تھا اور اسی جذبہ نے اس کے دردمند دل کو اس بدنصیب مسافر سے وابستہ کر دیا تھا۔ اس کے دل میں قوی جذبات تھے اور وہ اپنے درجہ اور عمر سے زیادہ تربیت یافتہ تھی لیکن اس کی شرمیلی طبیعت حسن کی کمی پر اسے محجوب رکھتی تھی۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ میں بہت محبت کر سکتی ہوں لیکن وہ ناممکن سمجھتی تھی کہ کوئی مجھ سے اسی طرح محبت کر سکے گا۔ یہ اجنبی شخص جو اس کے تمام جان پہچان والوں سے برتر تھا یہی پہلا شخص تھا جس نے اسے ایسی آواز میں مخاطب کیا جو لفظوں سے نہیں بلکہ لہجہ سے عورت کی ایسی تعریف کرتی ہے جو اس کے دل کو پسند آتی ہے۔ اس اجنبی کے خیال میں وہ خوبصورت تھی اور اس کا بھولا دل اس خیال سے کس قدر تسکین پاتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ لوسی جسمانی خوبصورتی سے بالکل معرا تھی بلکہ اس کی نازک رفتار اور اعضا کی موزونیت میں جوانی کی لچک تھی اور اسکی مسکراہٹ ایسی دل لبھانے والی تھی کہ بعض اوقات آنکھوں والے بھی اسے حسین ہی سمجھتے تھے۔ اس کے بچپن میں سب کا خیال تھا کہ وہ جوانی میں خوبصورت نکلے گی لیکن چیچک کے موذی مرض نے اس کی خوبصورتی کو داغدار بنا دیا۔ چیچک سے صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کی نازک جلد داغدار ہو گئی اور رنگ کی شوخی جاتی رہی بلکہ چہرہ کی ہیئت ہی بدل گئی۔ لوسی کا خاندان حسین مشہور تھا اور اس بات پر نازاں بھی تھا۔ چیچک کے نکلنے پر اس کے والدین اس قدر افسردہ ہوئے کہ اسے بچپن ہی میں یقین ہو گیا کہ میں بدصورت ہو گئی ہوں اور وہ خوبصورتی کو نہایت اعلیٰ وصف سمجھنے لگی۔ لوسی کی ایک خالہ زاد بہن جولی تھی جس کی خوبصورتی تمام میکلن میں حیرت انگیز سمجھی جاتی تھی اور چونکہ دونوں خالہ زاد بہنیں زیادہ تر ساتھ رہتی تھیں اس بیّن فرق سے لوسی اپنی بدنصیبی پر ضرور رنجیدہ رہتی ہو گی۔ لیکن ہر قسم کا عیب اپنا بدل رکھتا ہے اور جسمانی نقص کی آگاہی نے اسے بجائے بدمزاج بنانے کے

خوش مزاج بنا دیا تھا، غصہ کی بجائے اس کے مزاج میں نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ اور اس کے دل میں جو قدرتی ضد اور جوش تھا وہ انکسار میں مبدل ہوگیا تھا۔

خوبصورتی کے نہ ہونے سے جس بات کا اسے خوف تھا اس پر وہ غالب آگئی تھی۔ ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔ جہاں کہیں وہ جاتی تھی کشادہ پیشانی سے ملتی تھی اور ہر شخص اس کی آؤ بھگت کرتا تھا اور جس مجلس میں وہ نہ ہوتی تھی اس کی عدم موجودگی ہر ایک کو محسوس ہوتی تھی اور اس کی کمی کو جو کی کا حسن بھی پورا نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن مسز لکھیم اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ یوجین برینڈ اس سے ملنے آیا۔ شروع میں مسز لکھیم یوجین برینڈ کو لوسی کی خیریت سے مطلع کرنے جاتی تھی۔ اس عرصہ میں باہمی تعلقات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ ملاقات بازدید کے طور پر ان کے گھر پر جانے لگا۔ اس کا کتا واپس آگیا تھا اور اسے مکان کے دروازہ تک پہنچا دیا تھا۔ یوجین برینڈ نے کچھ توقف کے بعد مسز لکھیم سے کہا:-

"میرا ارادہ میکلن میں کچھ اور ٹھیرنے کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا میرے موافق ہے اور مجھے یہاں کی تنہائی پسند ہے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ ہوٹل کے اجنبیوں میں میری حالت کچھ فرحت افزا نہیں ہوسکتی۔ میں اس سوچ میں ہوں" یہاں یوجین برینڈ نے ذرا توقف کیا پھر کہا "میں اس سوچ میں ہوں کہ کوئی موزوں گھرانہ میری رہائش کا خیال کر کے مجھے مہمان رکھ لے تو میں یہاں چند ہفتے قیام کرلوں۔ میرے لئے خاص انتظام کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں تکلف سے بری ہوں۔"

"میکلن میں یقیناً بہت سے ایسے گھرانے ہیں جو آپ جیسے مہمان کو بڑی خوشی سے رکھ لیں گے۔" مسز لکھیم نے کہا۔

چھوٹتے ہی یوجین برینڈ نے کہا، کیا آپ مجھے رکھ لیں گی؟ مجھے آپ ہی کے گھرانے کا خیال تھا۔"

"ہمارے گھرانے کا؟ یہ تو آپ کی عزت افزائی ہے۔ ہمارے گھر میں آپ کے لائق ایک کمرہ بھی نہیں ہے۔"

"میرے نزدیک کمروں میں کیا فرق ہوسکتا ہے؟ میرے نزدیک تو وہ کمرہ نہایت پسندیدہ ہے جہاں آدمی کی آواز مہربانی سے مجھ سے مخاطب ہو۔"

غرض یہ کہ مکان کا انتظام ہوگیا اور اب یوجین برینڈ لوسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہنے لگا۔ کیا وہ اس بات سے خوش نہ ہوتی ہوگی کہ یوجین برینڈ کو ہمیشہ ایک ہمراہی کی ضرورت رہا کرتی ہے؟ کیا اسے اس بات سے طمانیت نہ ہوتی ہوگی کہ میں ہمیشہ اس کی خدمت کر سکتی ہوں؟ یوجین برینڈ گانے کا بہت شوقین تھا۔ وہ گانے میں ایسا مشاق تھا کہ اس کی مہارت کی داد اسکی آواز کا لوچ ہی دے سکتا تھا۔ اور کیا لوسی اس وقت مسرور نہ ہوتی ہوگی جب وہ خاموش بیٹھی ہوئی ایسے راگ سنتی ہو جو میکلن میں کبھی سننے میں نہ آئے تھے؟ کیا اسے ایسے چہرہ پر نظر ڈالنے سے مسرت نہ ہوتی ہوگی جس کی اداسی کو اس کی آواز مسکراہٹ سے بدل سکتی تھی؟ کیا وہ خوشی سے اس وقت اچھل نہ پڑتی ہوگی جب گانا بند ہوتے ہوئے وہ "لوسی" کہہ کر پکارتا تھا؟ کیا اسے خود اپنا نام اس رسیلی آواز میں پکارنے سے گانے سے زیادہ خوش آیند نہ معلوم ہوتا ہوگا؟ کیا وہ اس وقت خوش نہ ہوتی ہوگی جب وہ گرمی کے دنوں میں شام کو پھرنے جاتے تھے اور اس کا ہاتھ ایک ایسے شخص کی بغل میں تھرتھراتا تھا جس کے لئے اس کی موجودگی اسقدر ضروری ہوگئی تھی؟ کیا اسے ان تمام خوشیوں پر فخر نہ تھا اور کیا وہ ایسے شخص کی عنایت کے شکریہ میں جس نے اس کے منکسر

دل میں محبوب ہونے کا خوشگوار احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس شخص کو شکریہ سے بڑھ کر پرستش کے لائق نہ سمجھتی ہوگی؟

یوجین برینڈ کے والدین فرانسیسی تھے۔ وہ سوم کے قرب وجوار میں رہتے تھے جہاں انھیں ایک بڑی جائداد ورثہ میں ملی تھی اور یوجین برینڈ اس جائداد کا مالک بن کر ابھی دو برس گذارے تھے۔

ایک مرتبہ تنہائی میں لوسی سے یہ واقعات بیان کرتے ہوئے اُس نے کہا "میں نہیں جانتا کہ زمین کیسی ہے، آسمان کیسا ہے اور دریا کیسے ہیں جن کی صرف آواز میں سُنتا ہوں کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ بچپن کا ایک موہوم سا خیال ہے کہ ہزاروں قسم کے رنگ ہوتے ہیں جن کے دیکھنے سے عجیب خوشی حاصل ہوتی ہے یا یہ کہنا چاہئیے کہ گانا آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ بچپن میں مجھے کوئی رنج نہ تھا لیکن وہ زمانہ ختم ہوتے ہی میں نے دن کی روشنی کا ماتم شروع کیا اور جب سے یہی شغل رہا ہے۔ میرا لڑکپن خوشی میں گزرا۔ ذرا سی بات مجھے خوش کرنے کو اور میرا دماغ مشغول رکھنے کو کافی ہوتی تھی۔ لیکن جب سے مجھے کتابیں سُننے کا شوق ہوا جب میں نے نظم میں واقعات سنے، بہت بڑے کارناموں کے حالات سُنے اور کتابوں سے زندگی کی قوت، اعمال، حرارت، جوش، شان اور سرگرمی کی کیفیت معلوم ہوئی تو مجھے رفتہ رفتہ ان چیزوں کا احساس ہوا جن سے میں ہمیشہ کے واسطے محروم ہو گیا ہوں مجھے محسوس ہوا کہ میں موجود ہوں لیکن زندہ نہیں ہوں، عام آزادی میں ایسے قید خانہ میں مقید ہوں جس کی سپاٹ دیواروں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں تاہم جب تک میرے والدین زندہ رہے مجھے ایک قسم کی تسکین تھی، کم از کم میں تنہا تو نہیں تھا، وہ مر گئے اور میرے قید خانہ میں دفعتاً تنہائی کی بلا مسلّط ہو گئی۔ انسانی ہمدردوں میں سے میرے ساتھ صرف ایک بُڈھا نوکر رہ گیا جس نے مجھے بچپن میں کھلایا تھا اور جو میری بینائی کے زمانہ سے نکٹے جانتا تھا۔ میں اس گھر میں رہنے پر قانع نہ رہ سکا جہاں مجھے اپنے والدین کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک قسم کی بے صبری اور سفر کرنے کی خواہش میرے سر پر سوار ہو گئی اور میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے اس کا مطلق خیال نہیں آیا کہ میں کہاں جاتا ہوں بس صرف یہ خواہش تھی کہ گھر کی ہوا جس کے بوجھ سے گویا میں دبا جاتا تھا بدل جائے۔ میں نے صرف اس بُڈھے نوکر کو اپنے ساتھ لیا۔ وہ بھی تین مہینے ہوئے ضعیفی سے مر گیا۔ افسوس میں بھول گیا کہ وہ بُڈھا تھا کیونکہ میں اس کا ضعف دیکھ نہیں سکتا تھا اور اب اس بے وفا کتے کو چھوڑ کر میں بالکل تنہا تھا کہ یہاں پہنچا اور تمہیں پایا۔"

لوسی نے جھک کر کتّے کو پیار سے تھپکا اور اس کے بھاگ جانے کو نیک فال قرار دیا، جس سے اس کے مالک کو ایسا دوست مل گیا جو اس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

لیکن یوجین برینڈ اسے کیسا ہی چاہتا ہو اور اس کی خدمت گزاری کا کیسا ہی ممنون ہو تاہم لوسی اپنے اثر سے اس کے دل سے حسرت دُور نہ کر سکی اور اس کو اپنی بیکسی پر قانع نہ بنا سکی۔

"کاش کہ تم مجھے نظر آسکتیں! کاش کہ میں تمہارے چہرہ کو دیکھ سکتا" جس کا نقشہ باندھنے کی میں فضول کوشش کرتا ہوں۔"

لوسی نے آہ بھر کر کہا "اگر تم مجھے دیکھ لیتے تو مجھے چاہنا چھوڑ دیتے"

یوجین برینڈ نے جوش میں آکر کہا "یہ ناممکن ہے! دنیا کے نزدیک تم چاہے کیسی ہی ہو میرے لئے تو تم حُسن کا پُتلا ہو۔ اور

میں دوسروں سے مقابلہ کرکے تمہاری خوبصورتی کا اندازہ تھوڑی کروں گا بلکہ تم سے مقابلہ کرکے دوسروں کی بدصورتی کا اندازہ کروں گا"

اسے اس بات کا بہت شوق تھا کہ لوسی کتاب پڑھ کر سنائے اور وہ رزمیہ قصوں اور سیر و سیاحت اور خطرناک مُہمات کے حالات سُننے کا بہت مشتاق تھا لیکن انہی حالات کے سننے سے اسے نہایت رنج بھی ہوتا تھا۔ اسے آہ بھرتے دیکھ کر لوسی اکثر کتاب پڑھتے پڑھتے رُک جاتی تھی۔ اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں اسے بینائی عطا کر سکتی تو اس کی چاہت کی نعمت سے محروم ہونا بھی مجھے منظور تھا۔

لوسی کے گھر والے سب کیتھولک عیسائی تھے اور دیگر کیتھولک عیسائیوں کی طرح زود اعتقاد اور توہّم پرست تھے۔ بعض اوقات وہ شام کو جمع ہو کر قصے کہانیاں اور کرامات کے حالات بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب دو تین ہمسائے بھی جمع تھے کولون کے تین بادشاہوں کے مقبرے کا ذکر آگیا۔ لوسی کے خیالات چاہے کیسے ہی پختہ ہوں لیکن گھر والوں کے اعتقادات سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا کیونکہ بچپن سے انہی کی صحبت میں تربیت پائی تھی اور اس متبرک مقبرہ کی کرامات کے متعلق جتنی کہانیاں بیان ہوئیں ان کو وہ بھی دوسروں کی طرح اعتقاد سے سُنتی رہی۔

سوائے یوجین بریڈ کے جو دن بھر غیر معمولی طور سے خاموش اور اداس رہا تھا اور اپنے کمرہ میں چلا گیا تھا کیونکہ اگرچہ وہ تنہائی کو ناپسند کرتا تھا لیکن بعض اوقات اپنے رنجیدہ خیالات کی دھن میں وہ دوسروں کی صحبت سے بھاگتا تھا۔ سوائے اس کے ہر شخص نے اس مقدس مقبرہ کی کرامات کی حکایتیں نہایت وثوق اور کامل یقین سے بیان کیں مثلاً مقبرہ کی دہلیز پر مریض کا اچھا ہو جانا، دعا کا قبول ہونا یا گناہ کا کفارہ مقبول ہونا وغیرہ۔ ان میں سے ایک حکایت کا لوسی پر خاص اثر ہوا۔ راوی ایک قابل تعظیم معمر شخص تھا جس کے بال بڑھاپے سے سفید ہو گئے تھے اور اس نے حلفیہ بیان کیا کہ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے:۔

"ڈلبرگ میں ایک عورت کے یہاں بدکاری سے ایک بچہ پیدا ہوا جو گونگا اور بہرا تھا۔ بدقسمت ماں نے خیال کیا کہ میرے گناہ کی سزا میرے بچہ کو ملی ہے۔ وہ کہتی تھی "کاش کہ یہ عذاب مجھ پر نازل ہوتا! میں کیسی بدنصیب ہوں کہ میری خطا پر بچہ معتوب ہوا ہے!" یہ خیال اسے ہمیشہ ستاتا تھا اور وہ اس رنج میں گھُلی جاتی تھی مگر کسی طرح تسکین نہ ہوتی تھی۔ جب بچہ بڑا ہوا اور اس کی محبت بڑھ گئی تو اسے اس مصیبت میں مُبتلا دیکھ کر ماں کو سخت اذیت پہنچنے لگی اور آخر کولون کے مقبرہ کی شہرت سُن سُن کر اس مرجع خلائق تک پیدل جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اپنے دل میں کہتی تھی کہ خدا ارحم الراحمین اور قادرِ مطلق ہے۔ وہ کولون گئی اور اس متبرک مقبرہ کی دہلیز پر سر رکھ کے توبہ کی، روئی اور گڑگڑا کر دعا مانگی۔ جب اس نے اپنے شہر میں واپس پہنچ کر اپنی جھونپڑی کو آگ سے جل کر تباہ شدہ دیکھا تو اس کی پریشانی ناقابل اظہار تھی اس کا دل بیٹھ گیا اور غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ تھوڑی دیر میں جب اسے ہوش آیا تو اس کا پہلا سوال یہ تھا کیا میرا بچہ بھی جل کر مر گیا؟ اتنے میں اسنے ایک بچہ کی آواز سنی اور دیکھا تو اس کا اپنا بچہ "اماں" کہتا ہوا اس سے آ لپٹا۔

ہمسایوں نے بچہ کو آگ سے بچا لیا تھا جو سات روز پہلے اس کی جھونپڑی میں لگی تھی۔ لیکن آگ کی دہشت سے

وہ رگ جس سے اس کی زبان بند ہی تھی کھل گئی۔ عذاب دور ہو گیا تھا اور مہربان ہمسایوں نے اسے "اماں" کا لفظ سکھا دیا تھا۔ اب اس عورت کو اپنے گھر کے جلنے کی کیا پرواہ تھی؟ اس نے اس عارضی تکلیف کو خوشی سے قبول کر لیا۔ اس کی دعا مقبول ہو چکی تھی اور ماں کے گناہ کی سزا بچہ پر سے اٹھا لی گئی تھی۔"

لوسی پر اس قصہ کا بہت اثر ہوا۔ یوجین برینڈ کی مصیبت سے ملتی جلتی مصیبت کا ایک دوسرے شخص کی دعا سے دور ہو جانا ایک ایسا امر تھا جس نے اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آئے، اور آس پیدا ہو گئی "کیا مقبرہ ابھی تک قائم نہیں ہے؟ کیا خدا اب آسمان پر موجود نہیں ہے؟ جس نے گنہگار کی دعا سن لی کیا وہ بے گناہ کی دعا نہیں سنے گا؟ کیا وہ محبت کا خدا نہیں ہے؟ کیا وہ جذبات کے اظہار سے خوش نہیں ہوتا؟ کیا ہوا اگر بچہ کی سفارشی اس کی ماں تھی! کیا کوئی ماں اپنے بچہ سے اس سے زیادہ محبت کر سکتی ہے جتنا میں یوجین کو چاہتی ہوں؟ لیکن لوسی اگر تیری دعا قبول ہو جائے اور اس کو بینائی حاصل ہو جائے تو تیرا طلسم ٹوٹ جائے گا اور پھر وہ تجھے نہیں چاہے گا! نہیں محبت ان خیالات سے بالاتر ہے۔ کم از کم میں تو اسے خوش کر دوں گی!"

لوسی کے دل میں ایسے خیالات موجزن تھے۔ یہاں تک کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا اور محبت کا حج کرنے کی قسم کھالی۔ اس نے نہ تو یوجین برینڈ کو اپنے ارادہ سے مطلع کیا اور نہ اپنے والدین کو کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ مشتہر کرنے سے بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک خالہ بارمن میں رہتی تھی اور وہ ہر سال اپنی خالہ کے پاس جاتی تھی اور ایک مہینہ وہاں ٹھیرتی تھی۔ اس موقعہ پر وہ عموماً سال بھر کا بنایا ہوا کام یعنی لیس وغیرہ لے جاتی تھی جو بارمن میں آسانی سے بک جاتا تھا۔

لوسی اور یوجین برینڈ کی منگنی ہو چکی تھی اور ان کی شادی عنقریب ہونے والی تھی۔ معزز والدین کا دستور تھا کہ چاہے کیسے ہی غریب ہوں لیکن بیٹیوں کو جہیز ضرور دیتے تھے۔ لوسی کی روانگی کے لئے یہ ایک بہانہ ہو گیا کہ اپنی اور ماں کی سال بھر کی تیار کی ہوئی لیس بارمن لے جا کر بیچ آئے جس سے کم از کم اتنا روپیہ تو آ جائے کہ شادی کی تیاریاں ہو جائیں۔

مسز لکھیم نے یہ تجویز سن کر کہا "بیٹا تو ہمیشہ سچ کہتی ہے۔ یوجین برینڈ چاہے جتنا امیر ہو یہ کیا ضرور ہے کہ تو اس کے گھر فقیروں کی طرح جائے۔"

ان نیک والدین کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ شہر والوں کے حسد اور ایسی فائدہ مند شادی کی طنزیہ مبارکبادوں سے ان کے دل کو صدمہ پہنچتا تھا۔ اور انہوں نے اب یہ حساب لگانا شروع کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے جہیز میں کیا کیا دیسکیں گے۔ اور سب کچھ گن کر ان کی مشیخت کو اس بات سے کچھ تسکین ہوئی کہ اس جوڑے میں اس قدر نامناسبت نہیں ہو گی جس قدر لوگوں کا خیال ہے۔ وہ راستی پر تھے مگر اندازہ لگانے کے طریقہ میں غلطی کرتے تھے۔ کیونکہ جو دولت لوسی اپنے ساتھ لائی تھی وہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ تھی، قسمت کا پھیرا اسے کم نہیں کر سکتا تھا، موسموں کی سختی اسے صدمہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ فضول خرچی اسے ضایع نہیں کر سکتی تھی اور چور اس کے بھرپور خزانہ میں سے ایک ذرہ نہیں چرا سکتے تھے۔

تمام گھر بھر میں صرف یوجین بریند اس کے جانے کے خلاف تھا۔ وہ جہیز کے نام سے چڑتا تھا۔ اور لوسی کے اس جواب پر بھی اسے تسکین نہ ہوتی تھی کہ یہ صرف والدین کی خوشی پوری کرنے کے واسطے ہے ورنہ انہیں محتاج کر دینا مقصود نہیں ہے۔ اس نے اسی کھسیانہ لہجہ میں جو پہلی مرتبہ لوسی کے دل پر اثر کر گیا تھا جواب دیا: "اور تم مجھے چھوڑنا گوارا کر سکتی ہو! میں دگنا اندھا ہو جاؤں گا۔"

"پیارے یوجین صرف چند روز کے لئے! زیادہ سے زیادہ دو ہفتے!"

"یوجین بریند نے بگڑ کر کہا" "دو ہفتے! تم وقت کا حساب اس طرح نہیں لگاتیں جیسے اندھے لگاتے ہیں۔"

"پیارے یوجین سنو تو سہی!" اور اتنا کہہ کر لوسی رونے لگی۔

لوسی کے رونے کی آواز نے اس کے دل میں ناشکری کا احساس پیدا کر دیا۔ افسوس وہ ناواقف تھا کہ اسے کتنا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے ہاتھ پھیلا دئے اور کہا "مجھے معاف کر دو۔ جو لوگ قدرت کے مناظر دیکھتے ہیں وہ نہیں سمجھ سکتے کہ تنہائی کیسی ہولناک ہوتی ہے۔"

"لیکن میری اماں تمہارے پاس رہینگی۔"

"وہ لوسی نہیں ہیں۔"

لوسی نے ذرا تامل سے کہا" اور جُولی؟"

"میرے لئے جُولی کیا چیز ہے؟"

"آہ! میرے والدین کے بعد تم ہی ایک شخص ہو کہ جُولی کی موجودگی میں میرا خیال رکھتے ہو۔"

"آخر کیوں لوسی؟"

"کیوں! وہ پریوں سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہے۔"

"یہ نہ کہو کاش کہ میں تم کو دیکھ سکتا کہ دنیا کے آگے ثابت کر سکتا کہ تم کیسی خوبصورت ہو۔ اُس کی آواز میں کوئی رس نہیں ہے۔"

روانگی کے ایک روز قبل لوسی رات کو دیر تک یوجین بریند اور اپنی ماں کے پاس بیٹھی رہی۔ مستقبل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اور وہ خانہ داری کے نقشے کھینچتے رہے۔ انہوں نے دنیا کے وسیع بنجر میں محبت کا باغ لگایا اور اسے پھولوں سے بھر دیا۔ اور اپنے جوش میں آندھی کو بھول گئے جو اوراق بکھیر دیتی ہے اور پالے کو جو کمہلا دیتا ہے۔ جب لوسی کا ہاتھ بغل میں لے کر یوجین بریند اپنے کمرے میں گیا اور دروازہ پر وہ جُدا ہوئے اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تو لوسی نے دہلیز پر گھٹنے ٹیک کر اور دل بھر کر اس کی سلامتی کی اور اپنی مُراد بر آنے کی دعا مانگی۔

(باقی باقی)

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنے چاہئیں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(مینجر)

دیوانہ

از محترمہ مس حجاب اسمٰعیل

آمادۂ صحرا ہے طبیعت کئی دن سے　پھر ہاتھ ہیں دلدادۂ وحشت کئی دن سے
تڑپاتی ہے رہ رہ کے یہ وحشت کئی دن سے

وہ بے نیاشہ ویرانوں میں گھومنے نکل جاتا ہے!
ویران گلیوں میں، وہ کتوں کے ساتھ گھنٹوں کھیلا کرتا ہے۔
اسکی باتوں پر لوگ ہنستے ہیں اور وہ لوگوں کی باتوں پر ہنستا ہے۔

مجھے دیوانوں سے ہمیشہ اک دلچسپی رہی ہے۔ دیوانے بجائے خود ایک دلچسپ معمہ ہوتے ہیں۔ ان کی پُراسرار زندگیوں سے مجھے ایک خاص دلبستگی ہے۔

مجھے ایک دیوانہ کا حال معلوم ہے کہ مسرت دن رات اس کے گرد ناچا کرتی تھی۔ رات کے وقت وہ گھنٹوں آسمان کے تاروں کو گھورا کرتا، جیسے وہ انہیں توڑنے کی تجویزیں کر رہا ہو۔ او ر تدبیر سوچ رہا ہو۔ خزاں کی دوپہر میں، جب زرد اور خشک پتیاں جنگل میں ہوا کے ساتھ اڑتیں، تو وہ بھی ان کے ساتھ بھاگتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا، جیسے وہ ان زرد پتیوں سے زندگی کے کسی اہم راز کو دریافت کرنے کا خواہش مند ہے، جو اس سے اب تک پوشیدہ ہے۔

بعض اوقات وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اس کی آواز اس قدر مسرور اور دلکش ہوتی، کہ سننے والے کو دھوکا ہوتا کہ خوابوں کے جزیرے میں پانی برس رہا ہے! او بلند معبود!

کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے اٹھتا، اور چراغ کی طرف دوڑ کر جاتا، اسے پھونکیں مار مار کر بجھا دیتا، اور اپنی اس حرکت پر اس قدر بلند قہقہہ لگاتا کہ فضا گونج اٹھتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کائنات اک گہوارہ ہے جو انبساط کے جھونکوں سے ہل رہا ہے! مقدس آسمان!!

ایک دفعہ اس نے کئی ایک ردی کاغذوں کو مروڑ لیا اور پھر انہیں پتنگ کی طرح آسمان کی طرف اڑا کر اس قدر خوش ہوا کہ گھنٹوں مسکراتا رہا۔ اس کی ان حرکات کو دیکھ کر مجھے اکثر اوقات شبہ ہوتا تھا کہ وہ نیچر کی طرف سے مسرت کا پیام بن کر اس مادی دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ آہ! وہ اس دنیا کے قابل نہیں۔ اس کے خیالات بہت مقدس، بہت اعلیٰ وارفع ہیں۔ اور ہماری دنیا بہت کثیف اور حقیر!

گرم موسم کی ایک تاریک رات میں، میں اپنے دریچے میں بیٹھی آسمان کے تاروں کو تفریحاً گھور رہی تھی۔ اک دیوانہ گاتا ہوا میرے سامنے سے گذر گیا۔ اور جنگل کی مہیب تاریکی میں غائب ہو گیا۔ خوفناک خاموشی میں اک بے تکے قہقہے کی آواز جنگل کی تنہائیوں میں گونج رہی تھی!!

وہ اندھیرے میں لڑھکتا ہوا، شہر کی ویران گلیوں سے ہوتا ہوا جنگل میں چلا گیا......... آہ!

بڑے بڑے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں نے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ اس کا گریبان تار تار ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ اک ایسی ہیبت ناک غیر آباد جگہ پہنچ گیا جہاں راستہ ختم ہوتا تھا۔ جہاں سرو کے گنجان درخت کھڑے تھے، اور جہاں کیکر کے جھنڈ میں مدّت کے پرانے پانی کا اک تالاب تھا۔ سرو کے پتے ہلتے، پرانے پانی کا شور جنگل کی فضا میں بلند ہوتا، تو اک ایسی مہیب آواز پھیل جاتی کہ سننے والوں کو دھوکا ہوتا کہ فرشتۂ موت کسی قریب ہی کے مخفی گوشہ میں بیٹھا موت کا بیوگل بجا رہا ہے۔

—— اللہ غنی! کیسی ہولناک جگہ تھی۔ جب گنجان درختوں کے پتے جنگل کی ہوا سے کانپنے لگتے تو اک آدھا تارا پتوں میں سے ہو کر تالاب کے پانی میں ناچتا نظر آتا۔ اور ایسا ہیبت ناک معلوم ہوتا جیسے اژدہے کا دیدہ چمک رہا ہو۔

وہ وہاں پہنچ گیا —— وہاں پہونچ گیا جہاں مدتوں سے پرانا پانی موت کا رگ گا رہا تھا —— ایسی جگہ جہاں شاید الو بھی بولنا پسند نہ کرے اور جہاں چمگادڑیں بھی بسیرا نہ لیں۔ یہ جگہ گاؤں کے قبرستان کے قریب تھی۔ آہ ع

"لے چلا پھر جانب صحرا مجھے پائے جنوں"

وہ تالاب کے کنارے بیٹھ گیا، اس کے قریب سانپ رینگ رہے تھے، سوکھے پتوں میں جنگلی چھپکلی میٹھی چیخ رہی تھی جھینگر اپنی بین بجا رہے تھے۔

دیوانہ کنارے پر بیٹھا تھا

دفعتاً اس نے جھک کر تالاب کے تھمے ہوئے پانی میں اپنی شکل دیکھی، اس کی داڑھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے مدّتوں سے حجامت نہیں بنائی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ اس نے اک زور کی چیخ ماری۔ اپنے عکس کو پانی میں مخاطب کر کے زور سے چلا اٹھا

"خداوندا! میں کون ہوں؟"

تھوڑی دیر سکوت مطلق .... !!

پھر اک پاگل اور آسیب زدہ قہقہے کی آواز جنگل کی تاریکی میں بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اک دھاکا ہوا!!

سنتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد اک گلی سڑی لاش اس تالاب سے برآمد ہوئی۔!

خدا جانے اس کا کیا ارمان تھا! ......

اور کیا رومانس تھا!

دیوانوں کی زندگی واقعی اک دلچسپ راز ہے۔

آہ، دیوانے خود ایک دلچسپ معمّہ ہوتے ہیں۔ کوئی پہچان نہ سکا کہ انکی ذہنیت کیا ہوتی ہے! ؎

فکرِ معاش عشقِ بتاں یادِ رفتگاں

سو سو مصیبتیں ہیں اور اک جانِ ناتواں

دنیا کے ان بکھیڑوں میں اک آدمی کہاں

اتنی سی عمر میں کوئی کیا کیا کیا کرے!

خدائی دربار

جناب مرزا سلیم بیگ دہلوی

معدے کی تبخیر ہے۔ دل میں اختلاج اور دل کے اختلاج سے خیالات میں انتشار پیدا ہوہی جاتا ہے۔ خدا معلوم کیا اسباب تھے کس وحشت زدہ خیال نے مجھے پراگندہ خاطر کر رکھا تھا کہ نیند میری بھی حرام ہوگئی تھی۔ پلنگ پر دراز تھا کروٹیں لیتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے ذہنی مدوجزر کو روکنا چاہتا تھا۔ مگر کیا ممکن کہ پلک سے پلک لگی ہو۔ گھڑی بھر کو چین آیا ہو۔ یا ہجوم خیالات نے گرانی سر کو آرام دیا ہو۔ دو بج گئے۔ عالم پر سناٹا چھاگیا۔ جھینگروں کی جھنکار اور ہوا کے سناٹے کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ البتہ گھڑی کی ٹک ٹک۔ اپنی طرف متوجہ کر کے تھوڑی دیر کے لئے ان افکار سے نجات دے دیتی تھی۔ اسکے بعد میں سوگیا یا جاگتا رہا یاد نہیں۔ البتہ جو کچھ تھوڑا بہت یاد رہ گیا ہے یا جو سماں آنکھوں سے دیکھا وہ بیان کرتا ہوں۔

دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پیر مرد۔ دراز قد، گورے چٹے۔ بگلا سی ڈاڑھی۔ سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے۔ ہاتھ میں کاندھے برابر جریب لئے خراماں خراماں میری طرف تشریف لاتے۔ میں پاس ادب سے کھڑا ہوگیا۔ پیشوائی کے لئے آگے بڑھا مگر طلسمی نووارد کے اس طرح آنے سے بھی خوف زدہ رہا۔ کسی قدر مصنوعی جرأت سے کام لیکر پوچھا "آپ کون ہیں، کیسے تشریف لائے ہیں؟" نہایت خندہ پیشانی تمکنت اور اطمینان سے دو پرچے کشمیری زرنگار کاغذ کے نکالے اور فرمایا "ایک پرچہ لیلو اور دوسرا پرچہ بعد ثبت دستخط واپس کرو" حیرت واستعجاب سے پرچہ لیا اور آنکھیں مل کر پڑھنے کی کوشش کی لکھا تھا کہ۔

"حکمنامہ دربار فیض آثار عرش بارگاہ حضرت ولایت پناہ ارام اللہ حولہ وقوتہ"

"شہنشاہ دوزخ وبہشت درروح وجسم وسلطان بحر وبر ارض وسما۔ الخ"

اسکے بعد ہی مرزا سلیم بیگ ابن آدم صفی اللہ وپیشہ وعمر وغیرہ کا اندراج تھا۔ خوف سے لرز گیا۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا۔ دل تھر تھرانے لگا۔ دبی آواز سے پوچھا "پیرو مرشد۔ یہ طلب نامہ میرے لئے کیوں؟ مجھے انجمنوں۔ درباروں قومی اور سیاسی نزاعوں سے کیا واسطہ۔ میں کہاں اور خدائی دربار کہاں۔ میں کیا جانتا ہوں۔ مجھ سے کیا دریافت ہوگا۔ کیوں بلایا جارہا ہوں" مسکراکر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور فرمانے لگے کہ "کل دربار ہے۔ ہندوستان کی ہر قوم کے نمایندے طلب ہورہے ہیں۔ سب پر اسی طرح طلب ناموں کی تعمیل ہوتی ہے۔ دنیا نرغے میں ہے۔ قوموں کو ایک دوسرے سے شکایت ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کل سب کچھ معلوم ہوجائیگا" خاموش اور نیم رضامندی کی حالت میں ایک پرچہ پر دستخط کر کے واپس کیا اور دوسرا خود لے لیا۔ وہ بزرگ تشریف لے گئے اور میں عالم حیرت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جوں توں رات گذاری۔ علی الصباح نماز سے فارغ ہو دربار ہال کا رخ کیا۔ میں کیوں کر دربار تک پہونچا۔ ذہن نارسائی کر رہا ہے۔ یاد کام نہیں دیتی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ دربار کی جگہ پہونچ گیا۔

ایک بڑے خطۂ زمین کو جسکے چاروں طرف سمندر تہا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تہیں سمندر میں جگہ جگہ فوجی جہاز کھڑے تھے۔ رنگ برنگ کے جھنڈے لہرا رہے تھے زمین کو ہموار کرکے دربار کیلئے جگہ بنائی گئی تھی۔ جسکے چاروں طرف مورچہ بندی تھی۔ کئی قسم کی فوج دربار کے مقام کو گھیرے ہوئی تھی۔ روشیں، سڑکیں، گھانس کے ہرے بھرے تختے اس خوبصورتی سے بنائے گئے تھے کہ عقل دنگ ہوتی تھی۔ جگہ جگہ آب شاروں سے پانی گر رہا تھا۔ فواروں سے رنگ برنگ کا پانی اُچھل کر حوضوں میں گرتا تھا اور روشوں کے دو طرفہ چھوٹی چھوٹی سفید و سیاہ پتھر کی نہروں سے بہتا۔ سبزہ کو سیراب کرتا تھا۔ ہزار ہا قسم کے پھول درختوں پر لدے ہوئے تھے جو اپنی خوشبو سے مشام جان کو معطر کر رہے تھے۔ اس خیابان زار کے وسط میں ایک جگہ دربار ہال بنایا گیا تھا۔ عین مقابل میں نہایت کشادہ سڑک تھی جو دربار ہال سے شروع ہو کر ایک بڑے اور شاندار مصنوعی دروازے سے گذرتی ہوئی قدیم سڑک سے ملتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بجلی کی نہایت خوبصورت قندیلیں سنگ مرمر کے ستونوں پر آویزاں تھیں۔ ہر ستون گملوں اور پودوں سے گہرا ہوا تھا جنمیں طرح طرح کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف سر بفلک ڈیرے تھے۔ جنکے دروازے شیشے دار چوبی تھے جینی صنعت کی خوبصورت چلمنیں اوپر پڑی تہیں ہر ڈیرے کے سامنے مکین کا نام ایک زمردین تختہ پر لکھکر آویزاں تھا۔ زرقبرق لباس کے سنتری بندوقوں پر سنگین چڑھائے پہرہ دے رہے تھے۔ مصاحب منشی و کارپرداز ونقیب دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ سُرخ، نیلے اور سبز رنگ کے ڈیرے بائیں جانب تھے جن پر اسی رنگ کے جھنڈے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ دائیں جانب سفید رنگ کے ڈیرے تھے۔ جہاں عبا و قبا والے بزرگ خاموش چلتے پھرتے نظر آجاتے تھے۔ داخلہ کے صدر دروازے پر اعلیٰ اور ادنیٰ عُہدہ دار وردیاں پہنے مودب کھڑے تھے۔ دو عہدہ دار سُنہری وردی۔ سرخ ٹوپی جس پر سفید پر لہرا رہے تھے پہنے ہوئے چیپ وراست گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان عہدہ داروں کی ننگی تلواروں کے سایہ میں میں نے اپنا قدم آگے بڑھا لیا تھا کہ پہرہ والے نے مجھے ٹھیرا کر طلب نامہ مانگا۔ بہت مشتبہ نظروں سے دیکھکر کہا کہ آپ سیدھے چلے جائیے۔ بائیں جانب کے سبز ڈیرے آپ ہی لوگوں کے ہیں۔ اون میں سے ایک پر آپ کے نام کی تختی لگی ہوگی۔ شکریہ ادا کرکے آگے بڑھا۔ سب سے پہلے سُرخ ڈیرے تھے اسکے بعد نیلے پھر سبز۔ گھانس کے سرسبز میدان میں سُرخ ڈیروں کے سامنے بڑے بڑے کاشانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ میز کرسیاں قرینے سے رکھی تہیں۔ عورت مرد کرسیوں پر بیٹھے تھے کالے کالے آدمی سفید لباس پہنے نہایت خاموشی اور شایستگی سے انواع واقسام کی غذائیں زرنگار کشتیوں میں لگا کر مہمانوں کے سامنے رکھتے۔ کانٹے، چھری اور چمچوں کی آواز کے ساتھ ساتھ نرم وشیریں آواز عورت و مرد کی بھی آرہی تھی جو آپس میں گفتگو کرتے اور ہنستے جاتے تھے۔ بعض ایسے تھے جو میز پر تنہا بیٹھے تھے۔ بعض ساتھ والی عورتوں کی تواضع میں تھے۔ کسی نے اپنی ٹوپی گود میں یا میز کے نیچے رکھدی تھی اور کوئی اپنی پروں والی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ تلواروں اور تمغوں کی بھرمار تھی۔ جو جھل جھل کر رہی تہیں۔ سفید اور گوری اقوام کا یہ کیمپ اپنی صفائی اور آراستگی میں بے نظیر تھا۔ میں سیر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ سُرخ ڈیروں کے ختم پر تھوڑا میدان خالی چھوڑکر چمن بندی کی گئی تھی۔ اور وہ نیلے رنگ کے ڈیروں کی حد فاصل ہوگئی تھی۔ یہاں سے نیلے رنگ کے ڈیروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وسیع میدان میں بڑے درختوں کے نیچے پتھروں کو

سیندور ملا ہوا تھا۔ گل عباسی اور گیندے کے پھول پڑے تھے۔ شاخوں میں گھنٹے لٹک رہے تھے۔ ننگے بدن برہمن مہمانوں کے سامنے پتیلیں رکھتے اور تھالوں سے پوری کچوری۔ لڈو، جلیبی ڈالتے جاتے تھے ہر شخص الگ الگ بیٹھا کھانے میں مشغول تھا۔ برہمنوں کے ہاتھوں میں لگن تھے جنہیں کھانے کی اشیا تھیں جو حسب ضرورت ہر شخص کو دیجاتی تھیں۔ کوئی اوک سے پانی پیتا کسی کو پیتل کی کلسیوں اور بٹ لوٹیوں سے پانی انڈیل کر یہی برہمن دیتے۔ بعض مقدس آدمی ہاتھوں میں چومک لئے سیندور کے ٹیکے لگاتے۔ کوئی راکھیاں باندھتا اور کوئی شبد پڑھوا کر کلاوے ڈالتا۔ کوئی ڈنڈوت کر رہا تھا۔ اور کوئی کسی کی پگ پوجن کر رہا تھا۔ بچے ہوئے کھانوں جھوٹی پتلوں اور آبخوروں کا ڈھیر سڑک کے کنارے پڑا ہوا تھا جس میں ہر گھڑی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں یہ سب دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو چند ٹیلے نظر پڑے، ان پر چڑھا تو سامنے سبز رنگ کے ڈیروں کا سلسلہ نظر آیا۔

تھوڑی ہی دور بڑھا تھا کہ شامیانے کی مسجد کے قریب پہونچا جہاں سے اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کی آواز سے اداے فریضہ ظہر کی طیاری ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ وضو اور کچھ استنجا کر رہے تھے اور کچھ بیٹھے ہوئے مسواک کے شغل بیکاری میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ تیمم میں مصروف تھے اور چند کلی کر رہے تھے۔ میں نے اس جماعت کے ساتھ اپنے قلب میں ایک محبت محسوس کی۔ اور بے تکلف انہیں چلنے پھرنے لگا۔ ان مہمانوں کی ایک جماعت نے بعد ظہر تسبیح کیلئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے کیمپ اخضر کے منظر پر ایک نظر ڈالی۔ میدان میں دور تک لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ کئی جگہ نماز باجماعت ہو رہی تھی۔ بہت لوگ نماز سے فارغ ہوئے اور اکثر نماز سے فارغ ہی بیٹھے تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ کہیں سیاسی مسائل پر گفتگو تھی اور کسی جگہ مذہبی وعظ و تلقین کا سماں نظر آ رہا تھا۔ ایسے لوگوں کا بھی مجمع تھا جو دوسروں کا مذاق اڑا رہے اور پھبتیاں کس رہے تھے۔ کھانے کا سلسلہ بھی ساتھ ہی ساتھ تھا۔ کچھ لوگ کھا چکے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے۔ ہر شخص بجائے خود لیڈر بنا ہوا اپنے رنگ میں مست تھا۔ آزادی آزادی کی ہر طرف چیخ پکار تھی۔ لیکن اخلاقی اصلاح پر گفتگو ہو رہی تھی کہیں معاشرتی اور معاشی ترقی پر زور دیا جا رہا تھا۔ کھانے کا سلسلہ بھی چونکہ جاری تھا اسلئے شیرمال اور خمیری کی آواز پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی کی صراحیاں گردش میں تھیں۔ نیلی تہ بند۔ زرد جامہ۔ سرخ انگارہ کفنیاں۔ سفید چادریں باندھے لوگ اپنے اپنے حلقوں میں بیٹھے تو بڑے رہے تھے۔ اور ہزار دانہ کی تسبیح گردش میں تھی۔ کوئی طریقہ صلوٰۃ بتا رہا تھا کسی نے جنت و دوزخ سے مریدوں کو مرعوب کر دیا تھا۔ مسائل پر اجتہاد اور اماموں کی فوقیت پر بحث ہو رہی تھی۔

یہی شور و غل۔ یہی مصروفیت تھی۔ کیمپ کا ہر متنفس اسی میں منہمک تھا۔ کہ قریب سے بگل کی آواز سنائی دی، ساتھ ہی توپوں کی آواز نے کیمپ کی زمین کو ہلانا شروع کیا ناقوس اور گھنٹے بجنے لگے۔ جے جے کی صدائیں آنے لگیں، نقارے پر چوب پڑی اور مذہبی نعروں سے سارا کیمپ گونج اٹھا۔ لوگ جوق جوق دربار ہال کی طرف چلے کوئی صف بستہ کوئی مذہبی پیشواؤں کے حلقہ میں رواں تھا۔ ہر قوم ہر فرقہ جُدا جُدا دربار کا رُخ کئے دستار۔ پگڑی سنبھالے جا رہا تھا، دربار ہال کا شامیانہ دل بادل چو رنگ دھاریدار سفید سرخ نیلا اور سبز تھا۔ سفید بانات کا استر۔ کاشانی و ایرانی

قالینوں کا فرش۔ مرصع ستونوں پر مغرق قندیلیں آویزاں اور انہی میں بجلی کے قمقمے نصب تھے۔ وسط میں ذرا بلند چبوترے پر ایک تختِ زمردین رکھا تھا جس کے جواہر کی گُل کاری۔ دیبا و حریر کے پردوں میں سے چکاچوند پیدا کر رہی تھی۔ موتیوں کے جھمکے زمرد کے آویزے لال یاقوت کی جھالریں جھل جھل کرتے تھے۔ گنبد نُما چھت کے کلس سے طرح طرح کی خوشبوئیں نکل کر دربار ہال کو مشک بیز کر رہی تھیں۔ تخت کے گرد خوبصورت کم سن بچے لوازمِ شاہی لئے مؤدب ایستادہ تھے۔ سروں پر نکونا سفید رومال تھا جس کے دونوں کونوں کو پیچھے باندھ دیا تھا۔ ہم رنگ کپڑوں کے اندر سے گورا بدن جھلک رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چوں خط بہ کتاب اندر۔ لباس ہے بھی اور نہیں بھی۔ بھولی بھولی صورتیں مسکراتی معلوم ہوتی تھیں۔ تخت کے نیچے کئی مرد بزرگ کچھ کاغذات ہاتھوں میں لئے سرنگوں صف بستہ کھڑے تھے۔ جو کبھی کبھی کارپردازوں کو اشاروں میں ہدایت دیتے اور خاموش نظریں نیچی کر لیتے۔ غلام گردش میں صف بستہ خدام بارگاہ تھے۔ دائیں جانب خوش وضع۔ خوش رو۔ خوش سیرت۔ خوش لباس اور بائیں جانب بدمست خونخوار۔ قوی ہیکل لوگ تھے جن کی آنکھیں شمع کی طرح چمک رہی تھیں۔ مُونہہ کھولتے تو چنگاریاں اُڑتی معلوم ہوتیں۔ آتشیں گرز کندھوں پر لئے احکام کے منتظر تھے۔ دروازے پر ایک نہایت جمیل صورت بزرگ رموزِ جہاں پناہی سے واقف اپنے عملہ کے ساتھ بخشیاں خدم وحشم کو ہدایت اور آنیوالی مخلوق کو تلقین صبر و استقلال کر رہے تھے۔ اقوام عالم اجازت داخلہ کے منتظر سامنے کھڑی تھیں۔ بے چینی اضطراب چہروں سے عیاں تھا کہ ایک دفعہ ہی دربار ہال اور اوس کے گرد و پیش کی زمین سفید اور ٹھنڈی روشنی سے بُقعہ نور بن گئی۔ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ خُدام بارگاہ وجد میں آگئے اور ہستی غیر محسوس کی عظمت و مرتبت کے وجود مقدس کا احساس ہونے لگا۔ غُل ہوا کہ شہنشاہ بحر و بر سلطان کر و فر۔ مالک جسم و جان نے تخت زمردیں پر اجلال فرمایا۔ جُھکو اور تعظیم بجالاؤ کہ نمک خوار و وفاداروں کو عزت و سعادت حاصل ہو۔

ایک دفعہ اور توپوں نے سلامی دی۔ گھنٹوں اور ناقوسوں نے آواز نکالی۔ نقارے کی چوب نے گاؤ زمین کو بیدار کیا۔ اور اللہ اکبر کے نعروں سے زمین دربار دہل گئی۔ سمندر میں طغیانی اور زمین میں زلزلہ پیدا ہو گیا۔ دربانوں اور حاجبوں نے دعائے برکت کے ساتھ خاموشی کا نعرہ لگایا۔ مرد جمیل بزرگ نے قوموں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے نافرمانو۔ سرکشو۔ عنایتوں اور مہربانیوں کو بھول جانے والو۔ مؤدب ہو جاؤ۔ سر نیاز اطاعت و فرمانبرداری کے لئے جُھکا دو۔ دادخواہوں کی داد۔ فریادرسوں کی فریاد۔ سرکشوں کی سرکوبی کا دن ہے۔ سفید اور رنگوری اقوام پہلے حضوری کا شرف حاصل کریں۔ اور آداب حضوری بجالائیں"۔ میں نے دیکھا کہ سفید اقوام ابھی مرتب و منظم ہی ہو رہی تھیں کہ مسلمانوں میں سرگوشی ہونے لگی۔ سرگوشی سے ہلچل ہوئی اور یہ لوگ سفید اقوام سے پہلے آگے بڑھے۔ خدام نے روکا مگر انہوں نے دروازے کی طرف رُخ کر دیا۔ دعوےٰ تھا کہ اقوام عالم میں ہمیں تقدیم ہونی چاہئے۔ پہلے ہمیں داخلہ کی اجازت ہو۔ اس عزت سے پہلے ہمیں شرف بخشا جائے۔ زعم نیازمندی غرورِ اطاعت میں دھکا پیلی کرتے بڑھ گئے۔ انتظام کو درہم برہم کر دیا۔ ہر شخص بجائے خود اپنے کو دوسروں سے زیادہ مستحق داخلہ سمجھتا تھا۔ ابتری اور بدنظمی ہونے لگی، آخر ایک صدائے بلند نے انکو روکا اور یہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹے مگر طنابوں اور قناتوں سے لگ کر الحاح وزاری کرنے

لگے۔ سفید اقوام کا صف بستہ پرانی ٹوپیاں اتار دایاں ہاتھ پیٹ پر رکھ نہایت آہستگی وخاموشی سے دربار ہال میں داخل ہوا۔ چند قدم چلکر گھٹنے ٹیک کر سربسجود ہوا اور پھر سیدھا ہوگیا۔ ایک شخص صف میں سے آگے بڑھا۔ دوبارہ تعظیم بجالایا اور ایک مرصع صندوقچہ سے سفید کاغذ پر چھپی ہوئی تحریر نکالکر پڑھنے لگا۔

(التثلیث)

"اے قدوس۔ اے مسیح ناصری کے وجود میں لانے والے۔ اے مادر مریم پر اپنی رحمت نازل کرنے والے۔ ہم پر اپنے بیٹے کے طفیل رحم کی نظر کر۔ ہم عاجز ہیں اور تیرے بیٹے کے احکام پر کاربند۔ ہم دنیا میں تیری ترقی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم تیری ویران زمینوں کو آباد کر رہے ہیں۔ کمزور قوموں کی حفاظت ظالموں کی سرکوبی کرتے ہیں۔ تجارت سکھاتے۔ مذہبی رواداری رکھتے ہیں اور اے آسمانی باپ تو جاننے والا ہے۔ اس بات کا کہ ہم امن کے حامی۔ ظلم وزیادتی کے دشمن ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے جب تک اسکو قانون کی صورت نہیں دیتے۔ ہم نے دنیا کو تمدن سے آشنا کیا۔ علم سے بہرہ ور کیا۔ ترقی کی روح پھونکی۔ قوموں کو بیدار کیا۔ مذہبی آزادی دی۔ جو کچھ کیا وہ بنی نوع انسان کے لئے کیا۔ دنیا ہمیں دشمن خیال کرتی ہے۔ ہمارے ہر کام کو بُری نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ ہماری دشمن ہے اور ان عنایتوں سے رُوگرداں ہے۔ اے کمزور و قوی کے مالک۔ اے عاجزوں اور ظالموں میں انصاف کرنے والے۔ ہمیں انصاف کر ہم کو توفیق دے کہ دشمنوں کے حملوں سے نجات پائیں۔ حاسدوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ ہماری قوم کو دُنیا کے ہر ٹکڑے پر آباد کر۔ سمندروں پر ہمکو قبضہ دے" سفید قوم اس اڈریس کے جواب کے بعد اُلٹے پاؤں واپس ہوئی۔ اور صف بستہ مؤدب دربار ہال سے چلی گئی۔ مسلمانوں نے پھر دیوانِ عام پر یورش کی۔ پھر اللہ اکبر کی صداؤں نے عالم خاموشی کو توڑا اور اسی طرح روک دیئے گئے۔ آگے جانے کی اجازت نہیں ملی تو ناکامی اور افسردگی سے عاجز آکر زور زور سے درود تسبیح کا ورد کرنے لگے اسلئے کہ ہندوؤں کو شرف باریابی بخشا گیا تھا۔ قوم ہنود کے گروہ آگے بڑھے۔ ان کے لئے مسلمانوں کو مجبوراً جگہ چھوڑنی پڑی جو ہندو قریب سے گذرتا یہ اسے ٹھوکا دیتے۔ آوازہ کستے۔ اور راستہ روکنے کی کوشش کرتے، خُدام بارگاہ روکتے اور انکو راستہ سے ہٹا دیتے۔ مسلمان خوش و ناخوش پیچھے ہٹے اور حرمان نصیبی پر آنسو بہانے لگے۔ ہنود باریاب ہوئے اور باری باری سے ہاتھ جوڑ کر سجدے میں گرے گھنٹوں اور ناقوسوں کی صدا بلند ہوئی۔ شبد و اشلوک کا غوغا ہوا۔ اور اس ہنگام میں ایک دراز قد سوکھے بدن سر سے پیر تک ایک کپڑے سے ملبوس شخص نے آگے بڑھ کر "ان داتا" کا نعرہ مارا۔ سجدے میں گرا اور اٹھکر اس طرح عرض کی۔

(اوم)

"ان داتا۔ دیوتاؤں کے دیوتا۔ چاند اور سورج کو روشنی دینے والے۔ پانی وہوا کا نم بنانے والے۔ بھارت ماتا

کی آگیا کرنے والے۔ مُردوں کو مُکتی دینے والے۔ ہندوجاتی پر کرپا رکھنے والے بھگوان ہندوستان کی کٹھنائیں دھرتی ہمارے لئے تنگ ہے۔ اور آکاس کی بلائیں ہم پر اتر رہی ہیں۔ لچھمی مُنہ موڑ رہی ہے۔ ہم تیرے چرنوں میں اپنی بپتا لائے ہیں۔ تو جانتا ہے کہ ہم دُکھی کرنے والے نہیں۔ تجھ کو تو معلوم ہے کہ ہم جیو رکھشا کرتے ہیں ہم شانتی چاہتے ہیں اور شانتی میں رہنا چاہتے ہیں۔ تیری دی ہوئی دھن دولت کی رکھشا کرتے ہیں۔ بیوگی اور جوگی کی سیوا کرتے ہیں کام پڑے وقت مانسوں کی مدد کرتے ہیں راج کی لاج دھرم کا پاس کرتے ہیں مگر اے بھگوان ہمیں سکھ نصیب نہیں ہمیں رات کو نیند دن کو چین نہیں ملیچھ ہمیں بھرشٹ کرتے ہیں تیری دھرتی پر جیو ہتیا کرتے ہیں۔ آپ سکھی ہیں نہ ہمیں سکھ دیتے ہیں۔ ہمارے پرچار سے بیر رکھتے ہیں۔ ہم سے ہماری لچھمی کو چھینتے ہیں تو نیائے کر اور بھارت ماتا کو ایسے ملکشوں سے شدھ کر دے۔"

ہنود اس اڈریس کے بعد دربار ہال سے ڈنڈوت کرکے واپس ہوئے۔ کہ مسلمانوں نے دربار ہال پر پھر زغہ کر دیا۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے آگے بڑھے۔ ناظرین سے استدعا ہے کہ براہ کرم مسلمانوں کے اڈریس کے لئے حضرت علامہ سر اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ ملاحظہ فرمائیں۔ مرزا سلیم بیگ

وفا کا پھل

از جناب مظہر انصاری صاحب بی۔ اے (آنرز)

(۱)

خیال نہیں، تصور نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے کہ شباب کے ایام میں انسان کا سینہ ولولوں سے معمور، اُس کا دل امیدوں سے بھرپور اور آنکھیں نشۂ خودی سے چور ہوتی ہے........ مگر بڑھاپا آیا اور یہ سب کچھ خواب ــــ نہ وہ ہمتیں رہیں نہ وہ ولولے نہ ارادوں میں جوش، نہ عمل میں زور، جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے، جو کسی نے کہدیا سن لیا، کہاں وہ ہماہمی کہ ایک دنیا کو ہلا مارا، کہاں یہ خاکساری کہ ہلائے نہیں ہلتے۔

یہ ہیں عمر کے اُس حصے کی باتیں جس میں لوگ کہہ اٹھتے ہیں ــــ ہم تو اُس شمع کی مانند ہیں جس کی قریب ہی آگئی ہو صبح ہوئی اور بجھے۔ مگر کامران اپنے کافور پیری میں جوانی کی آگ اب بھی چھپی رکھتا تھا، بوڑھا تھا تو ہوا کرے جوانوں کی سی ہمت اس میں اب بھی تھی، چہرے پہ جھریاں، ہاتھوں میں رعشہ، کھال مردہ، خون نام کو نہیں، مگر اس پہ بھی عزم، ارادے، استقلال کا یہ حال کہ صبح ہوئی اور وہ پانچ میل کی چہل قدمی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

(۲)

رات بھر ہوا تیز رہی، صبح ہوئی گو سردی تھی کمی نام کو بھی نہ ہوئی۔ کامران ست رہ گیا، اس نے سوچا کچھ نہیں تو چلو ایک آدھ میل ہی پھر آئیں، ٹانگیں کھل جائیں گی......

کہرے نے فضا کو اپنے نیلاہٹ لئے ہوئے آنچل میں ڈھانپ لیا، درخت، کھیت، مکانات سب اپنے کو کھو بیٹھے۔ وہ تنگ سا راستہ بھی جو ہر صبح اونچی اونچی چمنیوں والی عمارت کے پاس گذرتا تھا دھند میں گم ہو گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ مگر بڈھا کامران کچے پکے مکانوں کے دھندلے نقوش کی سیدھ باندھے چلتا رہا۔

جھیل کے اس پار سے ۳ بجکر ۲۰ منٹ والی گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ ۳ بجکر ۲۰ کا وقت اب بستی کی روایات میں ایک مخصوص حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ کامران کو وہ وقت یاد آیا جب گھنے جنگلوں میں شکار کھیلنے کے لئے آسانیاں موجود تھیں، سیدھے سادے لوگ تھے اور اچھے وقت۔ صبح اٹھے کچھ کھایا پیا اور شکار کو نکل گئے، اور جس طرف کو بھی، جدھر کو بھی نکل گئے۔ کیا زمانے تھے جب رگوں میں خون تھا اور چہرے پر رونق.........

کامران اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا، اتنا بوڑھا کہ اب اس کی عمر کے لوگ دیہات میں دُور دُور تک ڈھونڈنے نہیں ملتے تھے۔ یہ اُس کے دل کی قوت تھی جو اسے اپنے ہم عمروں سے کئی منزل آگے تک کھینچ لائی تھی۔ ہاں اور کیا۔ زندگی ایک سفر ہی تو ہے۔ کوئی گر پڑا رہ گیا۔ کچھ تھک گئے، بیٹھ رہے، کچھ اِدھر اُدھر کی دلچسپیوں میں بھٹک گئے، بچھڑ گئے، زندگی کا کارواں آگے نکل گیا۔ بچے کھچے جو رہے انہیں اور طرح کے مصائب، اور قسم کی مصیبتوں نے دھر لیا۔ لے دے کے چند گنے چنے خوش نصیب ایسے نکلے جو منزل کو جا لینے میں کامیاب ہوئے.......

کامران ایسے ہی خوش نصیبوں میں سے تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر بہت دُور نکل آیا تھا، اتنی دور کہ نئی نسل میں اور اس میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ نئے نئے زمینداروں نے اس کے کھیت اور زمینیں خرید لی تھیں اور دام بھی اچھے دے ئے تھے، زندگی کے آخری دن وہ اسی سرمایہ پر گذار رہا تھا۔ بستی کی نئی نسل اُسے ایک بڈھا آدمی سمجھتی تھی۔ ایک بیوقوف بڈھا آدمی اور بس۔

کامران کے نئے دنیا میں دلچسپی کی اگر کوئی چیز تھی تو ٹوبی، اس کا وفادار کُتا، جو اپنی لمبی لمبی پشم، اپنے خوبصورت سر اپنی چھوٹی سی دل پسند دم اور اپنی وفادارانہ عادتوں غرض جملہ خصوصیتوں کے ساتھ کامران کا سب سے پرانا رفیق تھا، وہ بھی بوڑھے آقا کے ساتھ ہی بوڑھا ہو رہا تھا......

کامران کو اپنے وفادار کتے کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ٹوبی گھر پر اس کا انتظار کر رہا ہوگا، اور جب وہ گھر پہنچے گا تو وہ، وہ پرانا رفیق اپنی چمکدار آنکھوں سے دیکھتا ہوا، دُم ہلاتا ہوا اٹھیگا اور اس کے پاؤں چاٹنے لگیگا۔ جب ٹوبی جوان تھا ـــ اور جب کامران بھی جوان تھا ـــ اس وقت اس کا استقبال زیادہ شرارت بھرا ہوا کرتا تھا، وہ بھونکتا تھا، آقا کا دامن منہ میں پکڑ کر گھسیٹتا تھا۔ اُچھلتا تھا کودتا تھا، اس کے ہاتھ کو چاٹنے کی کوشش کرتا تھا، اور اگر وہ کرسی پر بیٹھ جاتا تھا تو لپک کر گود میں آپڑتا تھا.........

مگر اب، اب ٹوبی یہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ میرا آقا بوڑھا ہو گیا ہے اور وہ اب ان باتوں کو پسند نہیں کریگا۔ وہ یہ باتیں نہیں کرتا تھا، یہ اسکی ذہانت کی نشانی تھی۔

چلتے چلتے اسٹیشن آگیا۔ ایک معمولی سے گاؤں کا اسٹیشن ہی کیا، کلرک کے بیٹھنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ، اس کے آگے برآمدے میں آٹھ دس سگنل۔ یہ کل کائنات تھی بستی پور کے سٹیشن کی۔

کامران نے رفتار تیز کر دی۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مظفر سے مٹھ بھیڑ نہ ہو جائے۔ مظفر کامران کا داماد تھا اور دنیا میں تنہا آدمی جس سے کامران نفرت کرتا تھا۔

کامران کے ذہن میں اس واقعے کی یاد تازہ ہو گئی جب اس نے مظفر کو لوہے کی سلاخ لئے اپنے کتوں کو مارتے دیکھا تھا۔ مظفر ایسی بے رحمی سے مار رہا تھا کہ کتے زمین پر لیٹے جاتے تھے، کامران گو اُس وقت بھی بوڑھا تھا مگر اس نے مظفر کو ایسے زور کا دھکا دیا کہ گڑھے میں گرنے میں بس کسر ہی رہ گئی۔ مظفر کو کامران کی یہ مار کبھی نہیں بھولی اور اس واقعہ کے بعد جب کبھی بھی دونوں کا آمنا سامنا ہوتا وہ بڈھے کسان کو ٹیڑھی ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھتا۔ کامران کو اچھی طرح یقین تھا کہ اس موذی چھوکرے نے محض اس مار کا بدلہ لینے کی خاطر میری اکلوتی لڑکی کو پرچایا اور پھر ایک دوسرے گاؤں لے جا کر اس سے شادی کر لی۔ اب کچھ دن سے مظفر تُند خو اور مغرور ہو گیا تھا۔ گو کامران کو اس کی بھی پرواہ وہ دل میں کہا کرتا تھا "یہ لونڈا جب چاہے مجھ سے زور آزمالے"...... مگر اس کو اپنے بڑھاپے کا خیال آ چپ ہو جاتا........

اسٹیشن کی کوٹھری میں سے مظفر نے آواز دی۔

"ذرا ٹھہرنا اے بوڑھے" اس نے چلا کر کہا" ایسی جلدی کیا ہے کسی کا کچھ لے کر بھاگ رہے ہو"

کامران نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مظفر کے "بوڑھا" کہنے پر اسے بڑا طیش آیا۔ مگر کر کیا سکتا تھا......

"ہاں آؤ ذرا یہاں" مظفر نے تحکمانہ لہجے سے کہا۔

کامران نے قریب پہنچکر مری ہوئی آواز سے کہا" کیا کام ہے؟"

"بڑے میاں، مجھے تم سے یہ کہنا تھا" مظفر نے جبڑے کو بڑے بھیانک انداز سے کھولتے ہوئے کہا "کہ کل مجھے شکار کو جانا ہے ذرا اپنا کتا ایک دن کو دیدو۔ میرا اپنا تو پرسوں مرگیا ——"

مظفر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کامران نے بات کاٹ کر کہا۔

"مرگیا، وہ تو بڑا اچھا کتا تھا، مر کیسے گیا؟"

"پرسوں رات کو بھونکے جاتا تھا۔ میں نے چپ ہونے کو کہا تب بھی چپ نہیں ہوا۔ میں نے گرز اٹھا کر مارا، وہ اس کے سر میں لگا، قضا آ پہنچی تھی اسی وقت چل بسا بچارہ...... ہاہا...... ہاہا...... ہاہا...... اب میں تمہارا کتا لیجاؤنگا"

"نہیں" بوڑھے آدمی نے جماکر کہا" میرا کتا شکار میں جانے کے قابل نہیں ہے"

"کیوں قابل کیوں نہیں ہے" مظفر بولا" میں سب کام لے لوں گا۔ مار کے آگے تو بھوت بھی بھاگتا ہے"

کامران کے جیبوں میں پڑے ہوئے ہاتھ مٹھی بند ہوگئے۔ مگر وہ گھونسے بہرحال ایک بوڑھے آدمی کے گھونسے تھے۔ اس نے گردن پھیر کر ادھر ادھر دیکھا۔ گویا گئی ہوئی جوانی کو دیکھتا ہے کہ کہیں کسی طرف سے آ تو نہیں رہی...... مگر پھر اسے احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہوں......

"میں بوڑھا ہوگیا" کہکر کامران مایوسی کے بھنور میں ڈوب گیا۔

"نہیں" اس نے مظفر سے مخاطب ہو کر کہا" تم اسے نہیں لے جا سکتے"............ اس کے درشت لہجے پر مظفر نے تیوری چڑھائی...... بوڑھے نے پھر لجاحت سے کہا" بھیا تم اسے لے جاکر کیا کروگے، وہ تو بہت ہی بوڑھا ہے" مظفر کے سامنے گڑگڑانا کامران کے نزدیک دنیا کا سب سے ذلیل کام تھا مگر اپنے لئے نہیں...... بوبی کیلئے وہ اس چھوکرے کی خوشامد کر رہا تھا۔

"تم اسے لے جاکر کیا کروگے" اس نے فقرے کو دہرایا۔

"تم کچھ فکر نہ کرو" مظفر نے لاپرواہی سے جواب دیا" میں اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں گا"

کندھے پھڑکاتا وہ تیز تیز قدم لے کر اپنی کوٹھری میں جا گھسا اور کامران کو غم اور غصے کی موجوں میں ہاتھ پیر مارتا چھوڑ گیا۔

(۳)

کٹیا میں پہنچتے ہی کامران سر کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔

بوبی دم ہلاتا ہوا آیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ آقا التفات نہیں کرتا تو پانوؤں کے پاس بیٹھکر اس کی حالت دیکھنے لگا۔ زبان نہیں تھی ورنہ ضرور کہتا" بوڑھے بابا بتاؤ تو سہی کیا بات ہے، کیا فکر لاحق ہے، میں بھی تمہاری کچھ مدد کرسکتا ہوں۔"

کامران کے دماغ میں بہت سی تجویزیں آئیں، مگر وہ سب نوجوانوں کے کرنے کی تھیں، بوڑھا آدمی بھلا کیا لڑائی بھڑائی کر سکتا تھا۔ اور پھر مظفر کے بستی میں بہت سے دوست تھے، کامران کا کون دوست تھا، وہ تو اکیلا ہی تھا۔ اس کی حمایت لے نے کو کون نکل کر آتا۔

"مگر" اس نے ران پر گھونسا مار کر کہا "یہ مظفر یہ کل کا لونڈا میرے پالتو کتے کو لیجائے اور جنگل میں لیجا کر بیدوں اور ٹھوکروں سے مارے، نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

"میرے بوڑھے کتے سے اب سختی برداشت نہیں ہو سکتی، جب یہ جوان تھا تو اس نے بڑے بڑے شکار مارے مگر اب" "اب یہ نوجوان کتوں کے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں سکتا۔ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ دل پاش پاش ہو جائیگا۔

"اور پھر مظفر کے پاس کوڑا بھی تو ہے کیسا سخت، اور وہ مارتا بھی ہے کیسا بے رحمی کے ساتھ، کہہ نہیں رہا تھا کہ میں نے لوہے کا گرز کھینچ مارا۔ اپنے کتے کو تو یوں مار ڈالا۔ اب میرے کتے کو مارنے چلا ہے۔ پاپی کہیں کا۔ نہیں میں اپنے پرانے وفادار کتے کو اس موذی کے ہاتھوں کیوں مروانے لگا۔ نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا . . . .

"وہ تو اسے ایک ہی منٹ میں مار ڈالے گا، واہ خوب اچھا شکار کھلوایا . . . .

"ایک دفعہ تو یوں بدلہ نکالا کہ میری بیٹی . . . ."

"اور اب دوسری دفعہ بدلا نکالنے چلا ہے کہ میرے کتے کی جان لیگا۔ دیکھو یہ دنیا بڈھوں کو کس طرح بے بس سمجھتی ہے"

بندوق پر اس کی نظر پڑی مگر بندوق میں کارتوس ہی کہاں تھے، وہ بہت ہی روز مدت کے پڑے کارتوس بھی مظفر لے جا چکا تھا۔ کامران نے کہا بھی ارے بھئے انہیں رہنے دے۔ اس نے جواب دیا تم کیا اب شکار کھیلنے جاؤگے خواہ مخواہ کی باتیں نہیں . . . . . ."

"ہاں، اب کیا شکار کھیلنے جاؤگے! مطلب اس کا یہ تھا کہ تم بوڑھے ہو، بوڑھے، تمہاری آرزوئیں مرچکیں، تم میں اب جان ہی کہاں . . . .

"بوبی" کامران نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کتا اپنی جگہ سے اٹھ کر مالک کے پاؤں سے آ لگا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بوبی" کامران نے پھر کہا اور اپنے جھریاں پڑے ہوئے ہاتھ اس کی پیٹھ پر پھیرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہلے، زیر لب اس نے کچھ بات کہی ایسی بات جو ایک دکھے ہوئے دل والا بوڑھا آدمی اپنے کتے کے سامنے بھی آواز سے نہیں کہہ سکتا۔

کتا پیار سے اپنی گردن کامران کی ٹانگ سے ملنے لگا۔

کئی منٹ گذر گئے۔ کامران کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا، اس نے آنکھیں بند کرلیں اور خیالات میں غرق ہوگیا . . . .

"مگر بوبی یہ کب تک" کہتا ہوا وہ اٹھا اور تیز تیز نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ "اب وہ آتا ہوگا، وہ بے رحم، ظالم، تجھے لینے آتا ہوگا۔ مگر . . . . مگر . . . . نہیں . . . . نہیں . . . . .

ڈگیں بھرتا ہوا وہ طاق کی طرف چلا ....

طاق میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں، ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس نے ایک شیشی نکالی، اس شیشی کا لیبل کہنگی کی وجہ سے پھٹ پھٹا چکا تھا۔ اس کے اندر ایک سفید سفوف تھا ....

لڑکھڑاتا ہوا کامران لوٹا ... بالکل اندھوں کی طرح، بالکل ابتری کی حالت میں، مچان پر سے اس نے دلیے کی رکابی اتاری اور وہ سفوف اس میں ملانے لگا۔

دور سے پیروں کی آواز سنائی دی ـــــ مظفر، ہاں مظفر آ رہا ہے۔

کامران کی انگلیاں اور بھی تیزی سے چلنے لگیں، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، دو آنسو اس کی آنکھوں سے گرے اور ریتیلے فرش میں جذب ہو گئے۔

مظفر بہت جلدی جلدی آ رہا تھا، اس کے پاؤں کی آہٹ قریب ہوتی جاتی تھی۔

پھرتی کے ساتھ کامران نے دلیے کی رکابی اٹھائی اور کتے کے آگے رکھدی اور خود بھی تھوڑا سا سفوف پھانک لیا کتا دلیا کھا رہا تھا کہ کیبن کے کواڑ کھلے۔

مظفر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "اچھا تم نے اسے اچھی طرح کھلا پلا بھی دیا"

"ہاں میں نے اسے کھلا پلا دیا ہے" کامران نے کہا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیشی دکھا کر بولا "میں نے اسکی ایک خوراک کھلا دی ہے"

"ہائیں" مظفر نے متحیر ہو کر کہا اور ... دیکھا۔

"جاؤ، بس اب تم یہاں سے جاؤ" کامران نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "اب یہاں کوئی کتا نہیں ہے، جو تمہیں شکار کے لئے مل سکے"

کامران بوڑھا آدمی تھا اس کی سوکھی ہوئی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں لیکن اس کی آنکھوں سے آگ کی سی چنگاریاں اڑتی معلوم ہوتی تھیں، مظفر نظر ملانے کی تاب نہ لا سکا، بڑبڑاتا ہوا مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

کامران نے کتے کی طرف رُخ کیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بوبی" اس نے کہا "وہ تمہیں لے جا نہیں سکتا، بوبی! زندگی کا راستہ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ طے کیا ہے، اب منزل پر بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ تم آرام کرو میں بھی عنقریب پہنچنے والا ہوں، تم نے ہم سے ساری عمر وفا کی، اس کا پھل یہ ہے کہ ہم تم اب ہمیشہ کو ساتھ ہیں"

اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے کو بڑھایا، کتا آگے بڑھا، مگر اس سے پہلے کہ آقا کا ہاتھ چاٹ سکے زمین پر آ رہا۔

"آہ" کامران نے روتے ہوئے کہا "بوبی میں جانتا ہوں تم میرا مطلب سمجھتے ہو، تم میرا مطلب سمجھتے ہو"

فریبِ وفا

از حضرت ساحل بلگرامی

شاید تم مطمئن ہوگی کہ تمہاری اداہائے دلنشیں کی خلشِ پیہم اب میرے سادہ دل سے دور ہوگئی اور میں تمہارے جمالِ ہوشربا کے خیالِ مستقل کو اپنے خود فراموش دل سے محو کر چکا۔ لیکن غالباً تمہاری طبیعتِ بے پرواہ نے کبھی اس طرف توجہ بھی نہ کی ہوگی کہ میرے دلِ ازخود رفتہ کو اتنا ہوش کہاں کہ تمہارے حسنِ دلفریب سے تغافل کے ارتکاب کا خیال بھی کرسکے۔ ہاں وہ تو اکثر جب اپنے خیالِ رنگیں سے چونکا تو دامانِ خیالِ یار کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے ہوئے "تصورِ جاناں" کی شرابِ محویت کے نشہ میں چور۔ اگرچہ میں نے انتہائی کوشش کی اور اپنے دل کو مجبوری کے سخت شکنجہ میں کس کر چاہا کہ تمہارے حسنِ تباہ کن کی یاد "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" بنا دوں لیکن دلِ بیتاب "تمہارے لئے ہمیشہ آتش زیر پا" رہا۔ تم یقین کرو کہ اب بھی میری انتہائی کوششوں کے باوجود میری پریشان و غیر مطمئن زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہاری یادِ روح نواز سے معمور و رنگین ہے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اکثر دلنشیں "حدیثِ نیکواں" کے سلسلہ میں "حرف آں مہِ نامہرباں" سے گوش آشنا ہوتے لیکن دلِ جنوں پسند ہمیشہ تمہارے جمالِ نظارہ سوز کی ایک جھلک کا آرزومند رہا۔ میں چاہتا تھا کہ لطائف الحیل سے دل کو تسکین دیکر اپنی ناکام و حرماں نصیب زندگی میں ایک ہی سانس اطمینان سے لیلوں۔ لیکن وہ "خار شراب" ہمیشہ سینہ میں پھڑکتا رہا جس طرح بلبلِ نوگرفتار دامِ صیاد میں تڑپتا رہا ہوں جیسے اب "ریگِ صحرا" پر۔

جب میں نے نالۂ حشر ساماں بھی کیا اور آہِ شرر بار بھی۔ بادیہ پیمائی بھی کی اور کوچہ گردی بھی لیکن تمہارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ تمہارا دلِ سنگ آسا کبھی پسیجا تک نہیں۔ سچ ہے تم کو "آشفتہ مزاجوں" کی "پریشانیٔ خاطر" سے کیا غرض ؏

تم ہوا ب اور بصد رنگِ گلستاں ہونا

تم کے ساتھ مصروفِ گلدستہ آرائی رہو اور "روئے دلآرام" کی آرائش و زیبائش میں منہمک مشاطگی تمہاری بلا سے۔ تم کیا جانو ایک محرومِ تمنا پشیمانِ آرزو اپنی افسردہ و غمگین زندگی کی کن تاریک و وحشتناک راہوں سے گزر رہا ہے۔ اس کی حیات کا سازِ خموش اپنے سینہ میں رنج و الم کی کون کون سی مردہ راگنیاں پوشیدہ کئے ہوئے ہے ؎

کاش تم ہوتے کہ احوال سناتا تم کو لالہ زارِ دلِ پُر داغ دکھاتا تم کو

درد و الفت کی داستان "دامنِ محشر" سے ملی ہوئی ہے جس کو گو تمہارے سمعِ نازک تک ہنوز رسائی نصیب نہیں ہوئی لیکن میرے کاشانۂ مایوس و حسرت ور آغوش در و دیوار اس سے بخوبی واقف ہیں جو مدتوں سے میری عبرتناک و سبق آموز حالت کو دیکھ کر خاموش حالت طاری کرے ہوئے میرا منہ تک رہے ہیں۔ لیکن آہ! میری آرزوئے ناکام صرف اس لئے بیچین ہے کہ تمہارا دستِ سیمیں میرے سینہ پر رکھتے ہوئے دل پر ہو اور میں اپنا "افسانۂ محبت" بیان کرنے سے لطف اندوز۔ لیکن اے جانِ تمنا! تمہیں کیونکر پاؤں اے میری روحِ آرزو کس چمن خوبی میں ڈھونڈھنے جاؤں اور اپنی دکھ بھری کہانی کہہ سناؤں۔ تم کو مجھ پر کیوں ترس آنے لگا۔ تم مجھ پر کیوں رحم کرنے لگیں۔

آہ! اس سادگی عہد تمنا آغاز کی یاد اب بھی میرے ساتھ وہ سلوک کر رہی ہے کہ "مبادا بہ کسے" کاش میں اتنا عاقبت اندیش ہوتا کہ پہلے ہی تمہارے جمال نظر فریب کو نہ دیکھتا اور اپنے دل آخرت فراموش میں تمہارے حسن بے حجاب و سحر انگیں کے دیدار کی تمنا ہی نہ پیدا ہونے دیتا۔ کاش تم نے میری صدائے "ارنی" کا جواب "لن ترانی" سے دیدیا ہوتا۔ تاکہ میں وقتی افسردگی و ملال کی تکلیف وہ ساعتیں گزار لیتا اور اسوقت "عشرت عہد گذشتہ" کی یاد میں، روز "شیوۂ اظہار غم" نیا ایجاد نہ کرتا۔ تمہارا حسن پرکار اگر اسی وقت ذرا بے رخی اختیار کرتا اور درس محبت کے "الفاظ رنگیں" کو میرے سامنے پیش کرتا تو میں کیوں اس وقت حسرت و یاس کے بحر عمیق میں غوطہ زن ہوتا۔ اب میں اس "نقش محبت" کو کس طرح اپنے لوح دل سے محو کر دوں کس طرح ان "ایام رنگیں" کو فراموش کر دوں جنکی یاد اب بھی میری بے بس زندگی کا تنہا سہارا ہے۔ اگرچہ میں اسی وقت "تحفۂ محبت" کو لیکر لرزہ براندام ہوا تھا اور خوفزدہ تھا کہ دیکھیں "عشق آساں نمود اول" کی "افتاد" کن مشکلات سے دوچار کرتی ہے۔ تم نے محبت کے سبز باغ دکھا کے مجھے تسکین دی اور "آغاز محبت" کی "گلفشانیوں" سے مجھے زیر بار احسان کیا۔ لیکن آخر رنگ محبت بدلا۔ تلون نے اپنے ہاتھ پاؤں نکالے نتیجہ یہ ہوا کہ ع

شربتے از لب لعلش نہ چشیدیم و برفت ۔ اور دل نے آہ سرد واندوہ انگیں بھر کر کہا۔ ع روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔

آہ! سہ

رفتہ رفتہ وہی وقت آیا کہ اب جذبۂ ضبط ناشکیبائی کا دینے لگا الزام مجھے

اب تو پہروں تمہاری یاد ہے اور گوشۂ تنہائی۔ تمہارا تصور ہے اور حلقۂ حیرانی۔ خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ "نغمۂ غم" اور "ساز خوشی" میں تمیز باقی نہیں رہی۔ اب تو دل "گلہ جور" کا ایک "ساز خموش" ہے جسمیں "لاتعداد نغمہائے غم اندوہ" زبان ناآشنا ہو کر خواب کی آخری منزل میں مدہوش پڑے ہوئے ہیں۔ اور میں ایک مجسمۂ بے حس و حرکت ہوں جسکے خط و خال کے نقوش تمنا حسرت و ارمان کے تصادم سے غیر محسوس طور پر مٹتے چلے جارہے ہیں۔ دل مایوس "بزم پارینہ" کی یاد میں "حسرتکدۂ غم" بنکر رہگیا ہے اور طبیعت پژمردہ ہو کر گلشن خزاں دیدہ کس دل سے کہوں کہ اب تو تمہارے "جوہر بیداد" در خور عرض بھی نہیں رہے۔ آہ! ہم کیا تھیں اور کیا ہو گئیں ہائے سد "کیا زمانے کا انقلاب ہوا"۔ "بیکسی عشق" پر رو رہا ہوں۔ اور "بے بسی شوق" پر نوحہ کر رہا ہوں۔ "سیلاب بلا" میں پڑا تھپیڑے کھا رہا ہوں اور "شمع سحر" کی طرح "سہر رنگ" میں اپنی "عمر طبعی" تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صرف اس کوفت میں کہ سہ

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

"وائے دیوانگی شوق" کہ ہم اب بھی اس سے وفا کی امید رکھتے ہیں ع جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔

آہ! اہل تمنا کی واماندگی خیال کی رعنائیاں۔ ہائے رے زمزمہ سوز و گداز کی خواب آرائیاں۔ دل پُر جوش آواز دے رہا ہے کہ اب خاک ہے اور "تمنائے نشاط" طوفان بلاخیز ہے اور آرزوئے دیدار۔ وہ "بادۂ شبانہ کی سرمستیاں" خواب و خیال ہو گئیں اور "لذت خواب سحر" ایک فسانہ پارینہ تھا جو ختم ہو گیا۔ اب تو ہر "موج ہوا" ایک "موجۂ طوفان ہجر" ہے جسمیں میری زندگی کی آخری گھڑیاں تھپیڑے کھا کھا کے دم توڑ رہی ہیں سہ

اب رہا کیا ہے کوئی چند نفس باقی ہیں کہ پڑھیں صاحب دل میت عاشق پہ نماز

اب تو دل کی تنہا آرزو ہے کہ اگر ہو سکے تو تمام تمناؤں کو اپنے پہلو سے نکال کر پھینک دوں اور صرف ایک آرزوئے سکوں آور کو سے لگالوں یعنی اب تم مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فراموش کر دو۔ صرف اتنا خیال رکھتے ہوئے کہ ع

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

اور میں اپنی داستان عشق و محبت اپنے ناکام و پُر ارمان دل کو ان دو مصرعوں سے تسکین دیتے ہوئے ختم کر دوں کہ سہ

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

غرورِ محبت

از جناب تنویر قریشی صاحب

میں بالکل کمسن تھا۔ تقریباً پانچ سال کا۔ واقعات کا مجھے دھندلا سا خیال باقی ہے۔ جیسے رات کا بھولا ہوا خواب۔ میں اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ ایک مختصر سے خوبصورت مکان میں رہتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی خادمہ نہ تھی۔ اور ہم گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں کر لینے کے عادی تھے۔ والد عموماً باہر رہتے۔ اور ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ آ بھی جاتے۔ غالباً انہیں اپنی ملازمت سے فرصت نہ ملتی تھی۔ والد کی موجودگی گھر بھر کو خوش اور بشاش بنائے رکھتی۔ البتہ میری غیر حاضری میں کبھی والدہ اور والد میں اَن بَن ہو جاتی۔ جس کا خاتمہ والدہ کے رونے دھونے اور والد کا مجھے اپنے ساتھ لئے سیر و تفریح کو چلے جانے پر ہوتا۔

غرض ہم اپنی طرزِ زندگی پر خوش اور مطمئن تھے۔ ایک شب بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ ہم سب اوڑھے لپیٹے کمرہ میں دروازہ بند کرکے بیٹھے ہوئے تھے۔ نانی کوئی پُر لطف کہانی کہہ رہی تھیں اور والدہ چھالیا کتر رہی تھیں۔ دفعتاً صدر دروازہ پر بڑے زور سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ والدہ قندیل ہاتھ میں لئے پردہ تک آئیں اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سیڑھیوں سے متصل ایک موٹر کھڑی ہوئی تھی۔ جس میں سے ایک حسین خاتون لبادہ کو اپنے گرد کستے ہوئے اتری اور درانہ مکان میں داخل ہوئی۔ میں نے اس سے قبل اسے کہیں نہ دیکھا تھا۔ اور غالباً والدہ نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ پھر نہ معلوم کیوں وہ ایک لمحہ کے لئے جھجک سی گئیں۔

"وہ ہفتہ بھر سے غائب ہیں۔ یہاں تو نہیں؟" اس نے غرور آمیز لہجہ میں سوال کیا۔

والدہ نے مجھے نانی کے پاس کمرہ میں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ جو پھر اپنی چھوٹی ہوئی کہانی کہنے لگیں۔ لیکن اب اس میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ وہ حسین عورت کون ہے جس نے اتنی رات گئے ایسے سخت پالے میں ہمارے پاس آنے کی تکلیف برداشت کی ہے! اس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ ہفتہ بھر سے کون غائب ہے؟

تھوڑی دیر بعد والدہ بھی کمرہ میں ہمارے پاس آ گئیں۔ ان کے چہرہ کا رنگ سپید پڑ گیا تھا۔

"کون غائب ہے؟ اماں!"

"وہ آدمی۔۔۔ اس عورت کا چہیتا شوہر"۔ انھوں نے مجھ سے زیادہ نانی کو مخاطب کرکے کہا۔

"اور وہ اس کی تلاش میں یہاں آئی ہے۔۔۔ اخو ھرے اس کا دیدہ" نانی زیر لب کہنے لگیں۔

"اماں! ایک ہفتہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ والد ہمارے پاس پندرہ پندرہ روز مسلسل نہیں آتے۔ تم نے اسے تسلی کیوں نہ دی اماں۔ کہ ایک ہفتہ بہت جلد کٹ جاتا ہے"

اماں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

یہ حقیقت تھی کہ والد کی غیر موجودگی کے زمانہ میں والدہ عموماً مغموم رہتیں۔ اور چھپ چھپ کر روتیں۔ اسی لئے

میں نے والد سے ایک دن سوال کیا تھا۔

"بابا۔ آپ ہمیشہ یہاں ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے!"

والد کے چہرہ سے رنج ٹپکنے لگا۔ اور وہ بغیر جواب دئے باہر چلے گئے۔

"تمہیں والد سے ایسے سوالات نہیں کرنا چاہئیں۔" اماں نے ان کے جانے کے بعد کہا" ہمیں بہر حال ان کا شکر گذار رہنا چاہیئے۔ اور یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ ہم مطمئن اور خوش ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ ....."

میں والدہ کا مطلب سمجھ گیا۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں آپس میں جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ والد کہہ رہے تھے:" دیکھنا! میں کسی روز اس طرح اس گھر سے باہر قدم نکالوں گا کہ پھر تم عمر بھر میری صورت کو ترس جاؤ گی"

تو وہ اس لمحہ سے گریز کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ اطاعتگزاری کے ساتھ والد کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور جب تک وہ گھر میں رہتے انہیں اپنی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ میں بھی اس نوبت سے ڈرتا تھا گو اس وقت میری عمر اس قابل نہ تھی کہ اس کی وجہ سمجھ سکوں۔

...... میں سو گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو والدہ کے کمرہ سے شور و غل کی آواز آ رہی تھی۔

والد آئے ہوئے تھے۔ لیکن —— والدہ ان سے جھگڑ رہی تھیں۔

صدر دروازہ زور سے بند ہوا۔ والد چلے گئے تھے۔ غالباً اپنی گذشتہ دھمکی کو عملاً پورا کر دکھانے۔

میں پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا۔ والدہ دوڑتی ہوئی میرے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ دوزانو ہو گئیں۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور دردناک آواز میں آہستہ سے کہنے لگیں۔ مجھے سوتا جان کر اس خیال سے کہ کہیں میں بیدار نہ ہو جاؤں "خدایا یہ سب اس وجہ سے ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ بے پایاں محبت۔ بار الہا۔ اسے بھیج دے۔ میں ایک مرتبہ اسے کچھ نہ کہوں گی۔ وہ جیسا چاہے مجھ سے سلوک کرے" ان کے سسکیوں کی آواز بلند تر ہونے لگی۔ میرے چہرے پر گرم آنسو ٹپکنے لگے۔

تین سال کٹ گئے۔ امید و انتظار کے تین طویل سال۔ اس دوران میں ہم نے والد کی صورت تک نہ دیکھی۔ والدہ کی صحت بگڑ گئی۔ دن بدن وہ نحیف اور کمزور ہوتی جاتی تھیں۔ ان کے چہرہ کی گلابی رنگت زردی سے تبدیل ہو گئی۔ نانی پر فالج کا اثر ہو گیا۔ اب میں مدرسہ جانے لگا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔

میں مدرسہ جا رہا تھا میدان پر جمی ہوئی سخت برف پر سے گانے ہوئے۔ دفعتاً پیچھے سے گاڑی کی گھنٹی کی آواز آئی۔ میں راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو لیا۔ باگ میرے والد کے ہاتھ میں تھی۔

"بابا! بابا!!" میں اپنی پوری قوت سے چلایا۔ اور دوڑ کر عین راستہ پر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑ نے مجھے اب روندنے والے تھے

کہ میں خوف کے مارے زمین پر گر پڑا۔

والد نے ایک سخت لفظ کے ساتھ باگیں کھینچیں۔ اور کود کر میرے قریب آئے۔ مجھے زمین سے اٹھا کر کھڑا کیا۔ نہ وہ مسکرائے اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا۔ بلکہ دیر تک مجھے اسی طرح کھڑے گھورتے رہے۔

بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے وہ پلٹے پھر گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ اور میری نظروں کے سامنے گاڑی مع اپنے سوار کے دُھندلے افق پر غائب ہوگئی۔ میں مدرسہ گیا۔ کھیل کود میں یہ واقعہ میرے ذہن سے اتر گیا۔ والدہ سے ذکر کرنا بھی میں بھول گیا۔

شام کو والد گھر آئے۔ والدہ کی خوشی کا کیا ٹھکانا۔ ہم لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے۔ میں والد کی گود میں تھا۔ والدہ کرسی پر متمکن تھیں۔ نانی کسی دوسرے کمرہ میں غالباً سو رہی تھیں۔ رات کچھ ایسی زیادہ نہ گئی تھی۔

دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا۔ حسین عورت سامنے کھڑی تھی۔

"لعنت ہے تیری ہستی پر عورت! اپنے بچے کی مدد سے ان کو پھنسا رکھا ہے" اس نے والدہ کو مخاطب کر کے والد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خاموش! زہرہ! خاموش!" والد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

لیکن اس نے اس تہدید کی پرواہ نہ کی "تم بچے کو والد کی تلاش میں برفباری کے موسم میں آوارہ پھراتی ہو۔ اگر وہ آج اپنے والد کو نظر نہ آگیا ہوتا تو کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ اس وقت تمہارے گھر میں ہوتا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اسے درحقیقت تمہاری ذات سے محبت ہے تو بچے کو صرف چند روز کے واسطے میرے پاس چھوڑ دیکھو۔ بُزدل مکار عورت! تو نے فرزند کی معصومانہ محبت کا جال محض اپنے اغراض و فوائد کے لئے بچھا رکھا ہے۔ کیوں بیٹے! تم میرے ساتھ چلوگے نا! تمہیں عمدہ عمدہ کھلونے دئے جائیں گے۔ اور چھوٹا سا خوبصورت یابو تمہاری سواری کے لئے میں خرید دوں گی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں کھانے کے لئے ملیں گی" اس نے آخری حصہ مجھے مخاطب کر کے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

اماں سوچ میں پڑ گئیں ایک طرف اولاد کی محبت تھی تو دوسری طرف شوہر کی الفت پر ناز۔

آخر غرور نے محبت پر فتح پائی۔

انہوں نے مجھے اپنی جانب کھینچا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگیں "اچھا چند روز کے لئے یہ بھی سہی" ان کا سر فخر و غرور سے اونچا ہو گیا تھا۔ اور وہ تنکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کا ہاتھ میرے کندھے پر اس انداز سے رکھا ہوا تھا گویا میں ان کا پیارا بیٹا نہیں بلکہ کوئی بہادر شہسوار ہوں جس کے کارناموں پر وہ مفتخر ہیں۔

چند دن بڑے مزے سے گذرے۔ میں روزانہ یابو پر سوار ہو کر ہوا خوری کرتا باغ میں بلا روک ٹوک کھیلتا پھرتا۔ میرے لئے عمدہ عمدہ کھلونے منگوائے گئے۔ مجھے اپنے گھر میں پیسے بڑی مشکل سے ملتے۔ لیکن یہاں مجھ پر روپوں کی بوچھاڑ ہوتی حسین عورت جسے میں اب والدہ کے حکم سے ماں کہتا تھا اس کا دعویٰ حقیقتاً سچ معلوم ہو رہا تھا جب سے میں یہاں آیا والد ایک لمحہ کے لئے بھی کہیں باہر نہ گئے تھے سوائے اپنے دفتری اوقات کے۔

لیکن ـــ میرا جی ترس رہا تھا ہمجولیوں اور ساتھیوں کے لئے جن کے ساتھ میں کھیلوں کودوں۔ دل کھول کر مزیدار باتیں کروں۔ ان کو ستاؤں۔ اور لڑوں۔ میرے قدیم مکان میں والدہ اور نانی میرے ساتھی تھے۔ وہ میرے ہر کھیل میں خوشی سے حصہ لیتے۔ نانی مجھے دلچسپ کہانیاں سنایا کرتیں۔ اور والدہ نئے نئے کھانے تیار کرتیں۔ علاوہ بریں ہمسایوں کے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیاں بھی آجاتیں۔ یہاں نئے گھر میں ملازم میرا ادب کرتے۔ اور میں ان سے بے تکلفی سے گفتگو نہ کرسکتا۔ چھوٹے بچوں میں کوئی میرے ساتھ کھیلنے کو موجود نہ تھا۔ حسین عورت جسے میں والد کے حکم سے والدہ کہتا تھا میری ساتھ انتہائی توجہ اور محبت سے پیش آتی۔ ہر طرح میری خبر گیری کرتی۔ مگر اس کی ہر حرکت سے صاف طور پر تصنّع اور بناوٹ جھلکتی تھی۔

یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ والد کسی نامعلوم وجہ سے اپنا زیادہ تر وقت یہیں بسر کرنے پر مجبور ہیں گو اس کے لئے ان کا دل نہ چاہتا ہو۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ وہ مجبوراً یہاں رہتے تھے۔ اور جب موقع ملتا میری والدہ کے پاس آجاتے۔ یہاں وہ محکوم تھے اور حسین عورت جابر حاکم۔ یہاں ان کی ہر حرکت پر اعتراض ہوتا تھا۔ وہاں وہ مختار کل تھے۔ وہاں ہم سب انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہاں انہیں دوسروں کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔

میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ گو میں والد کے پاس موجود ہوں۔ تاہم وہ اس سے مطئن نہیں۔ ان کی طبیعت میں آہستہ آہستہ انقلاب رُونما ہورہا ہے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ گھر میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ وہ عموماً خاموش رہتے۔ سوالات کے جواب ان کے منہ سے ایسے نکلتے جیسے بندوق کی لبلبی دبانے سے گولی۔ ان کے چہرے پر مایوسی اور غمناکی جھلکتی تھی۔

غالباً حسین عورت بھی اپنے طور پر اسے دل ہی دل میں محسوس کررہی تھی۔

آخر کار وہی ہوا جس کی مجھے عرصہ سے امید تھی۔ ایک روز والد دفتر سے میری نئی رہائش گاہ کو نہ آئے۔ میں اور حسین عورت دونوں نے مل کر رات کا کھانا ختم کیا۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی وہ کسی اندرونی کرب سے بے چین تھی۔ کبھی وہ کچھ سوچتے ہوئے دالان میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی مطالعہ کے لئے کوئی کتاب اٹھاتی اور پھر پڑھے بغیر پھینک دیتی۔ مجھ سے بات کرنے کے لئے منہ کھولتی اور پھر رُک جاتی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا ذہن کس کشمکش کی آماجگاہ ہے۔ والد میری والدہ کے پاس تھے۔

دوسرے دن رات میں دفعتاً میری آنکھ کھلی۔ یہاں میں ایک علیحدہ کمرے میں سویا کرتا تھا۔ دروازہ خفیف سا کھلا ہوا تھا۔ باآواز بلند گفتگو کی آواز آرہی تھی۔ "دو راستوں میں سے تمہیں کسی ایک کو اختیار کرلینا چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔ یوں کام نہیں چل سکتا۔۔۔۔۔۔ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو۔۔۔۔ پھر یا کسی کے ہو رہو یا میرے ـــ" ہچکیوں نے جملہ پورا نہ ہونے دیا۔

والد واپس آگئے تھے اور حالات اپنی انتہائی حد کو پہونچ چکے تھے۔

یہاں مجھے اپنی ایک کمزوری کا اظہار کر دینا چاہیئے۔ تجسس اور رازجوئی کے جذبہ سے میں مجبور ہوگیا کہ درز سے جھانک کر دیکھوں کہ والد کے کمرہ میں کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ مجھے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ——— میری اسی کمزوری نے مجھے معاملہ کی تہ تک پہونچنے میں مدد دی۔

حسین عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور والد میز کے قریب کھڑے ہوئے وہ دوا تیار کر رہے تھے جو دونوں سونے سے قبل پینے کے عادی تھے۔ والد نے گلاس ہلایا۔ پھر میز پر رکھا۔ اور جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ چند بوندیں ایک گلاس میں ٹپکائیں پھر کاگ لگا کر بوتل جیب میں ڈالی۔ اور وہ گلاس جس میں کچھ نہ ڈالا تھا حسین عورت کو پیش کیا۔ اسکے بعد غالباً وہ دوا کی بوتل الماری میں رکھنے اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کا کمرہ سے نکلنا ہی تھا کہ وہ اٹھی اور اپنا گلاس ان کے گلاس سے تبدیل کر لیا جس میں والد نے جیب سے چھوٹی بوتل نکال کر کچھ ڈالا تھا۔ بظاہر دونوں گلاسوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ والد آئے۔ دونوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کئے اور کرسیوں پر دراز ہو گئے۔

صبح ہوئی اور میں والد کے سلام کے لئے ان کے کمرہ میں داخل ہوا۔ والد ایک بڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے۔ میری آہٹ پا کر انہوں نے سر نہ اٹھایا۔ غالباً وہ رات بھر اسی طرح سوتے رہے تھے اور حسین عورت ——— وہ بھی ایک آرام کرسی پر دراز تھی۔ منکا ڈھلا ہوا کرسی کے دونوں طرف ہاتھ لٹکے ہوئے۔ آنکھیں کھلی ہوئیں۔ خوفناک مگر ساکن۔ چہرے کا رنگ نیلا۔ مُردے کی طرح۔

تحقیقات ہوئی۔ والد پر زہر خورانی کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ اور وہ حراست میں لے لئے گئے ......

دوافروش کی شہادت پیش ہوئی جس نے والد کے ہاتھ زہر فروخت کیا تھا۔ ایک ملازم نے گواہی دی جس نے والد کو زہر گلاس میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر نے تصدیق کی کہ گلاس کی بقیہ دوا میں زہریلے اجزا شریک تھے۔ شادی کا صداقت نامہ پیش ہوا کہ مقتولہ میرے والد کی پہلی بیوی تھیں۔ اور میری والدہ دوسری جنہیں والد محض اولاد کی خواہش سے پوشیدگی میں عقد میں لائے تھے لیکن بعد کو یہ راز کھل گیا۔

والد نے الزام کے جواب میں کامل خاموشی اختیار کی۔ لیکن میں اگر حقیقت حال کہدیتا .... حقیقت یہ تھی کہ حسین عورت نے کسی نہ کسی طرح دیکھ لیا تھا کہ والد ایک گلاس میں زہر ملا رہے ہیں۔ اور جب انہوں نے گلاس اُسے دیا تو وہ سمجھی کہ دراصل زہر کا پیالہ ہے۔ کسی فوری خیال سے اس نے گلاس تبدیل کیا۔ یوں اپنے ہاتھوں اپنی موت بلائی۔

سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ والدہ برقعہ اوڑھے عدالت میں موجود تھیں ان کو رنج تو بہت سخت ہوا ہوگا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کا ہاتھ جو میرے ہاتھ میں تھا۔ خفیف سا کانپا گویا ان کی رگوں میں خون تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ اور جھکا ہوا غرور سے اوپر اٹھ گیا۔ والد کی محبت کی وہی مالک تھیں ———

پس میں حقیقت حال کہہ کر کیوں اپنی والدہ کے غرور کو صدمہ پہونچاؤں۔

(ترجمہ)

تنقیدِ شعری

ایک مغربی سیاح کی ڈائری کا ورق

املیکلنے لکھا ہے :-

میں جس ملک میں بھی گیا یہی دیکھا کہ اس ملک کی زبان میں شاعری کو ایک امتیازی تفوق حاصل ہے۔ اور اسے ایک ایسا اعلیٰ ترین علم شمار کیا جاتا ہے۔ جسے اس عالم عناصر کے بجائے روحانی دنیا سے زیادہ تعلق ہے۔ اور اس کی ایسی تعظیم و توقیر دلوں میں جاگزیں ہے گویا کسی ملکوتی جذبہ کی پرستش کی جا رہی ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ہر ملک و قوم میں عہدِ سلف کے شعراء کو بہترین تصور کیا جاتا ہے۔ یا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کو ایسا اکتسابی مانا جاتا ہے جس میں تدریجی استعداد حاصل ہوتی ہو۔ اور شاعری کو ایک ملکۂ وہبی تسلیم کیا جاتا ہے جس کا القاء قلبِ شاعر پر فوری ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ اولیں شاعری نے ایک اعجوزہ کی حیثیت اختیار کر کے دلوں کو مسخر کر لیا ہوتا ہے۔ اور وہ امتیاز جو اسے اس طرح اتفاقی طور پر حاصل ہو گیا ہوتا ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ ذہنیتوں پر تسلط پذیر رہتا ہے۔ یا یہ کہ چونکہ مملکتِ شاعری فطرت نگاری اور جذبات کی ترجمانی پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ اولین شعراء نے واقعہ نگاری کے لئے بہترین موضوع منتخب کر لئے ہوتے ہیں۔ اور وارداتِ قلب کا مرقع پیش کرنے کے لئے انسب وقائع حیات پر تسلط جما لیا ہوتا ہے اور پس آیندگاں کے لئے کوئی اچھوتا موضوع باقی نہیں چھوڑا ہوتا جس پر وہ طبع آزمائی کر سکیں، اس لئے انہیں مجبوراً اسی رنگ و روغن سے عروسِ فطرت کی تزئین کرنی پڑتی ہے۔ معاملہ بندی کے لئے گویا چبائے ہوئے نوالوں کو چبانا پڑتا ہے اور صہبائے تخیل کے اسی بادۂ کہن کو نئے نئے پیمانوں میں ڈال کر جرعہ کشان تازہ کی سر در انگیزی کا سامان بہم پہنچانا پڑتا ہے۔ بہر نوع اس کا سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ عام طور پر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ قرن اولے کے شعری کا قبضہ نیچر پر ہے اور ان کے اخلاف کا آرٹ پر۔ اور اول الذکر کو تخیلاتی اختراع اور قوت ایجاد میں تفوق حاصل ہے اور ثانی الذکر طبقہ کو تزئین و آرائش میں۔

میں چاہتا تھا کہ آسمانِ بلاغت کے ان درخشندہ ستاروں میں اپنا نام بھی کسی طرح شامل کروں۔ اس کے لئے میں نے ایران و عرب کے قریب قریب تمام شعراء کا کلام دیکھا۔ سبعہ معلّقہ کے قصائد از بر کر لئے۔ لیکن میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ محض نقالی سے کوئی شخص نام نہیں پیدا کر سکتا۔ نام کی خواہش نے مجبور کر دیا کہ میں بھی اپنی توجہ نیچر اور رموز حیات کی گرہ کشائی کی طرف منتقل کر دوں۔ تاکہ نیچر میرا موضوع اور انسان میرے ناقدین ہوں۔ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ جس چیز کا میں نے خود مشاہدہ نہ کیا ہو۔ اسے بیان کرنا محض فریب دہی ہے۔ جس درد سے میں خود لذت آشنا جس کیفیت سے متکیف۔ اور جس مسرت سے محظوظ نہ ہوا ہوں اسے کس طرح اس جادو بیانی سے بیان کر سکوں گا کہ وہ دوسرے کے دل میں تیر کی طرح اُتر جائے۔ لہٰذا ضروری سمجھا کہ دوسرے کے دل کو گرمانے کے لئے اپنے اندر تپش اور سوز و گداز پیدا کر دوں۔ شمع کی طرح پہلے خود جلوں تاکہ پروانوں کے لئے سرمایۂ جانسوزی مہیا کر سکوں۔ اپنے اندر وہ جذبہ

اور کیفیت پیدا کرلوں کہ اس کے بعد جو کچھ کہوں۔ سننے والا پکار اٹھے کہ میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

چونکہ میں نے اب شاعر بننے کا تہیہ کر لیا تھا اس لئے ہر ایک چیز ایک نئے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری حدِ بصارت میں لاانتہا وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اب کسی چیز کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہ ہوتا۔ فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں بہت آزما صحرا۔ لق و دق جنگل اور گل بدامن وادیاں عالمِ تخیل میں پُرکیف مناظر پیش کرتے۔ نگہ ژرف بیں ان مناظر کی سطحی پہلوؤں سے گذر کر حقیقت تک جا پہنچتی اور مجاز کے پردوں کو اٹھا کر دیکھ لیتی کہ شاخِ گل کے اندر گل و خار کا امتیاز باقی ہے۔ آبشاروں پر شوریدہ سری۔ ندیوں کی سرکش طغیانی۔ دریاؤں کی سکوت افزا روانی میری نگاہ میں حُسنِ سرمدی کی رنگینیاں پیش کرتی۔ چونکہ شاعر کا قلب حساس اشیاء کی خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے کوئی چیز اس کے نزدیک بے معنی مضرت رساں نہیں رہتی ہے۔ حسین و قبیح اس کے تخیل کے تکمیل کے لئے یکساں لاینفک ہوتے ہیں۔ پھول کے مشام جانفزا اور نگینی اور کانٹے کی خلش اس کے ادراک و فہم کی پختگی کے لئے ضروری ہیں۔ شاہدانِ چمن وحوش و طیور تحت الثریٰ کی معدنیات۔ اور آسمان کے شہابِ ثاقب بیک وقت اپنی گوناگوں تنوع سے اس کے ربابِ ہستی میں حسن ترنم پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک خیال بجائے خویش ایک دوسرے سے ہزار اختلاف رکھے لیکن جس طرح ایک سحر کار مصور کے لئے جیسے حق و صداقت کی تصویر صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنی ہو رنگوں کا تنوع نہایت ضروری ہے۔ ایک کامیاب شاعر کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ حاصل ہو۔ کیونکہ مبلغِ علم جس قدر زیادہ ہوگا۔ اسی قدر وہ مختلف راستوں سے سامعین کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچ سکے گا۔

لہٰذا میرے لئے گوناگوں مظاہرِ قدرت کا مطالبہ ضروری ہو گیا۔ اور میں نے جس ملک میں بھی سفر کیا اس نے میری استعدادِ شعری میں اضافہ ضرور کیا۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی عمر قطعاً اس کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی کہ ..... ایک ایک چیز کی ... ماہیت کا فرداً فرداً مشاہدہ کرے۔ لیکن شاعر کی نگاہ بہت دُور رس اور حقیقت بیں ہوتی ہے۔ وہ اشیاء کی انفرادی حیثیت سے قطع نظر کرکے ان کی نوعی حقیقت کو دیکھتا ہے۔ لالۂ صحرائی کے پنکھڑیوں کا شمار یا اس کے مختلف حصص کا تجربہ کرکے اس کے نباتاتی اثرات کی حقیقت دریافت کرنا یہ شاعر کا کام نہیں۔ اسے علم نباتات کے ماہر کی لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اسے جزئیات کو ترک کرکے کلیات کو اپنا مطمحِ نگاہ بنانا چاہیئے۔ اسے ان چیزوں کی تصویر اس انداز سے کھینچنی چاہیئے کہ دیکھنے والے کے دل میں اصل کا نقشہ کھینچ جائے۔ اسے ان اشیاء کی صرف اس کیفیت کی طرف اشارہ کرنا چاہیئے۔ جو قلبِ انسانی پر اثر انداز ہو۔ چونکہ اس کے لئے تفصیل کو چھوڑ کر ایجاز و اختصار کو اپنا شیوہ بنانا ضروری ہے اس کیلئے قوتِ ایمانی نہایت لازمی ہے۔

لیکن صرف صحیفۂ فطرت کا مطالعہ ہی شاعر کے لئے کافی نہیں۔ اس سے "آدھا شاعر" بنتا ہے۔ اس کے لئے کوائف زندگی کے مختلف شعبوں کی گہرائی تک پہنچنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے کیریکٹر کا خاصہ ہونا چاہیئے کہ وہ دلِ متاثر کی خوشی اور غم کا صحیح اندازہ

لگا سکے۔ اور تمام جذبات کی علت اور ان کی امتیازی کیفیت کا مشاہدہ کر سکے۔ اس کے دل عالم نظارہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تغیرات کا صحیح احساس کرے جو قلب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں خواہ وہ مادی تاثر سے ہوں یا آب و ہوا اور معاشرتی تبدیلی کے باعث۔ اسے اپنے آپ کو اپنے ملک و عصر کے تعصبات اور تنگ نظری سے بالاتر رکھنا چاہیئے۔ حق و صداقت کو امروز و فردا کے پیمانوں سے ناپنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ انہیں ان کی علت غائی اور حقیقت اولے کے انداز سے پرکھنا چاہیئے۔ اسے رائج الوقت قوانین۔ آداب معاشرت۔ رسوم و رواج اور عامیانہ آرا سے اپنے آپ کو متاثر نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ بلکہ رموز حیات کے اس عالمگیر صداقت سے اپنے آپ کو متمسک رکھنا چاہیئے جسے ثبات ازلی حاصل ہے۔ اور جو بلا قیود رنگ و بو ہر زمانہ میں یکساں رہتی ہے۔ ان حالات کے ماتحت اسے اپنے نام کی شہرت کی ندریجی اور سبک رو ترقی پر قانع رہنا چاہیئے۔ اپنے ہم عصروں کی مدح و ستائش کے اثر سے اپنے تئیں محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اور اپنے حقوق کو پس آئندگاں کی نظر انصاف کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اسے اپنے تئیں صحیفہ فطرت کی ترجمان اور نسل انسانی کی مقنن کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے۔ اور اپنے آپ کو زمان و امکان کے حدود سے بالاتر سمجھ کر آنے والوں کی خیالات اور اوضاع و اطوار کے لئے نہ صرف بطور خضر راہ بلکہ بحیثیت صدر مجلس پیش کرنا چاہیئے۔ اس پر بھی شاعر کی جہد و استعداد کو مکمل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اسے مختلف فنون اور زبانوں میں ادراک کامل حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اس خیال سے کہ اس کا طرز بیان اسکی رفعت تخیل کے شایان شان ہو۔ اسے مسلسل مشق و ریاضت سے تقریر و تحریر میں حسن ترنم اور اسلوبی لطافت پیدا کر کے اپنے آپ کو جادو نگار بنا لینا چاہیئے۔ تاکہ اس کی شاعری محض نقوش بر لب ساحل نہ ہو کہ جسے ایک ہلکی سی رو بھی لاپرواہی سے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے۔ بلکہ اسکے نقوش شاعری جریدہ عالم پر اسقدر جلی لیکن گہرے ہوں کہ حوادث زمانہ کی دستبرد انہیں تلف کرنے سے عاجز رہ جائے

پرویز بٹالوی

جذبات بسمل

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

ہجوم حشر میں بھی آرزوئے یار تو ہے
ملے ملے نہ ملے لطف انتظار تو ہے

کچھ اور ہو نہ ہو دل محو انتظار تو ہے
کسی طرح کسی پہلو اسے قرار تو ہے

طواف و سجدۂ دیر و حرم سے کیا مطلب
میری جبیں کے لئے نقش پائے یار تو ہے

چمن کا لطف جو حاصل یہاں نہیں نہ سہی
بلا سے کنج قفس میں مجھے قرار تو ہے

یہ مانتے ہیں نہیں عالم بہار میں ہم
مگر نگاہ میں وہ عالم بہار تو ہے

حیات میں جو نہ عزت ملی ملال نہیں
فنا کے بعد مرا چرخ پر غبار تو ہے

چمن میں لطف چمن کچھ نہیں مگر صیاد
یہ چار دن ہیں بہت چار دن بہار تو ہے

فریب خوردۂ حسن ازل نہ ہو کچھ بھی
ابد کے شوق میں یہ محو انتظار تو ہے

نظر فریبئ عالم پہ کیوں نظر نہ کروں
خزاں لئے ہوئے آئینۂ بہار تو ہے

نہیں شمار مرا شاعروں میں اے بسمل
مگر ہوں نوح کا خادم یہ افتخار تو ہے

ہمارا لباس[۱]

از جناب نصیر الدین ہاشمی

تمدن اور تہذیب کے لوازمات میں لباس بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قوموں کی معاشرت اور تمدن و تہذیب کے مدارج لباس میں مضمر ہوتے ہیں۔ ستر پوشی، یکسانیت۔ نزاکت۔ نفاست ہر ایک سے اس قوم کی تمدنی اور تہذیبی حالت منکشف ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنے تمدن سے انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے تو اس کا لباس اسی قدر برہنگی اور نازکت اور نفاست میں ترقی کریگا۔ غرضکہ قوم کی ترقی کا ایک ممیز آلہ لباس ہے۔

ہندوستان میں جہاں بیسوں اقوام آباد ہیں اور صدہا زبانیں مروج ہیں وہاں ان کے لباس کی بھی یہی حالت ہے۔ صرف مسلمانوں کو لیا جائے اور ان کی مشترک زبان اردو قرار دی جائے مگر پھر بھی لباس میں یکسانیت نہیں پائی جاتی پنجاب کے مسلمانوں کا عام لباس کچھ اور ہے اور حیدرآباد کا کچھ اور دوآبہ گنگا اور جمنا کے بسنے والوں کا لباس کچھ۔ ہے تو مدراس کے مسلمانوں کا کچھ۔ بنگال کے مسلمانوں کا لباس بمبئی اور گجرات کے مسلمانوں سے نہیں ملتا۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے گذشتہ اور موجودہ لباس کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو خاصی ضخیم اور دلچسپ ہو سکتی ہے۔

یہاں اس امر کا تو موقع نہیں کہ مذکورہ بیان کی صراحت اور وضاحت کی جائے کیونکہ اس کے لئے بہت بڑے معلومات کی ضرورت ہے البتہ یہاں جنوبی ہند کے مسلمانوں کے لباس کی کچھ صراحت کی جاتی ہے۔

جنوبی ہند کے ساتھ مسلمانوں کے . . . . تعلقات پہلی صدی ہجری میں قائم ہو چکے تھے۔ سواحل کرناٹک اور ملیبار پر عرب تجار اور مبلغ اپنی تجارت اور تبلیغ دین کی غرض سے آتے تھے۔ اس طرح شمال کی جانب سے مسلمان فاتح کے ہمراہ قدم رکھنے کے صدیوں پیشتر جہازوں کی راہ سے ساحلِ ہند پر وہ اپنے قدم جما چکے تھے۔ اور ان کی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔

اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ فتوح المجاہدین (تاریخ ملیبار) تاریخ فرشتہ۔ سفرنامہ ابن بطوطہ اور "عرب ہند کے تعلقات" وغیرہ کتابوں سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے[۲]۔

جن مسلمانوں نے جنوبی ہند کے ساحل پر قدم رکھا تھا وہ اکثر شرفہ عرب اور مساوات بنی فاطمہ ہاشمی النسل تھے۔ اور یہ اپنے اس وقت کے تمدن کے موافق اپنی معاشرت کے مطابق۔ عمامہ۔ قبا۔ قمیص پائجامہ لنگ کا استعمال کرتے تھے۔ عورتوں میں قمیص، پائجامہ سینہ بند اور اوڑھنی مستعمل تھی۔

یہاں (سواحل ہند) کے باشندوں کا لباس اس سے بالکل جداگانہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ رہا کرتا تھا۔ اور مرد عموماً دھوتی اور عورتیں ساڑی کا استعمال کرتی تھیں۔ البتہ دولتمند قیمتی اور غریب موٹا سوتی لباس پہنا کرتے تھے۔

---

[۱] اس سے صرف جنوبی ہند کے مسلمانوں کا لباس مقصود ہے۔ [۲] کبھی موقع ہوا تو جنوبی ہند کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات پر کافی روشنی ڈالی جائیگی۔

جب ایک قوم دوسری قوم میں بود و باش کرتی ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ ایک قوم کے تمدنی لوازمات دوسری قوم کے تمدن میں شامل نہ ہو جائیں۔ اور فاتح کا لباس مفتوح قوم میں مروج نہ ہو جائے۔ عربوں نے جب شام۔ ایران اور مصر کو فتح کیا تو بہت ہی جلد وہاں کا قدیم تمدن معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ عربی تمدن نے لے لی۔ مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں نہ تو خالص عربی تمدن کا رواج ہوا۔ اور نہ ہندی تمدن بالکل زائل ہو گیا۔ بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک علیحدہ تمدن قائم ہو گیا۔ اور جنوبی ہند کی اسلامی سلطنتوں۔ بہمنیہ۔ عادل شاہیہ۔ قطب شاہیہ وغیرہ کے زمانہ میں گویا اس متمزجہ تمدن نے اپنی انتہائی ترقی حاصل کر لی تھی اور عام طور سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا خصوصاً درباری لباس اور اعلیٰ سوسائٹی کا لباس قریب قریب یکساں تھا۔ البتہ سر کے لباس میں کچھ فرق ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں جب وجیانگر میں ہندوؤں کی زبردست سلطنت قائم ہو گئی تو جنوبی ہند کے انتہائی مقامات (احاطہ مدراس) کے مسلمانوں میں ہندی لباس نے زیادہ جگہ لے لی تھی۔

عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں جو لباس مروج تھا۔ اس کی وضاحت ہم کو قدیم آرٹ کے نمونہ سے بخوبی واقف کر سکتی ہے۔ یہاں بعض امور کی صراحت کی جاتی ہے۔

مسلمان مرد لمبی قبا تنگ آستین کی استعمال کرتے تھے جس کے نیچے کا حصہ گھیر دار ہوتا تھا۔ یہ عموماً سفید ململ کی ہوتی تھی بعض اوقات ایک نیم آستین قبا اس پر ہوتی تھی۔ یہ عموماً رنگین اور قیمتی جھر دار کمخاب مخمل وغیرہ کی ہوا کرتی۔ پائجامہ کبھی تنگ اور کبھی گھیر دار استعمال ہوتا تھا۔ عام طور پر عمامہ باندھا جاتا۔ جس کو کبھی پہنے بھی ہوا کرتے تھے۔ جنگ کے وقت خود اور بکتر کا بھی رواج تھا۔ عورتوں کے لباس میں لہنگا دامنی اور چولی کا استعمال تھا۔ بعض وقت ایسی انگیا استعمال کی گئی ہے جس سے سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا رہتا تھا۔ عورتوں کا یہ لباس رنگین اور زریں ہوتا تھا۔ عموماً شوخ اور گہرے رنگ کا رواج تھا جو پائدار خیال کیا جاتا تھا۔

ایک زمانۂ دراز تک تمام جنوبی ہند میں ایک ہی لباس پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد یہاں بھی تفریق ہو گئی۔ اور تقریباً دو حصے ہو گئے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ صراحت کی جائے۔

احاطۂ مدراس و میسور۔ ارکاٹ (مدراس) میں جب رؤسائے ارکاٹ حکمران تھے تو عام طور سے مردوں کے لباس میں حسب ذیل اشیاء نظر آتے تھے:۔

عمامہ (سفید) جامہ (سفید ململ کا) تمان (مشروع یا کمخواب وغیرہ) اوپر سے شال بھی اوڑھی جاتی تھی۔ بعض قدیم عربی خاندانوں میں عربی لباس شایا یا جبّہ وغیرہ استعمال ہوتا تھا۔

عورتوں میں عام طور سے ہندوی لباس مروج تھا اور وہ شوخ رنگ ململ وغیرہ کی دامنی۔ چولی اور لہنگا۔ (مشروع۔ کمخواب وغیرہ) کا استعمال کرتی تھیں۔ بعض جگہ عربی لباس بھی تھا۔

شادی بیاہ کے موقع پر مردوں کے لباس میں بجائے سفید جامے کے رنگین اور زریں کام کا جامہ استعمال ہوتا تھا۔ اور عامہ بھی زریں ہوتا تھا۔ دولہنوں کے لئے پشواز اور چوحاشیہ جو قیمتی مصالح سے بنائے جاتی تھی استعمال

کی جاتی تھی۔

میسور میں بھی عموماً یہی لباس تھا مگر ٹیپو سلطان کے زمانہ میں چولی موم یا انگیا کی آستینیں قانوناً لمبی کی گئیں تھیں، اور یہ قانون ہندو مسلمانوں سب کے لئے تھا۔ چنانچہ آج تک بھی میسور میں بیچ اقوام لمبی آستین کی انگیا استعمال کرتے ہیں۔

امتداد زمانہ سے اگرچہ مردوں کے لباس میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے مگر احاطہ مدراس وغیرہ کی عورتوں میں قدیم لباس کی جھلک اب تک باقی ہے۔ فی زمانہ جو لباس اس طرف مستعمل ہے اس کی صراحت کی جاتی ہے۔

(۱) مردوں کا لباس اکثر و بیشتر حسب ذیل ہوتا ہے :-

(الف) مکمل انگلش لباس۔

(ب) عمامہ (بلاشملہ) یا کلاہ رومی۔ شیروانی مگر لمبی قمیص۔ پائجامہ (نہ زیادہ تنگ نہ زیادہ فراخ)

(ج) عمامہ یا مخملی ٹوپی۔ قمیص۔ کوٹ۔ یا صدری۔ پائجامہ یا لنگ۔

(۲) عورتوں کا لباس۔

(الف) مکمل پارسی لباس۔

(ب) ساڑھی۔ کرتی۔ (بلا آستین) چولی۔

(ج) لہنگا دامنی۔ چولی۔

میرا خیال ہے کہ بعض گھرانوں میں عورتوں کے لئے بھی مکمل یوروپین لباس مروج ہے۔

قلمرو آصفیہ و سلطنت حیدریہ۔ یہاں کے لباس میں قطب شاہی دور کے بعد شمال کے مغلیہ لباس کی جھلک نظر آتی تھی۔ مگر اس کے بعد بتدریج تغیر ہوتا گیا۔ مردوں کے لباس میں عمامے اور مختلف وضع کے دستار استعمال ہونے لگے۔ سفید جاموں کا گھیر کم ہوتا گیا۔ اور انگرکھا بھی مستعمل ہونے لگا۔ حتی کہ سنہ ۱۲۰۰ھ کے اواخر سے کلاہ رومی اور شیروانی کا رواج ہونے لگا۔ مگر قدیم شیروانی موجودہ شیروانی سے لمبی ہونے کے علاوہ وضع اور قطع میں بھی بڑا فرق تھا۔

عورتوں کے لباس میں اول تو لہنگا اور دامنی اور چولی کا استعمال تھا۔ مگر اس کے بعد پائجامہ استعمال ہونے لگا۔ جو نہ زیادہ تنگ ہوتا تھا اور نہ زیادہ فراخ۔ اس کے ساتھ دوپٹے اور کرتی اور چولی کا رواج تھا۔ پائجامہ ہمسرو مشروع گلبدن۔ کمخاب وغیرہ کا ہوا کرتا۔ دوپٹہ اکثر ململ اور ریشمی ململ وغیرہ کا ہوتا۔ اکثر گہرے رنگ کا استعمال تھا۔ چولی اور کرتی جالی کی بنائی جاتی تھی اس کے بعد بجائے کرتی (بالا آستین) کرنے کا رواج ہوا جو پہلے تو زیادہ دراز نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس کے بعد زیادہ دراز کا رواج ہوا۔

شادی بیاہ کے موقع پر اول تو زرین پشواز اور بکلائی پہنی جاتی تھی۔ مگر بتدریج اس کا رواج موقوف ہو کر شادی بیاہ کے موقع پر بھی وہی پائجامہ اور دوپٹہ کا رواج ہوا۔ اس کے بعد بتدریج ساڑھی کا آغاز ہوا۔ اور اس کے ساتھ قمیص او بلوس بھی مروج ہونے لگی آج بہت بڑا حصہ اسی کو استعمال کرتا ہے۔ زرق برق مصالح دار دوپٹے غائب ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے بجائے زریں ساڑھی آگئی ہے مگر ہنوز دوپٹہ کا رواج باقی ہے معدوم نہیں ہو گیا۔

آج کل جو لباس مردوں اور عورتوں میں مروج ہے اس کے اقسام حسب ذیل ہیں۔

مردوں کا لباس۔

(۱) رومی ٹوپی۔ ایرانی ٹوپی۔ شملہ۔ دستار
ہیٹ۔ کشتی نما ٹوپی۔

(۲) شیروانی۔ کوٹ۔

(۳) قمیص۔ کُرتا۔

(۴) پائجامہ (دو سرا تنگ، فراخ، چوڑی دار)۔ پتلون۔

(۵) بوٹ۔ شوز۔ پمپل۔

عورتوں کا لباس۔

(۱) بال کاٹنے کا آغاز ہو گیا ہے۔

(۲) ساڑی۔ دوپٹہ۔

(۳) قمیص۔ بلوس۔ کرتا۔ کرتی (بلا آستین)

(۴) پائجامہ۔

(۵) شوز۔ پمپل۔

(۶) چولی۔ بنین۔ چست برسٹ۔

شیروانی سوتی۔ ریشمی اور اونی کپڑے کی ہوتی ہے۔ اس کی وضع اور قطع ہندوستان بھر میں مشہور و معروف ہے اکثر شیروانی کے ہم رنگ پینا بہ کا استعمال ہوتا ہے۔ شیروانی کی گھنڈیاں بھی ہم رنگی رکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ریشمی کپڑا اس کے لئے استعمال ہوا کرتا ہے۔ مگر اب عام طور سے ریشمی کپڑے کی شیروانی معیوب تصور ہوتی ہے۔ صرف دولھا کی حد تک اب بھی اس کا رواج ہے۔ بلکہ اکثر کمخاب اور مشجر کی شیروانی استعمال کی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کم از کم اور دس پندرہ سال اس کا رواج رہیگا۔

موسم گرما میں قسم قسم کے سلک کی شیروانیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ سفید برک کی شیروانیاں بھی مروج ہیں۔ آجکل کھدر کی شیروانی بھی نظر آتی ہیں مگر شاذ۔

عورتوں میں سوتی اور ریشمی اور زرین کپڑوں کا رواج ہے مگر عام طور سے شوخ اور گہرا رنگ پسند نہیں کیا جاتا بلکہ صوفیانی اور ہلکا رنگ پسند ہوتا ہے۔ ساری کے رنگ اور اکثر اونی کپڑے کی قمیص یا بلوس استعمال کی جاتی ہے۔ پائتابہ اور شوز بھی اسی رنگ کے ہونے لگے ہیں۔ بلکہ دستی بھی اور چوڑیاں بھی اسی رنگ کی پہنی جاتی ہیں۔

کلابتون کے کام کی ریشمی اور مہین ساڑہی کے ساتھ ساتھ بنارس کی زریں اور وزنی ساڑہی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں آجکل مردوں اور عورتوں میں جو لباس حیدرآباد میں مروج ہے وہ نہایت خوبصورت موزوں اور مناسب ہے میرا خیال ہے عام طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہی لباس بہتر ہو سکتا ہے۔

دعوت شادی بیاہ کے موقع پر عورتوں نے قطع نظر مردوں کی رنگ برنگ کی شیروانی (اونی اور سلک کی) اگرچہ اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر یورپ کی طرح اگر ایک خاص رنگ کی یکسانیت ہو جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

عورتوں کے لباس میں اہل یورپ کی طرح نیم آستین اور بلا آستین بلوس کا رواج ہو چلا ہے گو عام طور سے اسکا رواج نہیں ہے مگر آئے دن اس وضع کی بلوس مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اسمیں شک نہیں خوبصورتی کے اعتبار سے اسی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

جام نوازیاں

بیٹا

(از جناب پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم اے)

اسفندیار خاں اُن بانکے تلواریوں میں سے تھا جو مغلیہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر جا بجا نمودار ہو گئے تھے اور ہر جان جوکھوں کے کام میں شریک ہونے کو تیار رہتے تھے۔ اس وقت وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اسیر تھا۔ دروازہ پر ایک عمر رسیدہ پہرہ دار مسلح کھڑا تھا۔ اسفندیار کے پاس راجپوت راج کماری لیلاوتی بیٹھی تھی۔ اور یہی دراصل اس کی مصیبتوں کا سرچشمہ تھا۔

اسفندیار نے راجہ سورج مل کے کہنے پر اُسے نواب فخر الدولہ کے محل سے اُڑا لانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ سورج مل اسے سیاسی ضروریات کی بناء پر اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کی یہ خواہش پوری ہونے کے قریب ہی تھی کہ فخر الدولہ کے آدمیوں نے اسفندیار اور لیلاوتی کو منزل مقصود سے پہلے پکڑ لیا۔ اب وہ پہرہ دار کو بہکانے میں مصروف تھا۔ مگر پہرہ دار بڑا وفادار اور تجربہ کار سپاہی تھا۔ اور دم بھر بے خبر نہیں ہوتا تھا۔

اسفندیار بولا۔ "تم یہاں اکیلے اکتا تو جاتے ہو گے؟"

بوڑھے پہرہ دار نے کہا "تمہارے جیسے باتونی آدمیوں سے بہت کم سابقہ پڑتا ہے"۔ کچھ رُک کر۔ جیسے کسی کا اندرونی غم پھوٹ نکل آیا ہو۔ "مگر جب سے میرے دو بیٹے کھوئے گئے ہیں میں تنہا ہی رہتا ہوں۔ میں نے انہیں بدقسمتی سے اپنے بھائی کے پاس بھیجدیا تھا کہ راجہ سورج مل کے آدمیوں نے اس کے مکان کو لوٹ کھسوٹ کر برباد کر دیا۔ میرے دونوں بیٹے جب ہی سے لاپتہ ہیں۔ چھوٹے کو اُسی وقت ہی سورج مل کی کسی سپاہی کی بغل میں دیکھا تھا۔ اور بس۔ اگر وہ آج زندہ ہو تو میں اسے فوراً پہچان لوں۔ کیونکہ اس کے دائیں بازو پر ایک بڑا سا سُرخ دھبہ ہے۔

اسفندیار چونک اٹھا "سُر... سُر... سُرخ دھبہ... بازو پر..." اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے دائیں بازو پر تھا!

"ہیں! کیا.... کیا تم میرے بیٹے ہو؟" بوڑھے پہرہ دار کی آواز میں حیرت، شک، اور یقین عجیب طرح ملے ہوئے تھے۔

اسفندیار نے پہرہ دار کے ہاتھ کو اپنے دائیں بازو سے جھٹک دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ تم ہی ہو" پہرہ دار کی آنکھوں میں بے اندازہ خوشی جھلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں کامل خاموشی چھا گئی۔ اور دُور سے فخر الدولہ کے سپاہیوں کی جھگڑالو آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اسفندیار نے گھبرا کر کہا "نہیں۔ نہیں۔ میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں"۔ اس کی نگاہیں فرش پر بے تابی سے پھرنے لگیں۔

"تم ہو، اور ضرور ہو! میں پہچان گیا ہوں! مجھے اپنا بازو دکھاؤ! .... میں دیکھ کر رہوں گا"

"نہیں نہیں۔ مت دیکھو۔۔۔۔ سنو!" باپ ٹھیر گیا۔ "سنو! فرض کرو میں تمہارا بیٹا ہوں کیا میں یہ چاہوں گا کہ تمہیں اس ناقابل برداشت تذبذب میں ڈالدوں کہ بیٹے کو قید میں رکھا جائے یا مالک سے نمک حرامی کی جائے"

بوڑھے نے لمبا سانس بھر کر کہا: "واقعی!" لیکن پھر کاندھوں کو سیدھا کر کے کہا: "مگر میں اپنے بیٹے کا دشمن نہیں بنوں گا" ٹھیرو میں دیکھ لوں تمہارے بھاگنے کے لئے میدان صاف ہے یا نہیں"

اسفندیار باصرار کہہ رہا تھا: "نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں"

بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے: "آخر میں اپنے بیٹے کے کسی کام تو آؤں" اور یہ کہکر پہرہ چھوڑ کر چلا گیا۔

راج کماری لیلاوتی کی حیرت بڑھ رہی تھی: "مجھے اپنا بازو دکھاؤ!" اسفندیار نے ہنستے ہنستے آستین اُلٹ دی، بازو پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا: "میرے جسم پر بس ایک نشان ہے اور وہ ایک صراحی کی شکل کا مسّا ہے۔ جو عین میرے دل کے اوپر ہے"

لیلاوتی نے نفرت سے کہا: "تم بڑے بدہو کہ یوں ایک باپ کے مقدس ترین جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو" مگر دل میں وہ اس کی چالاکی کی مداح تھی!

"اوہ۔ دیکھو نا! ایسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔" اتنے میں باپ کمرے میں داخل ہو گیا: "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ لو بیٹا۔۔ خدا حافظ۔ الوداع۔ دیکھو جلدی میرے پاس لوٹ آنا" یکایک اُسے ایک خیال آیا: "شاید تمہیں اپنے بھائی کا کچھ پتہ ہو!" اسفندیار نے سر ہلایا کہ نہیں: "اوہ اگر ہو سکتا ہے کہ تم اُسے یوں اچھی طرح جانتے ہو لیکن تمہیں یہ خبر نہ ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کی نشانی ایک مسّا ہے۔ صراحی کی شکل کا۔ عین دل کے اوپر۔۔۔۔ سمجھے نا!۔۔۔۔"

("پیشوا" دہلی)

عروس سخن

از خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی

فرانس کے ہوشوں میں ایک بلائے روزگار کو دعویٰ تھا کہ عورت کے دل کا حال میں اس کے کپڑوں کی گوٹ سے بتا دوں۔ عورت کا لباس اس کے دل کا آئینہ ہے۔ لباس کی ذرا ذرا سی چھوٹی باتیں پہننے والے کے رنج و شادمانی کی غمازی کرتی ہیں۔ گوٹ بُری ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے چاہنے والے کا قصور ہے۔ دوپٹہ میلا ہے تو سمجھ لو کہ اس سے رنج ہے۔ چاہنے والا اگر بے پرواہ ہے تو یہاں لباس بھی ویسا ہی ہے۔ وہ خوش ہے تو کپڑے کپڑے سے بانکپن ٹپک رہا ہے۔ عورت کا قول ہی یہی ہے کہ اُنہیں کو پرواہ نہیں تو ہمیں کو کیا غرض کہ کنگھی چوٹی کا جھگڑا کریں۔ وہ خفا ہیں تو پھر کس کے دکھانے کو کپڑے بدلیں۔ کپڑے کیوں میلے ہیں؟ اتاریں کس کے لئے؟ وہ خوش ہیں تو بلا کا جوڑا نکلا ہے۔ غرض جیسی اُدھر سے دل دہی ویسی ہی یہاں دل آرائی دیکھی۔ وہاں طبیعت بدلی اور یہاں صورت بگڑی ؎

بیگانہ روشود بدبرِ آشنا رود — آنکس کہ آشنا بتو باشد کجا رود؟

بعینہ یہی حال عروسِ سخن کا ہے۔ اس کی دل بری اور خوبی ہمیشہ تمہاری قدر و محبت پر موقوف رہی۔ مدت سے جو اسنے شوخی وطراری چھوڑ رکھی ہے سارا سبب تمہاری بے پروائی کا ہے۔ اب یہاں تک تو نوبت آئی ہے کہ دل بری اور رعنائی تو ایک طرف اپنی جان سے تنگ ہے۔ جانے کس طرح اب تک اپنے دن کاٹ رہی ہے۔ تم جو منہ نہیں لگاتے تو اب پردۂ دل سے بھی باہر نہیں آتی۔ اس کا سہاگ تمہیں تک تھا تمہیں کو پرواہ نہیں تو پھر کس کے لئے نکلے۔ بعضے تو اسے غیروں کے لئے چھوڑ بیٹھے۔ بہت سے نالائق نکل گئے۔ بہتیرے اس سے اس طرح پیش آئے کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس کی بیکسی کا حال وہی جانے جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔

اے حجلہ نشیں پردۂ دل سے نکل اب تو اے تازہ عروس اپنی ادائیں بدل اب تو

طبیعت کو اب چین کہاں؟ جوش سخن تو یہیں سے بہکا۔ دیکھو تو یہ معانیٔ رنگیں کا لباس پہنے خانۂ دل سے ابھی کون نکلا؟ جس کی نزاکت نے شیشۂ دل کو رشکِ پریخانہ بنا دیا۔ زبانیں دہن میں بے قرار ہو گئیں۔ فرشتوں نے حوروں سی اور جنوں نے پریوں سے باتیں کرنی چھوڑ دیں۔ جس کا قد ہماری طبیعت کی راستی۔ اور وسعت خیال جس کی زلف کی درازی ہے۔ جس کا دہن گرداب صہبائے معانی اور ادنیٰ شوخی لن ترانی ہے۔ جس کی چال دلوں کو ہلائے اور نگاہ جگر کو گدگدائے، جس کی ادا دلوں کو صدائے خانہ آباد۔ اور جس کی آواز کانوں کے لئے مبارکباد ہے۔ جس کی بوئے پیرہن میں موج مے کا مزہ ہے۔ اور شوخی طبع جس کا تقاضا ہے۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ روشنائی ہے اور بدن میں سادہ کاغذ کی صورت صفائی ہے۔ گرمئے گفتار جس کی گرمجوشی اور رنگیں بیانی جس کی رعنائی ہے۔ گو عادتِ یار کے خلاف اپنے عاشقوں سے بہت نہیں بگڑتی۔ مگر نزاکت کے سبب خاطرِ مضطر کی طرح بگڑی تو پھر نہیں سنبھلتی۔ (مہلائے عام)

جدائی

ایک روسی گیت کا ترجمہ

جب جوانی کا سورج نکل رہا تھا ــــ مجھے دل وجان سے پیاری ایک لڑکی سے محبت تھی ــــ اس کی آنکھوں میں سورج کی چمک تھی ــــ اس کے چہرہ پر محبت کی آگ جل رہی تھی ــــ اس کے سامنے تیری کیا ہستی تھی، بہار کی صبح ــــ یا تیرے ہرے بھرے شاہ بلوط کے درخت ــــ یا تیری، ستیپ کی گھاس، سبز مخمل کی چادر، ــــ یا تیری اے جھٹ پٹے کے وقت، یا تیری اے جادو بھری رات! ــــ تم پر تو نظر تب ہی پڑتی ہے جب وہ نہ ہو۔ ــــ

جب تم کو کوئی اپنے درد اور اشتیاق کا حال سنائے! ــــ وہ سامنے ہو تو تم دکھائی بھی نہیں دیتے ــــ وہ ساتھ ہو تو جاڑا بہار ہو جاتا ہے، اندھیری رات اُجلا دن! ــــ وہ گھڑی کیسے بھول جاؤں جب میں نے آخری بار ــــ اس سے کہا خدا حافظ میری پیاری! ــــ شاید خدا کی بھی مرضی ہے کہ ہم جدا ہو جائیں ــــ مگر پھر کبھی ملیں گے۔ ...“

اک دم اس کے چہرہ پر آگ بھڑک اٹھی ــــ پھر وہ برف کی طرح سفید پڑ گیا ــــ تڑپ کر دیوانوں کی طرح

وہ میرے سینہ سے لپٹ گئی — ابھی نہ جا، ذرا ٹھہر مہلت دے — کہ دل کو سنبھال لوں، سو اما کے کندے پر — رو کر اپنے رنج کو بہا دوں ......" — وہ سسکیاں لینے لگی، بات زبان پر آکر رہ گئی ......"

("اردو")

کلو خانم

ازجناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی

ہمارے ہاں ایک ٹھلائی تھیں کلو خانم۔ آل نہ اولاد۔ وہ اور ایک ان کے بڑے میاں مزاج کے کڑوے۔ ہر وقت کی تکا فضیحتی۔ غرض ساری عمر یونہی جوتیوں میں دال بٹی۔ میاں پڑے بیمار اور کوئی برس بھر لی جورو سے خدمت۔ بچاری ٹھنڈا ئیاں رگڑتے اور کپڑے دہوتے عاجز آگئی۔ آخر کو ایک ساوانی سی ہو گئی۔ ایک دو دن کی بیماری ہو تو خیر بہتری آدمی ٹٹے نویسی کرے۔ سال کے بارہ مہینے کون پٹی پکڑ کے بیٹھے۔

کلو خانم کا ایک دن جی چاہا کھیر کو، خصم کی بھی الٹ پلٹ کرتی جاتی اور کھیر بھی گھوٹتی جاتی۔ جب کھیر گھٹ گھٹا ہوئی تیار، اور چاہیں کہ چولھے پر سے اتاریں۔ ہچکی کی آواز آئی۔ دیکھیں تو بڑے میاں کے دیدے کھلے کے کھلے اور سانس ندارد۔ کہنے لگیں "دوئی خدا کی مار! کیا بیری مر دوا ہے۔ نگوڑا عمر بھر میری خوشی نہ دیکھ سکا، آج ذرا کھیر کو جی چاہا تھا تو موئے کو ابھی مرنا تھا۔ کم بخت کی جان کو ابھی سے پیٹتی ہوں تو ہمسائیاں بل کی جان پر آسوار ہوں گی سارے دن کی میں بھوکی رو یا کس خندی سے جائے گا۔ ادھر کھیر کتے کیوں چھوڑنے لگے۔ کون سے اس بندی کے سگے ہیں!"

بورچی خانے میں بکال غوری میں کھیر ملتی گرم لگیں چھپا چھپ اڑانے۔ ہنڈیا ڈوئی، غوری سب چاٹ چوٹ صاف کی۔ جھجری میں سے بھر کٹورا پانی پیا۔ اب چپکے سے مردے کے پاس آئیں۔ ڈھاٹا باندھا آنکھیں جوں توں بند کیں۔ سب کاموں سے فارغ ہو وہ کلیجہ پھاڑ کے دھاڑیں کہ سارے محلے والے ٹوٹ پڑے۔ وہ پیٹیں وہ چیخیں کہ اوسانوں میں آنا مشکل ہو گیا۔ جوں جوں ہمسائیاں صبر کی تلقین کرتیں یہ اور پٹخنیاں کھاتیں اور کسی طرح سانوں میں نہ آتیں ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ آنکھیں روتیں اور جی ہنستا تھا۔ کونسا موئے نے سکھ دیا تھا جو روتی — سوکن رونے میں چلی اور گز کا گھونگھٹ کاڑہ۔ گھونگھٹ روئے من ہنسے میرا جیوڑا کرے کلیل۔ نقا متے کے مرنے سے میں جیتوں میں آگئی۔

("ہمایوں" سالنامہ)

ساقی ۱۹۳۱ء میں

از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی

اگر "ساقی" کے ایک سال کے پرچوں پر مفصل تنقید کی جائے۔ تو یقیناً شاہد صاحب کو ایک علیحدہ خاص نمبر نکالنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ لہذا یہی مناسب ہے کہ ایک سرسری نگاہ ڈالکر ساقی کی خوبیاں نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دی جائیں۔

جب میں نے سُنا کہ دہلی سے ساقی کا اجراء ہونے والا ہے تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ لفظ "ساقی" کو مدنظر رکھکر میں نے خیال کیا تھا کہ اسکے اندر دیگر رسائل سے بھی زیادہ مخرب الاخلاق مضامین شایع ہوا کریں گے۔ لیکن اس کے متواتر مطالعہ سے میں نے محسوس کر لیا کہ میرا قیاس غلط تھا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ "ہوش وحواس کو مختل کر دینے والے ساقی" اور اس "علم وادب کے ساقی" میں وہی فرق ہے جو فرق عشق مجازی اور عشق حقیقی میں ہوتا ہے۔ اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے سرورق پر لکھا ہوا ڈاکٹر اقبال کا شعر بلا وجہ نہیں چھاپا گیا ہے سے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف وکرم اور

پہلا سال ختم ہونے کے بعد مجھے کامل یقین ہوگیا تھا کہ ساقی کا دورِ ثانی نقوشِ اولین سے بہتر ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری توقعات کی پامالی نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں ساقی کے اتنے خاص نمبر شایع ہوئے جو بعض رسائل دو سال میں بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اور چشمِ حقیقت بیں سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ساقی کا ہر معمولی پرچہ بھی بعض رسائل کے خاص نمبروں سے اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس رسالہ کو عمدہ نہیں کہا جا سکتا جس کا حجم زیادہ ہو۔ بلکہ خوبی کا انحصار نفسِ مضمون پر ہے۔ ہر صاحبِ عقل وفہم صورت ظاہری پر مائل ہونے کے بجائے سیرت باطنی کا غلام بننا زیادہ مناسب سمجھے گا۔

ساقی اپنی زندگی کی دو منزلیں طے کر کے تیسری منزل کی جستجو میں قدم بڑھانے والا[1] ہے۔ اور ہر چند کہ بدخواہ معاصرین نے سرِ راہ بہت سی خار دار جھاڑیاں بچھائیں اور ہر طرح سے رخنہ اندازیاں کیں لیکن اس عزم صمیم رکھنے والے "بچے" کے پاؤں لڑکھڑانے سے محفوظ رہے۔ اور جس طرح بادلے کٹے کی عف عف کے باوجود قندیل عرش سطحِ ارض پر ضیا بار کرنیں برساتی رہتی ہے اور تمام کائنات اس کی روشنی سے منور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ساقی اپنے بادہ خواروں میں "مئے صحافت" تقسیم کرتا رہا۔ اور بلا امتیاز وتخصیص اپنے ہمنواؤں اور بدخواہوں کو مستفید کرنا اپنا فرض سمجھتا رہا۔ اس نے کبھی اپنے بدترین دشمن کو بھی بُری نگاہ سے نہیں دیکھا تاہم قارئین ساقی میں سے حساس طبیعت رکھنے والے چند حضرات نے مناسب سمجھا کہ ان رخنہ اندازیوں کا سدباب کر دیا جائے۔ چنانچہ شیخ سعدی کے قول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" علامہ مضحک نے ان لغو نگاروں کے رشحاتِ قلم کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور ان زود پشیمان کور چشموں کو تسلیم کرنا پڑا کہ اگرچہ ساقی ایک طفلِ شیر خوار ہے لیکن اس کی ہمت اس "بچے" کی طرح استوار ہے جس نے کذب وبطل کو مٹانے اور اپنی صداقت کا ثبوت دینے کے لئے فرعون بے سامان کی داڑھی نوچ لی تھی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ صداقت کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ساقی کے طرفدار فی الحال بہت کم ہیں لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ دس ہزار آدمیوں کے لشکر جرار کی نسبت صرف تین سو تیرہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت زیادہ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔

---

[1] یہ مضمون نومبر میں موصول ہوا تھا لیکن عملہ کی غلطی سے دسمبر یا جنوری میں شائع نہیں ہوا (مدیر)

مستقبل قریب میں ہر شخص کو ماننا پڑیگا کہ برج ادب سے نکل کر آسمانِ صحافت پر چمکنے والا ستارہ درحقیقت ساقی ہی ہے۔

ساقی میں شائع ہونے والے مضامین بلحاظ رفعت تخیل اور باعتبار حسنِ بیان اُردو ادب کے بہترین نمونے ہیں اور زبان اور ادب سے مراد درحقیقت وہی نتائج افکار ہیں جو جذبات او طرز ادا کے لحاظ سے نہایت ارفع و اعلیٰ ہوں۔ کسی قوم کی معاشرتی اور تمدنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے اس قوم کے رسائل و جرائد کو مدنظر رکھا جاتا ہے کیونکہ انہیں کے ذریعے عوام کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے اور کتابیں تو خاص خاص ہستیوں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لہذا مورد الزام ہیں وہ مدیرانِ رسائل ادبیہ جو اپنے پرچوں کو مُرقع خرافات بنا لیتے ہیں اور ان مضامین کی اشاعت سے احتراز نہیں کرتے جو کسی ادبی رسالہ میں جگہ حاصل کرنے کے کبھی قابل نہیں ہوتے۔ ایسی خفیف الحرکتی کے صرف دو سبب ہو سکتے ہیں یا تو ان مدیرانِ رسائل کا ذوقِ ادب ہی پست سمجھنا چاہئیے یا بصورت دیگر وہ صاحبِ مضمون کی شخصیت سے مرعوب ہو کر غیر مناسب مضامین کی اشاعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ساقی کے صفحات ان جرائم سے پاک ہیں کیونکہ اس کا سرپرست ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے بہت سے افراد نے ہماری زبان بے زبان مجسمہ میں علم و ادب کی روح پھونکی ہے۔ اور قطع نظر اس خاندانی اعزاز کے مدیر ساقی بھی بذات خود ایک اعلیٰ ادیب ہیں۔

ابتدا میں ساقی کے اندر جلوہ افروز ہونے والی چند غیر معروف ہستیاں تھیں لیکن رفتہ رفتہ حاملانِ ادب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ نامور ادیب جو عام لوگوں کے رجحان طبع اور زمانہ کی سفلہ پروری سے بددل ہو کر صوفیائے کرام کی طرح گوشہ نشین ہو گئے تھے اور ہمیشہ کے لئے خامہ فرسائی سے اجتناب کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ اپنی نقاب الٹ کر ساقی کے صفحات میں شریکِ بزم ہو گئے اور ان کو اپنا عہد توڑنا پڑا۔ کیونکہ ؎

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

ساقی کے مضمون نگاروں میں یوں تو ہر شخص ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے لیکن چند ہستیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خان بہادر میرزا صر علی صاحب کے علمی مقالے۔ فرحت اللہ بیگ صاحب کا پرواز تخیل۔ فراق صاحب کی پاکیزہ بیگماتی زبان، حسن نظامی کے زمانہ غدر کے واقعات۔ سلطان حیدر جوش کا اسلوب بیان۔ افضل حسین چشتی کے علمی افسانے۔ جوش ملیح آبادی کی بلند پایہ نظمیں۔ جگر مرادآبادی۔ علی اختر۔ اختر اور آرزو لکھنوی کی غزلیں۔ علامہ مضحک اور سراج مچھلی شہری کی تنقیدیں۔ شاطر غزنوی کے ڈرامے وہ چیزیں ہیں جو اردو ادب میں ہمیشہ غیر فانی رہیں گی۔ علاوہ ازیں ساقی میں ہر شخص کی دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق کوئی شخص المیہ رومان پسند کرتا ہے تو کوئی دل خوش کن افسانے۔ کسی کو فلسفیانہ بحث اچھی معلوم ہوتی ہے تو کسی کو مزاحیہ مضمون۔ اگر راشد الخیری کی تحریر سے قارئین کے دلوں میں سوز پیدا ہو جاتا ہے تو عظیم بیگ چغتائی۔ ملا رموزی۔ شوکت تھانوی اور ایم۔ اسلم کی ظرافت نگاری روح میں تازگی پیدا کر دیتی ہے۔ رفیقی جمیری کی جدت طبع قارئین ساقی سے جس قدر خراج تحسین حاصل کر کم ہے۔ پھر فاضل مدیر اور مدیر مسئول بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ دیگر مدیران رسائل کی طرح وہ اپنے پرچوں کو صرف مرتب ہی نہیں کرتے بلکہ خود بھی مضامین لکھکر اردو ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

دار الاشاعت ساقی سے صرف ایک رسالہ ہی کا اجرا نہیں ہوتا بلکہ ساقی میں لکھنے والے حضرات کے مجموعۂ مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ فراق صاحب کے "چار چاند"، عظیم بیگ چغتائی کی روح ظرافت، روح لطافت، تفویعض، کولتار۔ افضل حسین چشتی

کی ”بیدقدر“ اور انتصار صاحب مدیر مسئول کی ”سلمیٰ“ ایسی کتابیں جو گذشتہ سال کے دوران میں شایع ہو کر اسقدر مقبول ہو گئیں کہ پہلا ایڈیشن ختم ہو کر دوسرے کی نوبت آگئی۔

وقت کی کم مائگی اور طوالتِ مضمون کے خوف سے چند ضروری باتوں کو بیان کرنے کے بعد میں مضمون کو ختم کر دینا مناسب سمجھتا ہوں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ رسالوں کے ایڈیٹر اپنے قارئین سے خریدار طلب کرتے رہتے ہیں لیکن آفرین ہے کہ خود دار مدیر ساقی نے اپنے خریداروں کے سامنے کبھی کشکول گدایانہ دراز نہیں کیا۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ قارئین ساقی کو بھی اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ رسالہ کی ترقی کے لئے چند خریدار فراہم کر دیتے۔ خیر ـــ ہرچہ باداباد ـــ آئندہ کے لئے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے[1] ـــ آج میں اپنے تمام ہم جلیس میکشانِ ادب سے ذاتی طور پر درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے دوستوں اور شناساؤں میں سے کم سے کم دو حضرات کو ساقی کا خریدار بنا دیں تاکہ وہ بھی اس مَے علم و ادب سے مخمور ہونے لگیں جو روح کی بالیدگی اور زندہ دلی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

[1] یہ بھی مسلک ساقی کے خلاف ہے (مدیر)





بے روزگاری سے نہ گھبرائیے
بلکہ
ایک کارڈ ڈالکر ہمارے پراسپکٹس مفت طلب فرمائیے

ہمارا کالج ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کالج ہے جو صرف پچاس۵۰ روپے داخلہ لیکر دو ماہ میں مکمل ڈرائیور اور فٹر بناتا ہے نیز ملازمت کی ذمہ داری کرتا ہے۔ کالج گورنمنٹ سے رجسٹری شدہ ہے۔

ہماری سند بی۔ اے کی سند سے بہتر ہے

کیونکہ

بی۔ اے پاس تو تلاش روزگار میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ لیکن ہمارے کالج کے پاس شدہ بیکار نہیں رہ سکتے، کیونکہ سوائے ہمارے اور کوئی کالج ملازمت کی ذمہ داری نہیں کرسکتا۔ کسی کالج میں اس وقت تک روپیہ نہ دیجئے جبتک خود آنکھ سے نہ دیکھیں، ورنہ پچھتانا پڑیگا۔ پتہ صاف اور ساقی کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ملنے کا پتہ

امپیریل موٹر ٹریننگ کالج متصل امپیریل بنک چاندنی چوک دہلی

بواسیر

خونی ہو یا بادی نئی ہو یا پرانی، خراب سے خراب بواسیر ہو صرف ایکبار کے استعمال سے جادو کے مانند اثر کر کے عجیب فائدہ پہنچاتی ہے تین روز میں جڑ سے ناس پرہیز کی کوئی ضرورت نہیں زیادہ تعریف فضول ہے فائدہ نہو تو چوگنے دام واپس، قیمت دو روپے (عگار)

بہراپن

کان کے تمام روگوں پر جیسے کان بہنا، خلن، کھجلی، کان میں بڑی شاں شاں یا بہرا پن وغیرہ کو ناس کرنیمیں ہمارا جادو اثر بہرا دی چن تیل نایاب چیز ہے ہزاروں کم سننے والے اچھے ہوچکے ہیں فائدہ نہ ہو تو دام واپس قیمت دو روپے (عگار)

پتہ۔ شکتی اوشدھالیہ کاریالیہ چوتھا کمہار واڑہ بمبئی ۴



ہمیشہ گھر میں رکھنے کی دوا

اِنڈوبام

بدن کے تمام دردوں کا نہایت مشہور معروف علاج صرف ایکدفعہ کے آزمایش بعد آپ دوسروں سے بھی لینے کی سفارش کرینگے قیمت فی ڈبی ۸ر خرچہ علاوہ۔

ہر ایک دوکان پر مل سکتا ہے

مفت

پتہ کرنک برادرس۔ گرگانوں بمبئی ۴۔ دو آنہ کا ٹکٹ کوپن کیساتھ روانہ ہوتا ہے براہ کرم ایک نمونہ ڈبی اور ۱۹۳۸ء کا کلینڈر ہمارے واسطے بھیجدیں

نام ....

پتہ ....

سول

جرمنی کو جنگ عظیم میں سب سے زیادہ جو ہتھیار کام آیا وہ نہ توپ تھی اور نہ گن مشین تھی
بلکہ صرف سول پستول تھا جس سے بلا کسی تکلیف پہنچانے کے چشم زدن میں ہر ایک جاندار
کو بے جان کر دیا



جرمنی سے یہ پستول پہلی مرتبہ ہندوستان میں آیا ہے اس کے مقابل میں دنیا کے بڑے سے بڑے ہتھیار بالکل بے کار ہو جاتے ہیں، اس پستول کا جونہی گھوڑا دبایا جائے فوراً ہی ایک خاص قسم کا بجلی کا کرنٹ نکل کر ہر ایک جاندار چیز کو خواہ کتنی بھی خطرناک ہو ۵ امنٹ کے لئے قطعی اندھا کر دیتا ہے۔ یعنی سامنے والے جس قدر جان دار ہوں انکی آنکھوں پر اس بری طرح اثر پڑتا ہے کہ ۵ امنٹ تک قطعی اندھا ہونیکے علاوہ بالکل بے جان سا ہو جاتا ہے اس عرصہ میں کسی چھوٹے سے چھوٹے بڑے سے بڑے خونخوار جانور پر نہایت اطمینان سے قابو پا سکتے ہیں۔

رات دن جس قدر استعمال کیا جائے ہرگز ہرگز خراب نہیں ہوتا۔ یقین مانئے ایسی انسانی جان بچانے والی چیز بے ضرر ہرگز ہرگز دنیا میں کہیں نہ ملے گی، اس پستول پر کسی قسم کا ہندوستان میں لائسنس نہیں ہے جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں، اور وقت ضرورت کام میں لا سکتے ہیں۔ ۶۔ انچ لمبا اور چار (۴) اونس وزن ہے، جیب میں بآسانی آسکتا ہے اور ہر وقت رات اور دن میں ہر ایک جاندار پر چشم زدن میں قابو پا سکتے ہیں۔ گویا جس جاندار چیز کو چاہا ۵ امنٹ تک اندھا اور بے کار کر دیا۔ ہر شخص کے پاس اس کا رہنا بے حد لازمی ہے۔ آج ہی ایک عدد منگا کر ہماری تحریر کو لفظ بہ لفظ آزمائیے۔ قیمت فی عدد ۶/-/- (چھ روپے) محصول ڈاک ۸/

ہندوستان برما سیلون کے لئے

اے۔ ایچ۔ فرانسس اینڈ کو پوسٹ بکس 612 بمبئی

جُرعات

جلد ۶ ساقی دہلی بابت دسمبر ۱۹۳۲ء نمبر ۶

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اوّلین	"شاھد"	(۲)
(۲)	زندگی بھی ایک معرکہ ہے	جناب خان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی	(۷)
(۳)	انارکلی پر ایک نظر	جناب مخلص دہلوی	(۹)
(۴)	بہار	جناب ماہر القادری	(۱۹)
(۵)	غالب کے ایک شعر کی تشریح	جناب مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم	(۲۰)
(۶)	جُرعاتِ تسنیم	جناب تسنیم مینائی	(۲۲)
(۷)	دُنیا اور مطلب	جناب اسعد الاشرفی العرشی الدھلوی	(۲۳)
(۸)	لطائفِ تاباں دہلوی	جناب اعظمی اجمیری	(۲۵)
(۹)	غزل	جناب سیّد مقبول حسین احمد پوری بی۔اے	(۳۵)
(۱۰)	ہمارے تعلیمی نصاب پر ایک نظر	جناب نصیر الدین ہاشمی	(۳۶)
(۱۱)	دل کے ٹکڑے	"ج"	[illegible]
(۱۲)	غزل	جناب عبد الجلیل سائل	[illegible]
(۱۳)	ڈھیلے	جناب علی اختر اختر	[illegible]
(۱۴)	حکیم جی کا چھلّا	جناب ایم۔ اسلم	[illegible]
(۱۵)	بُوڑھا چاچا	جناب تنویر قریشی	(۴۹)
(۱۶)	اقرارِ محبت	جناب انصار ناصری بی۔اے دہلوی	(۵۵)
(۱۷)	نگہِ شوق کی شکایت	جناب نواب ابو الحسن صاحب بلگرامی	(۵۶)
(۱۸)	لال کُرتا	جناب محمد منظور صاحب	(۵۷)
(۱۹)	جذبۂ تخلیق	جناب فضل حق قریشی دہلوی	(۶۵)
(۲۰)	داد کا شکریہ	جناب اعظمی اجمیری	(۶۸)
(۲۱)	بال کا پھندا	جناب تنویر قریشی	(۶۹)
(۲۲)	ریزۂ مینا	جناب انصار ناصری بی۔اے دہلوی	(۷۰)
(۲۳)	نقد و تبصرہ	......	(۷۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

جامعہ ملیہ دہلی کا یومِ تاسیس اور مشاعرہ

۲۹ اکتوبر کو جامعہ ملیہ دہلی میں یوم تاسیس کا جلسہ تھا منجملہ دیگر امور کے اس جلسہ میں ایک غیر طرحی مشاعرہ بھی شامل تھا۔ ہم چونکہ ذرا دیر سے پہونچے تھے اس لئے پہلے تو ہمیں یہ سزا ملی کہ آدھ گھنٹے تک کھڑے رکھے گئے۔ اسکے بعد آدھ گھنٹہ کا وقفہ دیا گیا جس میں آخری کرسیوں پر ہمیں جگہ مل سکی اور وہ جگہ بھی خوش قسمتی سے ہمیں یوں مل گئی کہ چند علم دوست حضرات نے جو شاعری کو "شاعری کار بیکاران است" تعبیر فرماتے ہیں اپنا وقتِ عزیز مشاعرے میں ضایع نہ کرنا چاہا۔ ایک تو ارکانِ جامعہ کا خلوص دوسرے عزیز دوستوں کا تقاضا ہمیں بھی اس جلسہ میں شریک ہونا پڑا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مشاعرے کی ایک مختصر سی روئداد آپ کے سامنے پیش کر دیں تاکہ جو لطف ہم نے اُٹھائے ہیں آپ بھی اُن سے محروم نہ رہیں۔

وقفہ کے بعد مشاعرے کی ابتدا ہوئی۔ ایک صاحب جن کو قدرت نے بہت ہی مختصر پیمانہ پر بنایا تھا۔ اسٹیج پر تشریف لائے، سامعین کی طرف انہوں نے نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ لہولت کے ظالم ہاتھوں نے گویا انہیں نچوڑ کر کھڑا کر دیا ہے۔ نہ معلوم ان بزرگ کے اسٹیج پر رونما ہوتے ہی ہال مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے کیوں بھر گیا۔ شیخ الجامعہ نے کچھ کہکر آپ کا تعارف کرایا اور آپ نے ناک کی پھننگ پر رکھی ہوئی عینک میں سے دیکھکر ایک رباعی پڑھی جس میں اُنہوں نے طبیہ کالج کی قسم کھاکر کہا کہ "جامعہ ملت کا شفا خانہ ہے" مضمون آفرینی کی داد اس کثرت سے ملی کہ شاعر صاحب اس رباعی کو مکرر پڑھ گئے اور سوائے چند لوگوں کے اسے کسی نے نہ سُنا۔ اِسکے بعد آپ نے دو رباعیاں اور پڑھیں مگر پہلی رباعی دماغوں پر اس قدر طاری و ساری ہوگئی تھی کہ ان دو رباعیوں کے سمجھنے کے لئے گنجایش ہی نہیں رہی تھی۔ انصار صاحب نے کہا "طبیہ کالج کی بجائے ایڈیٹر کی قسم کھاتے تو قسم میں بہت زور پیدا ہو جاتا"

ان کے بعد دہلی کے ایک مشہور شاعر نے ایک نظم پڑھی جس میں انہوں نے طنزیہ پیرایہ میں مسلمانوں کی ترقیِ معکوس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے غیرتِ قومی سے اپیل کیا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ یہ چٹکیاں تھیں جو ہر مسلمان کے دل میں لی جا رہی تھیں کہ اب بھی آنکھیں کھول کر اپنی پستی کو دیکھ لو ورنہ اس غفلت کی دلدل میں یونہی دھنستے چلے جاؤ گے۔ قوم کی حالت پر محض آنسو بہانے سے کام نہ چلیگا۔ اُٹھو پہلے اپنے اخلاق اور اپنی سوسائٹی کی اصلاح کرو اور پھر قوم کو اس دھنسن سے نکالنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

تیسرے شاعر ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو نظم و نثر پر یکساں طور پر عبور حاصل ہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی نظمیں اور غزلیں اکثر سنی اور دیکھی ہیں لیکن اس مشاعرے میں ڈاکٹر صاحب نے جو نظم سنائی اس کی مثال بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی گول چیز کو چوکور سوراخ میں ٹھیک بٹھانے کی کوشش کرے۔ ڈاکٹر صاحب کی متین طبیعت اور سنجیدہ کلام سے یکسر جدا یہ نظم عریانیوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک پری سے تخاطب کرتے ہوئے لفظ "پیاری" کا استعمال اس نظم میں اس کثرت سے کیا گیا تھا کہ جناب فضل حق قریشی نے نظم ختم ہوتے پر بیساختہ کہا "دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب نے اپنا تخلص کس خوبصورتی سے جا بجا بٹھایا ہے؟"

ہمارے برابر بیٹھے ہوئے دو "کرنداروں" میں سے ایک نے بیٹے نوجوان کے دھوئیں کا ایک بادل ہوا میں معلق کیا اور پھر دمے کی کھانسی کھانستے ہوئے فرش پر تھوکا اور کہا "اب شاعر بے چارے نوجوان بھی نہ جوتوں کا خیال نہ بچوں کا لحاظ" پھر ہماری طرف مخاطب ہو کر پوچھا "لیوں جی یہ کون ہیں کوئی باہر والے ہیں؟" اس سوال کا جواب خاموشی سے دیا جا سکتا تھا اس لئے ہمیں ان سنی کر دی گئی ہم سے اگلی قطار میں ایک دو ریش دراز نابینا بیٹھے تھے۔ جب تک یہ نظم جاری رہی آپ ہماری طرف منہ پھیرے نمائش دندان کرتے رہے۔ ایک تاریخ عہد ..... جنٹلمین جب بھی "پیاری" کا لفظ آتا Shame اور Nonsense "شرم" اور "لغو" اور اسی قبیل کے نعرے لگاتے رہے۔ غرض ہم نے محسوس کیا کہ ابھی ہماری سوسائٹی اتنی عریاں نگارش کی متحمل نہیں ہو سکتی اور ڈاکٹر صاحب کی نظم موقع اور محل کے اعتبار سے قطعاً نامناسب رہی اور ناپسند کی گئی۔

ان کے بعد ایک ضعیف العمر مولوی صاحب مع ایک عدد دراز ریش حنا مالیدہ ڈائس پر نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظم پر چہ میگوئیاں ہنوز زور و شور سے ہو رہی تھیں اور ہماری تنقید بھی ابھی جاری تھی کہ ممبر صاحب نے جھنجھلا کر کہا "بھئی اب تو چپکے ہو جاؤ، لال جھنڈی ہلائی جا رہی ہے" ہم خاموش ہو گئے اور سیدھے ہو بیٹھے۔ مولوی صاحب نے چھوٹتے ہی اپنی ایک فارسی غزل کا مطلع ہمارے دماغ پر دے مارا اور ابھی ہم اس کے صدمے سے جانبر نہ ہونے پائے تھے کہ اسی غزل کی تضمین کے ہتھوڑے ہم پر برسا دیئے۔ یہ ٹھیک بارش ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اردو غزلوں کے نشتر پے در پے عریاں کئے گئے اور ان سے سامعین کو خوب کچوکا گیا۔ ہم پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور اگر یہ سلسلہ دراز ہوتا تو انشاء اللہ فنا کے گھاٹ بھی اتر جاتے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مولوی صاحب کو خود ہی کچھ ہم پر رحم آ گیا۔ انہوں نے ہمارے مشاعرے میں شریک ہونے کے قصور کی اتنی ہی سزا کافی سمجھی ورنہ ہمارا جرم تو اس لائق تھا ہی اگر گردن زدنی نہیں تو کم از کم عبور دریائے شور کی سزا ضرور ملنی چاہیئے تھی۔ غرض ہمیں ہوش میں لانے کے لئے یہ تدبیر کی گئی کہ مولوی صاحب ہماری نظروں کے سامنے سے ہٹ گئے اور سارے گھر (HOUSE) نے بیک وقت ملکر اپنی پوری طاقت سے تالیاں بجائیں جس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔

مولوی صاحب کے بعد ایک صاحب کے نام کی آواز پڑی۔ سب سے اگلی قطار میں ایک بے پھندنے کی ٹوپی متحرک ہوئی اور پھر ایک لٹ پٹی ڈاڑھی سے ڈھکا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ آیا سر اور دھڑ کا اتصال بہ منزلۂ گردن تھا یا نہیں۔ بہرحال یہ ترکی ٹوپی اور داڑھی بقدر نصف قد آدم بلند ہوئی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان دونوں

چیسنڈوں کا مالک بنفس نفیس ڈائس کے ایک سرے پر میر فرش کی طرح جا بیٹھا۔ فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ با ایں تن و توش اس مرد معقول میں سے جو آواز صادر ہوئی گو پٹھے کے وجود اور ڈاڑھی سے بے نیاز تھی۔ غزل کے اشعار نے متبسم چہروں کو مشتاق و منتظر بنا دیا۔ اور سب کو باور کرا دیا کہ اس سب پھندنے کی منڈھی ہوئی ترکی ٹوپی کے نیچے جو چیز ہے وہ غیر معمولی قابلیتوں سے معمور ہے۔ ہر شعر پر ہال تحسین کے شور سے گونج اٹھتا تھا۔ تین غزلوں کے بعد ترکی ٹوپی اپنی پہلی جگہ پر آگئی اور لوگوں کے دلوں میں ابھی اور کچھ سُننے کی حسرت باقی رہ گئی۔

انکے بعد ایک اور صاحب تشریف لائے جنکی صورت ہی سے شاعری ٹپکتی تھی۔ آپ نے ترنم میں ایک غزل سُنانی شروع کی جس کا ہر ہر شعر دل و جگر میں اترتا چلا جاتا تھا۔ کلام میں غضب کی جدت اور بلا کی رنگینی تھی۔ شاعر نے موسیقی کی اصطلاح میں سُر اتنا اونچا قائم کیا تھا کہ اشعار اٹھاتے وقت جسمانی قوتیں ساری کی ساری سمٹ کر گلے میں آجاتی تھیں۔ ریش حنا مالیدہ کے مالک کا نظارہ اسوقت دیدنی تھا۔ رقص بسمل سُنا ہی سُنا تھا آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ شاعر کی بلند آواز پر اگر اور کوئی آواز چھا جاتی تھی تو وہ "اے سبحان اللہ" کی تکرار تھی جو اسی بسمل کی نالہ و بکا تھی۔ شاعر صاحب نے نہایت بے توجہی سے "آواز نہ چلنے" کا عذر پیش کیا اور سینکڑوں نفوس کی پرخلوص استدعا کا احترام نہ کرتے ہوئے اپنی سابقہ جگہ پر صد درجہ متانت کے ساتھ جا بیٹھے۔

ان کے بعد ایک بہت ہی منحنی سے آدمی لکھنوی وضع قطع کے تشریف لائے اور انہوں نے اپنے خاص ڈھنگ سے غزل سُنانی شروع کی۔ بہت مشاقی اور راس پیٹر زبان۔ غزل کا ہر مصرعہ زبان زد ارباب معلوم ہوتا تھا۔ غزل ختم ہو چکی تھی دوسری غزل کا مطلع پڑھا گیا۔ پہلا مصرعہ تو نغمہ بن کر فضا میں پھیلا مگر افسوس کہ دوسرا مصرعہ انہوں نے قریب بیٹھے ہوئے چند حضرات کے کانوں میں جھک کر کہدیا۔ اس محرومی پر چند آوازیں ایسی بلند ہوئیں جیسی مذبح میں نیم گلو بریدہ چوپایوں میں سے صادر ہوتی ہیں۔ اسی بیچ "پھر فرمائیے" اور "مکرر" کی صدائے احتجاج بھی اکثر گلوں سے نکلکر شامل ہوگئی اور باہمی استفسارات کا شور "کیا کہا۔ کیا کہا" کی صورت میں جمع ہوگیا۔ بدقسمتی چونکہ اب بھی شریک حال تھی اسلئے شاعر نے اس شور و ہنگامہ کو اپنے شعر کی داد سمجھا اور ہم نے دیکھا کہ ہاتھ ہے کہ بے تحاشہ متحرک ہے گویا ایک کمانی لگ گئی ہے جو اس تیزی سے حرکت دے رہی ہے کہ نظر اسکی جنبش کا ساتھ نہیں دیتی۔ غرض جبتک ہنگامہ برپا رہا کمانی نے اپنا فعل نہ چھوڑا اور دوسرا مصرع دریا برد یا گاؤ خوردہ ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سانحے کے بعد اور کوئی مصرع کانوں کی محدود وسعت اور دیر آ نہیں ہونے کا گیا۔ غزلیں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر رہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ اساتذۂ لکھنؤ میں سے ہیں اور غزل کہنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

اب آخری شاعر صاحب تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ آپ نظم خصوصیت سے بہت عمدہ کہتے ہیں۔ باوجود گھر کے ہونے کے آپ میں لکھنویت کے آثار بالکل نہیں پائے جاتے تھے۔ نظم شروع ہوئی اور ابتدا ہی سے اسقدر دلکش و موثر تھی ہر شعر پر تحسین و آفریں کے نعرے لگ رہے تھے۔ نظم قومی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور قوم کے انحطاط کا نقشہ سُننے والوں کی آنکھوں کے سامنے بتدریج کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت شاعری اور مصوری کا امتیاز اٹھ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا

کہ ایک جانب ست مصور قرطاسِ ذہن پر ایک سسکتی ہوئی قوم کی تصویر بنا رہا ہے۔ بالآخر یہ تصویر یوں مکمل ہوتی ہے کہ ایک نعش سامنے پڑی ہوئی نظر آتی ہے جس پر کچھ مُردہ خوار پرندے منڈلا رہے ہیں اور کچھ کاٹتے تیزی سے اُتر رہے ہیں۔ مصور کا تخیل یہیں ختم ہو گیا لیکن دیدۂ باطن نے اِسی تصویر میں کچھ اور بھی دیکھا ـــــ دو متحرک سائے ایک "عظمت" کا اور دوسرا "عبرت" کا۔ "عظمت" نعش کے پہلو میں کھڑی ماتم کر رہی ہے اور "عبرت" سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ اور پھر کسی نامعلوم ہاتھ نے جلی حروف میں اس تصویر کا عنوان لکھ دیا "قوم کی نعش"۔

حاصلِ مشاعرہ یہی چند نظمیں تھیں اور اب تک مشاعرے میں شریک ہونے سے ہمیں جو روحانی اذیت پہونچی تھی اِن نظموں نے اسے یک لخت دور کر دیا۔ مشاعرہ ختم ہوا اور ہم اس شاعر بے مثل کو دعائیں دیتے اپنے گھر کو سدھارے۔

ساقی کی چھٹی جلد اس اشاعت کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ساقی نے اپنی زندگی کے تین سال حسن و خوبی پورے کیے اور اس کی سالگرہ کی تقریب میں نئے سال کا پہلا پرچہ سالنامہ کی صورت میں شایع کیا جائیگا۔ مضامین کے اعتبار سے ساقی کے خاص نمبروں نے جو شہرت حاصل کی ہے اعادہ کی محتاج نہیں ہے۔ سنہ ۳۳ء کا سالنامہ بھی اِنہی خصوصیات کا حامل ہوگا جو ساقی کی روشِ خاص سے عبارت ہیں۔ تصاویر کے انتخاب میں پنجاب کے دو مشہور اہلِ نظر حضرت ایم۔ اسلم اور پروفیسر تاثیر ہمارے معاون ہیں۔ غرض ہر لحاظ سے سنہ ۳۳ء کا سالنامہ گذشتہ خاص نمبروں سے بڑھ چڑھ کر شایع ہوگا۔ سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے لیکن مستقل خریداروں کو "ظریفت نمبر"، "افسانہ نمبر" اور "دلی نمبر" کی طرح سالنامہ بھی تحفتاً دیا جاتا ہے۔

مفت راچہ گفت۔ ڈاکخانے والے علی العموم خاص نمبروں کے اور علی الخصوص سالناموں کے شوقین ہوتے ہیں۔ سالنامہ کو اُن کی دستبرد سے بچانے کے لئے ہم نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ مستقل خریداروں کو سالنامہ بذریعہ رجسٹری بھیجیں۔ چونکہ رجسٹری کی فیس تین آنے ہے اس لئے ہر خریدار کے پاس تین آنے کا وی پی بھیجا جائے گا۔ کسی صورت میں بھی سالنامہ بلا رجسٹری نہیں بھیجا جائے گا۔ جو حضرات اس تین آنے کے وی پی کو واپس کر دیں گے اُن کو دوبارہ طلب کرنے پر سالنامہ چھ آنے کا وی پی بھیجا جائے گا۔ سالنامہ انشاءاللہ جنوری کے پہلے ہفتے میں پوسٹ کر دیا جائیگا اِس لئے جن حضرات کا چندہ ابھی باقی ہے اُن سے اطلاعاً عرض ہے کہ سالنامہ بذریعہ وی پی (قیمتی ۳ر) ارسال کیا جائیگا۔ اور جن حضرات کے چندے دسمبر میں ختم ہو گئے اُن کے نام سالنامہ بذریعہ وی۔پی (قیمتی عہ ۔ سالانہ چندہ) بھیجا جائیگا۔

حیدر آباد سے ایک مخلص کرمفرما نے مجھے لکھا ہے کہ مقامی "نسوانی آرگن" نے اپنی گندہ گندگیوں میں مزید اضافہ اس طرح کیا ہے کہ ساقی اور ادارۂ ساقی کو پانی پی پی کر کوسا ہے اور بازاری عورتوں کی طرح گالیاں دی ہیں۔ اِس

"نسوانی آرگن" کا مالک مجھ سے پانچ ماہ ہوئے حیدرآباد میں مل چکا ہے اور میں اِس عورت نما مرد یا مرد نما عورت کو اُسی دن سے قابلِ رحم سمجھتا ہوں۔ از کوزہ ہمیں تراود کہ در اوست۔ موری میں عطر بہتا کبھی نہیں سُنا میں اس صادق قریشی کا نقلی چہرہ لگانے والے لڑکے کو بتانا چاہتا ہوں کہ ساقی کے بادۂ تند و تیز کے لئے "ظرف" کی ضرورت ہے۔ "نسوانی آرگن" کا مقصد جُدا گانہ ہے۔ اِسی لئے آپ بہک نکلے۔ "نسوانی آرگن" کا مقصد ہے "چھیڑ خوباں سے چلے جائے اسدؔ" اور ساقی سرے سے اسکو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا ؎

صورت آئینہ ہے مجھ میں صفا کا جوہر ۔۔۔ جو ہے جیسا اُسے ویسا ہی نظر آتا ہوں

جناب علوی سلطان پورہ حیدرآباد دکن نے ایک کتاب شایع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جس میں کُل ہندوستانی فلم ایکٹرز اور ایکٹریسوں کے سوانح حیات اور تصاویر شامل ہوں گی۔ چونکہ یہ کام ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے اس لئے علوی صاحب مدیرینِ رسائل سے بھی استمداد چاہتے ہیں۔ دنیائے فلم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ تذکرہ معلومات کا ایک وافر ذخیرہ ہوگا۔ ناظرینِ ساقی اگر علوی صاحب کا ہاتھ بٹا سکتے ہوں تو ہر ممکن امداد پہونچائیں۔ میں اپنی نوبت کہتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ہندوستانی فلم ایسا نہیں دیکھا جس کے دیکھنے کے بعد مجھے اپنے وقت کے ضایع ہونے کا افسوس نہ ہوا ہو۔ ہندوستانی "اسٹارز" خواہ اُس کا تعلق صنفِ لطیف سے ہو خواہ صنفِ کثیف سے، کی ایکٹنگ کا تو ذکر ہی کیا ایک اپنی زبان ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس کا کھوجڑا کس بیدردی سے کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات تو اِس ناکردہ گُناہ کو اُلٹی چھُری سے اِس سفاکی سے حلال کیا جاتا ہے کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے اِس دیسی دُنیائے فلم سے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں ہے۔ کبھی موقع ملا تو کسی بہتر عنوان سے دیسی فلم کی کمزوریاں اُبھار کر دکھاؤں گا کیونکہ ساقی اُردو کا علمبردار ہے اور خاموشی سے اپنی زبان کو یوں ذبح ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔

"شاھد"

زندگی بھی ایک معرکہ ہے

از جناب جان بہادر میر ناصر علی صاحب دہلوی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

انسان کی خلقت کی نسبت مختلف عقیدوں کا ذکر چھوڑ کر ابتدائے آفرینش میں اگر آپ انسان کو دیکھئے تو دریا کے کنارے درخت کے سائے میں پاؤں پھیلائے نظر آتا۔ نہ اس کو کسی کا فکر نہ کسی کو اس کا فکر تھا نہ غمِ دزد نہ غمِ کالا۔ جس سے معلوم ہوتا کہ نہ اسے نیچر (عالمِ اسباب) سے غرض ہے نہ نیچر کو اس سے۔ دونوں ایک دوسرے سے بیفکر بے دماغ عیش و آرام سے بیٹھے ہیں لیکن نہیں، نیچر انسان کو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے نہیں دیا چاہتی۔ یہ کیوں؟ اسلئے کہ زندگی نام ہے حرکت کا۔ بیجان حرکت نہیں کر سکتے جان کیلئے جنبش ضرور ہے۔ سکتہ میں آئینہ دکھاتے ہیں کہ ذرا بھی جان ہوگی تو حرکت سے معلوم ہو جائیگی۔ زندہ اور مردہ کا امتیاز صرف حرکت سے ہو سکتا ہے۔ حرکت اور کام مرادف ہیں اور زندگی کا نتیجہ کام ہے۔

اب دیکھئے نیچر انسان کو کس طرح حرکت میں لائی؟ اس طرح کہ خود جنبش کی اور ناچار انسان کو جنبش کرنی پڑی۔

انسان نے دیکھا کہ سورج جو صبح سے چلا تھا شام کو ڈوب گیا ہوا چھپ گیا۔ انسان کو سوجھی کہ ہمیں بھی کہیں چلنا چاہیئے کہ رات کو کوئی جانور آگیا تو اندھیرے میں دکھائی نہ دیگا۔ اور ہمیں کھا جائیگا۔ اس لئے وہاں سے سرکے۔

غذا جو صبح کھائی تھی وہ دوپہر کے بعد ہضم ہو گئی یعنی جزوِ بدن ہو گئی گویا نقل مکان کر گئی جسے حرکت کہیئے۔ اب پھر کھانے کو نہ ملا تو بھوک سے مرنا ہوگا۔ ان ضرورتوں سے انہیں زندگی کے لئے جنبش کرنی پڑی۔ اب نکلے تو نئے نئے طریقوں سے فکر میں سے بڑے بڑے کام بنگئے یعنی اعضا میں توانائی آگئی اور فکر میں دُور دُور کی سوجھی کہ دوسرے دن دیکھا تو بہار ری ہے اور لوگ بھی اسی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ ان سے بازی لیجانے میں بڑی بڑی تدبیریں کرنی پڑیں اور جہاں تک دُور کی سوجھی گئی انسان اپنے ذہن میں ترقی کرتا گیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو مر جاتا؎

منظور ہو جو چھپ کے ترقی تمہیں مری یوں بڑھ چلوں کہ نشو و نما کو خبر نہ ہو

انسان کو پہلے تو نیچر سے لڑنا پڑا پھر اپنی برادری سے کہ انسان انسان کو مار لیتا۔ کمزور زبردست سے بھاگتا یا چھپ جاتا ہے چھپنے میں درخت کی آڑ بڑی پناہ لی سمجھیے۔ اس چھپنے پھرنے میں اتفاق سے درخت کی ٹہنی ہاتھ آگئی یا بھاگتے میں کوئی ٹہنی ٹوٹ پڑی تو گویا مقابلہ کیلئے سامان مل گیا۔ یہ آغاز لاٹھی سے کرپ کی توپ تک کا ہے اس درخت کی ٹہنی جو اتفاق سے ہاتھ لگ گئی تمام ہتھیاروں کی گویا پردادی (مورثِ اعلیٰ) کہنا چاہیئے۔

اب لکڑی لیکر چلنے میں کمر سیدھی کرنیکی ضرورت اور آسمان و زمین کے قلابے ملنے لگے۔ کوئی ٹہنی ٹوٹنے میں اگر نکیلی نکل آئی تو برچھی کی ایجاد ذہن میں آگئی اور درخت سے ٹہنیاں توڑ توڑ کر حریف پر پھینکنا۔ نیزہ و برچھی چلانے کا آغاز ہوا اور جب ٹہنی نہ ٹوٹی تو کچے پکے پھل پھینک کر مارنا گولی بارود کا مقابلہ ٹھہرا۔ اتفاق سے کسی ٹہنی کی نوک پتھر کی رگڑ سے تیز ہو گئی تو نکیلے پتھر ڈھونڈھ کر لکڑیاں تیز ہونے لگیں۔ یہ چاقو کی ایجاد سمجھیے جس میں خنجر، تلوار، کٹار سب آگئے۔

جنگ زندگی کا علم گویا سائنس تھا آج سے آرٹس کو یا فنون شروع ہوئے۔ جو شخص نوک دار چیزیں زیادہ دور پھینکنے لگا زیادہ ہوشیار سمجھا گیا۔ اِس سے تیر و کمان و نیزہ بازی و غلافن وغیرہ پیدا ہوئے۔

اِنسان کو جس طرح اوروں کے مارنے کی تدبیریں سُوجھیں اپنے بچانے کی بھی تدبیریں سوچنی پڑیں جنگل میں سب سے بڑی آڑ درخت کی ہے۔ یہ گنجان ہوئے تو اِن کے اِرد گرد کی آڑ سے حفاظت ہوئی۔ جب اِنکی آڑ چھوٹی تو اِنہیں کی شاخیں آڑ کے لئے ساتھ لیں یہ گویا ڈھال کا کام دیتیں یہ ڈھال و قلعہ و ذرہ وغیرہ کا آغاز سمجھئے۔

بہشت کو بہشت کا پہلا حکم یہ ہے کہ رہو بسو دا توں کو خدا سے سمجھو۔ نیچر کا پہلا حکم یہ ہے کہ تو کھو کا نہ رہ۔ ادنیٰ درجے کے جاندار ولائی کیڑے مکوڑوں میں یہ محض رُکن معلوم ہوتے ہیں صرف انکے معدہ میں حس ہوتا ہے۔ مخلوق میں سارے حیوانات معدے سے جیتے ہیں۔ ہر ذی حیات پیٹ کے پھندے میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ایک دفعہ کھانے پینے سے فارغ ہونیکے بعد بھی پھر اس میں آکر پھنستا ہے۔

اس بات دِن کی معرکہ آرائی سے تکلیف ہوتو ہوا کرے، مگر اِس بات کا فیصلہ کہ اِس کشمکش سے انسان کے ساتھ دراصل سلوک کیا گیا، تکلیف دی گئی یا بھی مشکل ہے، جب تک کہ اس کا انجام معلوم نہ ہو جسے عاقبت کہتے ہیں۔ عاقبت کا آغاز موت سے شروع ہوتا ہے۔ جانوروں میں موت کے یہ معنے ہیں کہ قوتِ ضعیف ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے دوسروں کی زندگی کا سبب ہونا اچھا ہے۔ یعنی یا نور جانور کی غذا ہو جائے۔ جانوروں نے اپنی ہستی کا مآل بُرا نہیں رکھا۔ انسان بھی اپنی زندگی سے کوئی ایسا ہی کام لے یعنی دوسروں کی زندگی کا سبب بنے اور بندگان خدا کے کام آوے ؎

سب سے چھپا کے آپ اُٹھائیں ہماری لاش پر یہ نہ ہو کہ اہلِ وفا کو خبر نہ ہو

انسان کا پہلا نقشہ حیوانیت سے متعلق تھا۔ اب انسانیت شروع ہوئی۔ اِس کی زندگی کا دور دُسرِ دُنیا کے لئے نیک فال ہے۔ اس کی زندگی طوفان سہی مگر طوفان بے تمیزی نہیں۔ اس کی پریشانی میں پریشانیٔ زلفِ یار کا لُطف ہے۔ شروع میں تو اِس نے محض حیوانیت سے کام لیا کہ طاقت، چالاکی، مکر و فریب سے زندگی بسر کی۔ اِس کے بعد آدمیت سے کام پڑا کہ رزّاقِ مطلق ؎

بناداں آنچناں روزی رساند که دانا اندراں حیراں بماند

توانا روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نادانوں کو سوسائٹی پال رہی ہے۔ بیماروں کو چارپائی پر پڑے پڑے دَوَا مل رہی ہے اور تندرستوں کو محنت مزدوری کر کے بھی پیٹ بھرنے روٹی نہیں ملتی۔ پہلوان بوعمرہ اور رسُوئے ہضمی سے مرتے ہیں اور فاقہ کشوں کو درد سر بھی نہیں ہوتا۔ دولتمندوں کو ہر طرح کے عیش پر بھی چین نہیں اور محتاج بہشت کے دعویدار ہیں ؎

تو نیست ہو کہ ہست ہو پر بے لگا ذرہ ہو یا نہ ہو بقا کو فنا کو خبر نہ ہو

"انارکلی" پر ایک نظر[1]

(ایک مخلص کے قلم سے)

سید امتیاز علی صاحب تاج نے انارکلی ایک اُردو ڈرامہ لکھا۔ اور اسے مس حجاب اسمٰعیل کے نام سے معنون کیا ہے۔ یہ تین ایکٹ کا موضوعی (سب جیکٹو) ڈرامہ ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پدماوت سنا رہے ہیں۔

جس ظاہری سج دھج سے یہ ڈرامہ شائع ہوا۔ اسکو دیکھتے ہی خیال ہوا تھا کہ معنوی لحاظ سے بھی وزنی ہوگا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان معنوں بڑی مایوسی ہوئی۔ مایوسی تو خیر اُردو کی اور بہیتوں آمیز فانت سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن انارکلی کو ٹریجڈی لکھ کر تاج صاحب نے جس ہنج خاص سے ارباب ذوق کو مایوس کیا بلکہ دُکھ دیا۔ یقین جانیئے کہ وہ ہرگز چپ چاپ سہہ لینے کی بات نہیں۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ میں اس ڈرامہ پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ تاج صاحب آیندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ کریں تو بڑا احسان ہو۔ کیونکہ ان کو ... وہ اپنی ادبی حیثیت کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ۱۹۲۲ء سے جب میدان میں پیش ہوئے تھے۔ وہ دس بارہ برس کے بعد ہی ان کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ ایسا ادبی دہوکا بن کر رہ گیا ہے اسے آگے چل کر وہ سب اپنی آنکھوں دیکھیں گے مگر اس سے میری یہ مراد ہی نہیں کہ سرے سے وہ لکھنا پڑھنا ہی چھوڑ بیٹھیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ یا تو ذمہ دار لٹریچر سے وہ کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اور اگر واسطہ رکھنا ہی چاہتے ہیں۔ تو پہلے اس کی پوری پوری ذمہ داریاں بھی انہیں محسوس کرلینی ہونگی۔ ورنہ تاج صاحب بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں وہ خود بھی اسے جانتے ہوں گے کہ ادب آئینۂ زندگی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ان کی غیر ذمہ دار جنبشِ قلم کی سہرا انارکلی ہمارے تو ہمارے بلکہ ہمارے اسلاف کے تاریخی کلچر کو مسخ اور ایسا بھونڈا کر دکھائے گی کہ اغیار اس سعادتمندی پر ہنس ہنس کے داد دیں گے۔ اور ہمیں پھر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

اس تمہید کے بعد ارادہ تھا کہ اصل تصنیف کے متعلق کچھ کہوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں دو اور شخصیتوں نے بھی اپنی ذمہ داری کو جان بوجھکر یا انجان طور پر بُھلا دیا ہے۔ ان میں سے ایک مس حجاب ہیں۔ اور دوسرے مسٹر چغتائی آرٹسٹ۔ مس حجاب دنیائے اُردو میں بیگانہ نہیں۔ یہ جنوبی ہند کی ایک عصری خاتون ہیں۔ اُردو رسالوں میں یہ جو کچھ لکھتی ہیں۔ اور جس آن بان سے لکھتی ہیں سچ یہ ہے کہ وہ ان کے ماحول کو دیکھتے ہوئے ایسا غنیمت اور ادب اُردو کے حق میں نیک فال ہے۔ ساقی کے گذشتہ "ظریف نمبر" کی بزمِ ادب ابھی ہمیں یاد ہے۔ جس میں ملک کے مشہور ادیبوں کی ہنسوڑ باتوں سے ہم پیٹ بھر کے ہنسے تھے۔ اسی بزم میں حجاب کی مشاطۂ قلم نے بھی بڑے سبھاؤ سے ایک "دلہن" بنائی تھی۔ اور بڑے کے دیدوں میں خاک! مجھے اب تک

---

[1] مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اُس سے اُنس ہے۔ لیکن میں اُن سے یہاں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیوں مس صاحبہ! تاج صاحب نے عجب نے ایک "مختصر خط" کے ذریعے انارکلی کو آپ کے نام سے معنون کرنا چاہا۔ اور ساتھ ہی اپنی دانست میں انکساراً یہ بھی تحریر فرمایا کہ

"کتاب کا پڑھنا چنداں ضروری نہیں۔ اسے ایک ضمیمہ سمجھئے۔ طویل اور بے معنی!"

تو کیا واقعی آپ بُھلاوے میں آگئیں؟ اور کتاب نہیں پڑھی؟ یہی نہیں بلکہ اُردو کی بدنصیبی سے یہ تک نہ دیکھا کہ آپ کے "اُن" کا یہ "بے معنی" والا انکسار فی الواقع انکسار ہے یا واقعہ کا اظہار! لیکن دیکھئے جنابہ! جواب میں کہیں یہ نہ کہہ دیجئے گا کہ اُس وقت یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ تاج نے کتاب میں کچھ لکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں تو مسٹر تاج کے کہے پر ایمان لے آئی!

رہے چغتائی صاحب تو میں چاہتا ہوں کہ ہاتھ وہ بھی اپنے متعلق ذرا کان کھول کر سن لیں کہ بحیثیت ایک اختصاصی آشنائے فن کے ان کا مخصوص وقار ان سے کیا چاہتا ہے۔ یہ وہ خود بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح ایک عامی کے لئے سہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا!

والا انوکھا شعر قریباً بے معنی ہے۔ اور پھر ادب اور آرٹ میں صرف زبان اور آنکھ ہی کا فرق ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ ان کا نرالا آرٹ بھی .... خواہ وہ کتنا ہی اعلےٰ کیوں نہ ہو یا ہو جائے .... خاص ذوق کے ایک محدود طبقہ کے لئے باصرہ نواز بن سکتا ہے۔ یہ جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ چغتائی آرٹ کو دنیا کس لئے سراہتی ہے۔ یا اسلامی کلچر نے اسے کیوں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بھلا ایک عامی کو اسکا کیا دماغ کہ وہ چغتائی کے خداداد فن و کمال کی قدر کریگا۔ خوش خیال چغتائی تو جی نی اس (Genius) اور اپنے مخصوص رنگ میں ہماری روایات کا تنہا مصوّر ہے۔ جس کی پیاری پیاری تصویریں اجنبی اثرات سے ایسی ہی الگ تھلگ ہیں۔ جیسے کوئی کافر ادا کسی کے پاس سے دامن بچائے نکلی چلی جاتی ہو! اس واسطے میری دانست میں موصوف کو انارکلی کی حد تک سستا ہو کر کبھی بھی اپنا وقار نہ کھونا چاہیئے۔ کیونکہ پوزیشن کا قیام بھی ایک معقول انسان کے لئے فرضِ کفایہ سے کم نہیں ہوتا۔ ورنہ لوگ بدسلیقہ کہیں گے اور ویسے بھی اپنی قدر آپ نہ کرنا ایک بڑا کفرانِ نعمت ہے۔ یہ نہ ہوا تو وہ اچھی طرح سمجھ رکھیں کہ ہندوستان پھر ہندوستان ہے۔ یورپ نہیں اور ہمارے ہاں ابھی عام طور پر یہ مذاق کہاں کہ جادو بیجا "عملِ چغتائی" کا اختصاصی خط و رنگ بالعموم وہ جذبات و حسیّات اُبھارے گا۔ جن کا وہ پیام بر ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ارزانی سے چغتائی صاحب کی تصویریں نساطی کی بھونڈی گڑیوں کی طرح پیسہ جوڑ بکیں گی۔ اور پھر وہ دن بھی دور نہ سمجھئے کہ ملک کے بعض منچلے ان میاں جی سے بغدادی قاعدہ ہی مصوّر (السٹریٹ) نہ کرائیں تو سہی!

اچھا تو لیجئے جناب! یہاں سے اب اصل کتاب کی باری ہے جو ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری،

فکشن اور ڈرامے.... کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے۔ بلکہ یہ کہئے کہ اِس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے۔ جسے اِنسان کی دُکھیاری زندگی کا نمونۂ عبرت ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے یہاں بعض احباب کو یہ خلش پیدا ہو کہ آخر تاؔج صاحب ٹریجڈی لکھنے پر اِس طرح ٹوٹ کیوں پڑے؟ وہ تو تجیا جھکّن نے تصویر ٹانگی ”ایکے سے ادب کے خوگر ہیں! اِسی میں پوری ڈال لیتے۔ تو پھر اُستادی کے ہاتھ دکھاتے۔ لیکن سُنا ہے کہ اِس کی ایک خاص وجہ ہے۔ جس کے کارن وہ ٹریجڈی اور وہ بھی ناکامیٔ محبت کی ٹریجڈی (جو شاید اُن کے حق میں شگونِ نیک ہے!) کا رُعب ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ مگر مجھے خوف ہے کہ اِس طرح وہ اپنی حیثیت عُرفی گنوا بیٹھے۔ اس لئے کہ ان کا یہ ڈرامہ تاریخی یا ادبی رنگ میں کچھ ہوتا تو ایک بات تھی۔ وہ تو اتنا ہی بھاری بھرکم نہیں معلوم ہوتا جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو ہی بھائے یا اُس پر رُعب ڈال سکے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ان کا نفس خود اُنہیں دہوکہ دیدے اور اس دہوکہ میں یہ کہنے لگیں کہ انارکلی کو آج بھی وہ دنیائے اُردو کے روبرو پیش کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔ چہ جائیکہ اُنہیں جاننا چاہیئے تھا کہ فاضل حشؔر کاشمیری کے مبارک ہاتھوں اُردو بولنے والے ڈرامی ادب میں بھی اتنے ہو گئے ہیں کہ اچھے بُرے کا امتیاز کر لیتے ہیں۔

اس ڈرامے میں سب سے پہلے تو مجھے قصّے ہی پر اعتراض ہے۔ جو خود تاؔج صاحب کے قول کے مطابق ایک ”بے بنیاد“ چیز ہے۔ قصہ یہ ہے کہ انارکلی اکبری دربار کی ایک قبول صورت کنیز ہے۔ جہاں ایک انارکلی کیا ہزاروں ایسی لونڈی باندیاں ہوں گی۔ تاؔج صاحب کو القا ہوا ہے کہ یہ باندی پہلے اکبر اعظم کی منظورِ نظر تھی۔ پھر خوش عیش سلیم کی چاہیتی بن گئی۔ اکبر بادشاہ کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ سلیم کو تڑپتا اور انارکلی کی بڑھیا ماں کو بلبلاتا چھوڑا۔ اور انارکلی کو زندہ چنوا دیا۔ یہ قصّہ تاؔج صاحب کے بچپنے کی ایک ”فرضی کہانی“ ہے اور کیا مزے کی سیر ہے کہ اس کہانی کو وہ سماج کی مستقل نامُرادی کی ایسی احوالی سرگذشت بنانا چاہتے ہیں کہ اپنا یا پرایا جو بھی اسے پڑھے وہ ”تاؔج صاحب کا ہمزبان ہو کر بزرگ رفتگان پر گویا تبرّا بھیجے! اغیار کے بُرا کہنے سے شاید تاؔج صاحب کے ٹھنڈک نہیں پڑی تھی۔ جو خود اُنہوں نے بُرا کہنے کی ٹھانی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے۔ باحمیت مُصنّف کو یہ معمولی بات حضرات اقبال اور بخاری کی ادب نواز سرزمین میں بیٹھکر بھی نہیں سوجھی کہ مسلمانوں کے جس شہنشاہ کو وہ ایک لغو قصّہ میں انتہائی ظالم و سفّاک بنا کر بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ دنیائے تاریخ اُسے کیا کہتی ہے۔ ذرا یہ سنیئے گا۔ مصنّف ڈرامہ نے سرِ فہرست ہی انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے۔ اکبر اعظم ۱۴ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو پیدا ہوا اور ۱۷ جنوری ۱۶۰۶ء کو (۶۳) برس کی عمر میں اُس نے وفات پائی۔ اس حساب سے ۱۵۹۹ء میں آپکی عمر (۵۶) سال تھی۔ اب جو بادشاہ بچپن ہی سے خُلق و مُروت کا پُتلا ہو۔ بلکہ عنفوانِ شباب میں بھی جو بالعموم دیوانگی کا سا زمانہ ہوتا ہے اسکی محبّت و انسانیت کا یہ عالم ہو کہ ہیموں بقّال جیسے حریف کی مُشکیں بندھی ہیں حاضر دربار

ہے۔ شیخ گدائی کنبوصدرالصدورِ وقت فتوے دیتے ہیں کہ پہلا جہاد ہے۔ حضور دستِ مبارک سے تلوار ماریں کہ جہادِ اکبر ہو۔" مگر اکبر کی سرشت میں تو قدرت نے انسانیت کُوٹ کُوٹ کے بھری تھی۔ نوجوان بادشاہ کو ترس آجاتا ہے اور یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ "یہ تو آپ مرتا ہے۔ اسے کیا ماروں!" لیکن تاج صاحب کا ظلم دیکھیے کہ وہ ایسے شریف النفس بادشاہ کو بڑھاپے میں ظالم وقاہر بناتے ہیں کہ جب ظالم سے ظالم کا دل بھی فطرتاً گداز ہو جاتا ہے! افسوس! تاج صاحب نے پڑھ لکھ کر یہ بھی بھلادیا کہ جو بادشاہ درمندی و حمیت کا بادشاہ ہے۔ اور اپنی تو اپنی پرائی بہو بیٹیوں کو ستی کی آگ میں جلتا دیکھ کر بلبلا اُٹھتا ہے۔ بلکہ اس انسانیت سوز قہر سے ان معصوموں کو بڑی حد تک نجات دلاتا ہے۔ وہ اپنوں ہی کو جن بچہ کو لہو پلوائے گا یا دیوار میں زندہ چُنوانا گوارا کرے گا؟ حضرت! اکبر کا تو یہ مقصدِ حیات تھا کہ انسان کی سب میں بڑی بھلائی معافی قصور ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے!

ایک ہی کیا؟ تاج صاحب کو تو اکبر بادشاہ سے کچھ باپ مارے کا بیر ہے۔ کیونکہ اور تو اور انہوں نے انار کلی کی چھوٹی بہن ثریا نامی ایک باندی تک کی زبانی اس مغلِ اعظم کو خوب خوب صلواتیں سُنوائی ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:-

اُس سے؟ (سلیم سے) اور شہنشاہ تم سے نہیں؟ تم بچ جاؤ گے؟ آسمان نہ ٹوٹے۔ بجلیاں نہ گریں۔ زلزلے نہ اُٹھیں؟ لیکن یہ چنگاری جیسے دوزخ کی ہوائیں سُرخ کر رہی ہیں۔ تم کو۔ تمہارے محلوں کو۔ تمہاری سلطنت کو۔ سب کو (تاج صاحب کو نہیں!) پھونک کر راکھ بنا دے گی ......" صفحہ ۲۵۰۔

پھر اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ بیچارے سلیم کی مٹی پلید کی ہے۔ اور اتنا ذلیل وخوار کیا ہے کہ خدا دشمن کو بھی یہ دن نصیب نہ کرے! ذیل کا ایک اور اقتباس دیکھیے۔ یہ بھی ثریا باندی کی زبانی ہے۔ اور اسے پڑھکر تو میری طرح آپ کے بھی رونگٹے نہ کھڑے ہو جائیں تو میرا ذمّہ!

"تیمور کی نامراد اولاد! ...... ظالم اکبر کے دروغگو بیٹے! ...... ہندوستان کے بزدل ولی عہد! ...... اندھے ...... جھوٹے ...... بے حیا ...... جوان انار کلی کے۔ انار کلی کی بڑھیا ماں کے ناپاک قاتل! ...... اسکی (انار کلی کی) پھٹی ہوئی آنکھیں تیری نحس صورت کو ڈھونڈتی رہیں ...... میں اپنے آخری سانس کو اس کے لئے (سلیم کے لئے) لعنت بناؤں گی!!" صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲۔

یہ لکھ رہا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب تک ڈرامہ کی یہ معصوم سطریں موجود ہیں۔ اُس وقت تک

دسوا اسکے اور کیا کہوں!) اُن مرنے والوں کی پاک اور باعظمت روحیں مُصنّف ڈرامہ پر بے شمار انوار برسائیں گی!

اصل پوچھئے تو تاج صاحب پر یہ اس تبرّا بھیجنے کی ہی مار ہے کہ کئی سال کی کوشش کے باوجود بھی انارکلی کے معاملہ میں وہ بجائے مُبارکباد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ ہائے! غریب پر کیا بُری بن گئی کہ جس ڈرامہ کو کڑی جھیل کر بڑے ارمانوں سے لکھا۔ اور پھر ڈرامہ بھی ٹریجڈی۔ ٹریجڈی بھی موضوعی۔ جس سے فلسفۂ ادب کے شاید اس مسلمہ اصول کی واقفیت جتانی مقصود تھی کہ دل (مائنڈ) آنکھ سے زیادہ دیکھتا ہے افسوس ہے کہ وہی ڈرامہ ان کے دل کے نابینا ہونے کا ثبوت مرئی بن گیا! اور یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ اب لوگوں کو ان کی ہیروئن انارکلی کی موت سے زیادہ خود ان کی حالت پر رونا آتا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو اس میں سراسر تاج صاحب کا ہی اناڑی پن ہے۔ نہ وہ میدانِ ادب میں اتنی دُون کی لے کے اُترتے۔ نہ اس طرح منہ کی کھاکے چاروں خانے چت آتے۔ بھلا وہ خود ہی سوچیں کہ ڈرامی قابلیت کے زعم میں یہ کتاب لکھ کر انہوں نے اپنے تخیل کی نگری نہیں تو کیا ایک اندھیر نگری بسائی ہے جس میں بجائے اسکے کہ وہ ادبی کیرکٹر پیدا کرتے۔ تاریخی ہستیوں کا گلا گھوسے ہیں۔ ان کی باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ تک نہیں جانتے کہ ڈرامہ کی جان صرف پیدا کرنا ہے۔ جو البتہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس لئے یہ گر مجھ سے سیکھ لیں۔ جسے یاد رکھیں گے۔ تو یاد کریں گے۔ اخیر سُنئے مشفق! ایک عارفِ فن کہتا ہے۔ ڈرامہ نگار کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستی پیدا کرے۔ اور اگر ایسی ہستیاں ایک سے زیادہ ہیں۔ تو اُن میں ایک دوسرے سے اسی طرح جداگانہ ہونی چاہیئے۔ جیسے ہم آپ نہیں ملتے۔ پھر یہ سب بالکل اصلی، سچ مچ زندہ ہوں۔ اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو۔ ادب میں اس قسم کا ایک کیرکٹر بھی پیدا کرنے کے یہ معنے ہیں کہ آرٹسٹ ادب کی جیز پیدا کر دی۔ ایسا کارنامہ پیش کیا جو قدرتِ الہٰی کے لگ بھگ ہے۔ اور یہ وہ کام ہے۔ جس میں حضرتِ حق سے بندے کو ایسا مرتبہ ملتا ہے کہ وہ جان ڈالنے لگتا ہے! اس اعتبار سے اب آپ ہی انارکلی کو اُٹھا کے دیکھیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ خود مایوس ہو جائیں گے۔ لیکن بہت ممکن ہے یہ بات اس لئے آپ پر صاف نہ ہو کہ انسان کو اپنی شکل آپ نظر نہیں آتی۔ اس لئے میں اسے روشنی میں لے آتا ہوں۔ ہاں ایک شرط ہے کہ راقم کو باندیوں سے سروکار نہ ہوگا، اس لئے نہیں کہ شرفا انہیں منہ لگانا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس لئے کہ جن تاریخی ہستیوں کو لے کر آپ نے اپنے ڈرامے کا کردار بنایا ہے۔ وہ ہی غریب اپنی تاریخی زندگی کھوئے بیٹھے ہیں۔ اس واسطے آپ کے قلم سے ایسے کرداروں کی زندگی کا کوئی کیوں کر یقین کرے جن کا کوئی تاریخی وجود ہی نہیں ہے۔ ایسے کردار تو مصنّف کے محض خیالی پیکر ہوتے ہیں۔ جنہیں سمجھنا یا اپنا جیتا خون دیکر اُسے پروان چڑھانا پڑتا ہے۔ اور جو کارے دارد کا مضمون ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ انارکلی ہو یا دوسری بیجان کنیزیں ان سے مجبوراً منہ موڑ کے مجھے آپ کے تاریخی کرداروں کو لینا پڑیگا۔ جنہیں قدرت نے حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ اور ان کرداروں میں سے بھی میں صرف اکبر بادشاہ کو لینا چاہتا ہوں۔ جو مغلیہ بادشاہوں

کا مسمر تاج اور لے پرائے سب کا جانا پہچانا ہے۔ اس بادشاہ کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے۔ نہیں تو آپ ہی فرمائیے بھلا یہ ہستی اس قابل ہے کہ ایک عامی کی طرح آپ اسے باندیوں کے ہاتھ کا کھلونا بنائیں۔ مانا کہ مُغلیٔ مٹ گئی اور اُسے رحیلِ جنت ہوکے تین سوا تین سو برس ہوئے۔ لیکن بُرا نہ مانیئے اس بادشاہ کی غیر موجود گی آج بھی آپ کے وجودِ اصلی سے زیادہ یقینی ہے۔ اس لئے اس کا معاشرہ، اس کی عظمت، اس کے خصائل و رجحانات غرض اسکے مشہورِ عام تاریخی خدوخال آپ کہاں اور کیسے بھولے؟ حالانکہ انہیں تو اُجاگر ہوکر اس طرح سامنے آنا چاہیئے تھا کہ وہ انارکلی کے ایک ممتاز کردار کی حیثیت سے اپنے شمائلِ نفسی کی بولتی تصویر اور آپ کی ادبی ہستی کا مُصنّف ہوتا! آپ سمجھے؟ آپ کو اس کردار میں کیوں ناکامی رہی۔ اور اسی طرح آپ کے دوسرے کردار بھی وہ نہیں جو انہیں فطرتاً ہونا چاہیئے تھا؟ بعض اس لئے کہ آپ میں ابھی ایسے ٹکسالی ادب کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ڈرامہ نگار کے تو معنی یہ ہیں کہ فقیری و شاہی اس کی جادو کی جھولی میں ہو۔ اور جس کامیابی سے وہ پورشیا یا ڈسڈیمونا کا بہروپ لے۔ اسی طرح ایگو اور کنگ لیئر بھی بن جائے۔ اور یہ وہ کام ہے کہ جس میں ایک طرف دولتِ علم و زبان کی ریل پیل ہونی چاہیئے تو دوسری طرف گہرا مشاہدہ، کافی تجربہ اور ساتھ ہی ساتھ مگر سب سے مقدم پیدا کرنے کی قوت بھی چاہیئے۔ جب جا کر کہیں کام چلتا ہے۔ لیکن آپ تو اپنے، توبہ! سلیم کے عشق کی کچھ ایسی بدحواسی میں گرفتار تھے کہ سرے سے ساری باتیں بھول گئے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچّہ بچّہ کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ وہ آپ کے اکبر والے کردار سے بالکل نہیں ملتی۔ اور یہی وجہ ہے جو ذہن اپنے آپ ادھر منتقل ہوتا ہے کہ شاید آپ خصلت نگاری کی اہمیت ہی نہیں جانتے۔ اور سچ بھی ہے کہ چند اوندھے سیدھے قصّے لکھ کر ہمارا یہ سمجھ لینا عین نادانی ہے کہ خیر سے ہم ایک کردار نگار بھی ہیں۔ آپ کہیں گے تو یہی کہ یہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا۔ مگر جب مشاہدہ کا ذکر آگیا ہے تو لگے ہاتھ میں آپ کو آپ کے مشاہدے کا وزن بھی دکھائے دیتا ہوں دیکھیئے انارکلی کو آپ نظریہ پیش کر رہے ہیں۔ منظرِ اول ہے۔ لیکن اس منظر کی پہلی ہی سطر میں آپ نے کیسی ٹھوکر کھائی ہے:۔

"موسمِ بہار کی ایک دوپہر۔ ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہوچکا ہے!"

غور کیجئے کہ آپ کی یہ طرزِ نگارش کتنی بے ضرورت لفاظی لئے ہوئے ہے۔ بھلے کو آپ نے یہ نہ لکھا:۔

"موسمِ بہار کی ایک صبح کاذب کے بعد اتنے گھنٹے اتنے منٹ گذرے۔ اور شام ہونے میں اتنے گھنٹے اتنے منٹ باقی ہیں!"

حالانکہ آپ کا یہی مطلب غالبًا اس طرح زیادہ نفاست، اختصار اور اثر سے ادا ہوسکتا تھا:۔

"بہار کا موسم اسہ پہر کا وقت ہے۔"

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ جو چیز میں یہاں اُبھار کے دکھاؤں گا۔ وہ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔

"ستونوں اور محرابوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے ہیں"!

یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے۔ اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ "طویل ہونے" پر ہی ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نمازِ ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سائے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں!

میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی اُمیدیں بندھی تھیں، سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلئی شان و تجمل کا ایک سُہانا خواب ہوگا۔ جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے حسین منظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بسنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے۔ گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ کہیں چوبی سرا پردہ یعنی گلال بار، بارگاہ اور چوبی خیمے نصب ہیں۔ جن میں اندر کا شانی مخمل۔ رومی بانات۔ ایرانی قالینوں کا فرش ہے۔ تو باہر کے رُخ ابریشمیں نواڑوں سے اس طرح کسے گئے ہیں۔ جیسے مغلئی حرم سرا میں کوئی ترکن ریشمی پرتلہ ڈالے پہرہ دے رہی ہے۔ کہیں دَل بادل حرم سرا، خرگاہ اور پردہ کلیمی کھڑے ہیں۔ جن کے آگے زردوزی، زر بفتی سائبانوں کی بہار ہے تو اندر بیگمات، خواصوں، سہیلیوں اور اردو بیگنیوں کی چہل پہل ہے۔ یہاں عجائبی، قلندری اور منڈل ہے۔ وہاں توشہ خانہ، آبدار خانہ اور خوشبو خانہ ہے۔ دو آشیانہ منزل (جھروکہ) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے۔ جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاس دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے کہ جاں نثارانِ دولت کہیں بھٹک نہ جائیں۔ پھر لشکرِ اقبال اور عمائدینِ بارگاہ کا ساز و سامان جدا ہے۔ گویا جنگل میں طلسمات کا ایک غدار شہر بس گیا ہے۔ جس میں چار چار پانچ پانچ میل آئینہ بند بازار اور خوشنما چوک ہیں۔ اور جہاں عیش و نشاط کا میلا لگا ہوا ہے۔ اِدھر چاند نے کھیت کیا۔ اُدھر بادشاہ سلامت جنگل کی سیر کو نکلے۔ عمائدینِ بارگاہ براتیوں کی طرح ہم رکاب ہیں۔ حضور خاصہ کے سفید بُراق گھوڑے "نور بیضا" پر سوار ہیں۔ جو دودھ سی چاندنی میں نور کی پُتلی بنا چھم چھم چھم چھم چلا جاتا ہے۔ اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ یا اس کا موقع نہ تھا۔ تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا۔ تو جشن نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھا دیا ہوتا کہ مُلکِ تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی۔ اور وہ آئینِ مملکت کا کیسا اہم مگر خوبصورت جزو بن گئی تھی۔ یعنی یہی کہ بادشاہ، امرا کو سلطنت کا رُکنِ رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک کا دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے۔ لیکن انسان کی سرشت جھگڑالو ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی۔ اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ

کرکے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔ بگڑے بھرے امراء یا برکت تدبیر مان لیتے تو فبہا۔ ورنہ حضور جہاں پناہ سلامت فرماتے:-
"اچھا! یہ لڑکا یا لڑکی ہماری۔ تمہیں اس سے کچھ کام نہیں۔" وہ (امیر) یا اُس کی بیوی نازخانہ زادی سے کہتے۔ "حضور! لونڈی بھی اس بچے سے دست بردار۔ آخر حضور ہی کے لئے پالا تھا۔ محنت بھر پائی۔" باپ کہتا "کرامات! بہت مبارک۔ مگر خانہ زاد کو اب اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ غلام حق سے ادا ہوا۔" بادشاہ کہتے "بہت خوب۔ ہم نے بھی وصول پایا۔" کبھی بیگم بیاہ کا ذمہ لے لیتیں۔ کبھی بادشاہ لے لیتے۔ اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں باپ سے بھی نہ ہوسکتا۔

مینا بازار کا ذکر آیا۔ تو اردو رومانس کے ہیرو آزاد کے ایک لطیف رومانس کی اچانک یاد سے جی باغ باغ ہوگیا۔ اور خیال آیا کہ دیکھو آدمی آدمی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ آزاد مرحوم نے بھی سلیم کا عشق کہا یا ہے۔ اور تاج صاحب بھی اُسی کے عشق کی داستان سُنا رہے ہیں۔ مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک نے شاہانہ حُسن وعشق کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ دیکھے سے نظر لگتی ہے۔ مگر دوسرے کو تنگ نظری سے اکبری دربار گھر بار میں سادات ہوتی بھی تو کن سے ؟ لونڈی باندیوں سے! تو ہاں افادی مرحوم نے ایک جگہ لکھا اور بہت صحیح لکھا ہے کہ مہرالنساء کے واقعۂ عشق کو پروفیسر آزاد نے اس خوبصورتی سے دکھایا ہے کہ انشاء پردازی کو آج تک اُس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے۔ جس دلچسپ واقعہ کو خوش قلم آزاد نے کُہن سال بزرگوں سے سُنا وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے:-

"مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات بڑی پھرتی تھیں جیسے باغ میں قمریاں یا ہریاول میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا ائین میں آنکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رُکے ہوئے تھے۔ وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادے نے کہا کہ "لو! ذرا ہمارے کبوتر تو لے لو۔ ہم وہ پھول توڑ لیں۔" لڑکی نے دونوں کبوتر لے لئے شہزادہ نے کیاری میں جاکر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کیا ہوا؟ عرض کی۔ صاحب عالم! وہ تو اُڑ گیا۔ پوچھا۔ ہیں! کیونکر اُڑ گیا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اُڑ گیا!"

میں نے عمداً یہ اقتباس قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے دیا ہے۔ ذرا دیکھئے گا۔ نورجہاں کے الڑپنے کی کیسی بولتی چالتی مگر مؤدب تصویر اُتاری ہے جس میں بہ تقاضائے سن شوخی بھی ہے۔ بھولپن بھی ہے اور فنی لطافت کا تو یہ عالم کیف ہے کہ:-

"عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں!"

تاج صاحب کو یہ سُنکر بھی مایوسی ہوگی کہ زبان کے اعتبار سے بھی آثار کلی کچھ نہیں۔ اگرچہ ایک ادیب نے تو اس مسئلہ میں غلو کرکے یہ تک کہدیا ہے کہ الفاظ پیالہ اور معانی پانی ہیں۔ اب پانی کو چاہو سونے، چاندی،

بلور اور سیپ کے پیالے میں بھر لو یا مٹی کے آبخورے میں رکھو۔ پانی پانی ہی رہے گا۔ ہاں سونا چاندی اس کی توقیر میں چار چاند لگا دیگا۔ لیکن میں اس کا قائل نہیں۔ اس مغالطہ کا اس سے پہلے جواب دیا جا چکا ہے کہ کیوں جی اگر پانی کھاری یا گدلا ہو تو پھر سونے کا پیالہ ایک طرف آپ ہیرا تراش گلابی میں بھی رکھیں تو نہ پانی کی ذات ہی میں فرق آئے گا۔ اور نہ وہ خوشگوار ہی ہوگا۔ مگر ایک صاحب ذوق کی یہ بات بھی دل کو لگتی ہے۔ ایک ادیب میں خیال کی گہرائی، نظر کی پہنائی کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کا بھی ملکہ ہونا چاہیئے۔ یعنی وہ کلام کے دونوں پہلو، خیال و لفظ کا اُستاد ہو۔ گو یہ دونوں پہلو بالکل جُداگانہ ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے جُدا نہیں کئے جا سکتے۔ یہ لازم ہے کہ ایک ادیب کو صحیح خیال کے لئے صحیح لفظ ملے۔ یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تحریر میں ایک لفظ ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔ اگر وہ اختصار پر آجائے تو اُس کے لئے چند لفظ کافی ہو جائیں۔ اگر لفظوں کی گنگا بہائے تو بھی ہر لفظ اپنے اپنے موقع سے ہو۔ اور اسکی فصاحت کے زبردست بہاؤ میں مدد دے۔ رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ وہ وہی باتیں کہے۔ جو سب کے دل میں ہوتی ہیں۔ لیکن سب ادا نہیں کر سکتے۔ گویا اس کی باتیں سُنکر ہر ایک کہہ اُٹھے کہ :-

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!"

اس طرح اُس کے جملے لوگوں میں کہاوت اور اسکے فقرے گھریلو بول چال اور محاورے بن جاتے ہیں۔ ڈرامہ میں یہ بات بدرجۂ اتم ہونی چاہیئے۔ لیکن انارکلی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تو تاج صاحب نے یہ غضب کیا ہے کہ لکھنے تو ٹریجڈی ہیں۔ جس میں دُکھ کی آنچ سے روح انسانی کو کُندن کی طرح دمک اُٹھنا چاہیئے۔ مگر جا بجا زبان ایسی برتتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے میاں اسلم کے مرزا جی بول رہے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"تم علیل ہو شیخو؟......... یہ تو نے کیا کھا ثریا؟......... تو مضائقہ کیا ہے حضور.........
سبھی تو آتے جاتے ہیں یہاں......... تو پھر یہ کیا ہے شیخو؟......... سلیم کیا سوچ رہے ہو تم؟......... میں کچھ اور سوچ رہا ہوں بختیار......... آج کیا سوچ میں پڑی ہوئی ہو تو؟
.... یہ آخر تجھے ہوا کیا ہے؟ (دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟) صفحات۔ ۲۴، ۲۵، ۴۰، ۴۹، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۷۹"

بعض جگہ انہوں نے نئی نئی ترکیبیں گھڑی ہیں :-

"پُختہ حُسن......... نقشِ انارکلی......... گنگا جل کپڑا......... گوشۂ بیچ کی گوٹ..
.... گرم نیند۔ تپتی نیند۔ جھلستی نیند......... پھیکا آسمان......... صفحات۔ ۱۰، ۲۶، ۱۵۶، ۲۰۱، ۲۳۶، وغیرہ"

کہیں کہیں نئے محاورے بھی دیکھنے میں آتے ہیں :-

"جھوٹے منہ سے دو بول شکریہ کے......... صفحہ ۲۵"

"جھوٹے منہ" کا یہ محلِ استعمال نہیں۔ زبردستی محاورے کی مٹی پلید کی ہے۔ یہ محاورہ بولنے والے اس طرح

بولتے ہیں :-

"بُوا! ننھی کی بسم اللہ جب چیلتے کرلی۔ ہمیں جھوٹے مُنہ بھی نہ پوچھا"

تاج صاحب نے بجائے "جھوٹے مُنہ" کے یہ محاورہ لکھدیا ہے۔ سند چاہیئے تو ذیل کا شعر حاضر ہے۔ دیکھیے کیا خوب کہا ہے ؎

"ایک بوسہ ہم نے مانگا راہِ مولیٰ واہ جی
جھوٹے مُنہ سے یہ نہ نکلا لیجئے جاناشاہ جی"

سینچوں دار روزن۔ (مشفق! سینچ یا سینچہ تو کباب کے ہاں ہوتا ہے۔ سلاخوں دار روزن کہیئے۔) نیند کا لوٹنا .... بچھروں میں ڈو بنا .... لہو ...... دیوار میں غرق ہونے کے بعد تھم گیا .... میری نظروں میں بُرے بُرے شگون پھرتے ہیں۔ صفحات ۱۹۶، ۱۹۱، ۲۱۱، ۲۵۲"

بعض جگہ زبان برتی ہے۔ تو کچھ ایسی بے موقع برتی ہے کہ پڑھتے سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ مقام ملاحظہ کیجئے۔ جہاں سلیم اپنی ماں (رانی) سے اعترافِ عشق کے بعد آنارکلی کے لیے آنکھوں میں آنسو بھرلاتا ہے۔ اُس وقت سلیم کی عمر بھی ننھی نہیں۔ مگر رانی ان الفاظ میں اُس کی دلجوئی کرتی ہے :-

"میری جان! میرا لال! میرا چاند! یہ آنسو۔ یہ ماں کا لہو۔ میں تجھے آنارکلی دوں گی۔ تیرے باپ سے لیکر دونگی!"

یہ اندازِ گفتگو تو ایسا ہے۔ جیسے اوپرتلے کے دو کم عمر بھائی لڑیں۔ اور ماں روتے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے چھوٹے بچّے کو یہ کہہ کر منائے پھسلائے کہ :-

"نہیں۔ میرے لال! میرے چاند! اتنے لمبے لمبے آنسوؤں سے نہ رو۔ ذرا بڑے کو گھر میں آنے دے۔ میں اپنے لال کو اُس سے چھین کر جھنجھنا دوں گی!"

مختصر یہ کہ آنارکلی "خیال و لفظ" دونوں لحاظ سے بڑی ہی مایوس کُن ہے۔ بلکہ یہ ایسا ادب ہے کہ اگر اسے یونہی رہنادیا۔ تو ہماری قومی موت کی اِس سے واضح شاید کوئی اور نشانی نہ ہوگی۔ ممکن ہے اس پر بھی کوئی صاحب یہ سوال کر بیٹھیں کہ آنارکلی میں آخر کچھ خوبیاں بھی ہوں گی؟ تو اس کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہاں خوبیاں اگر اسی مناسبت سے ہوں جیسے ایک بدرو میں اِکّا دُکّا عطر کی بوندیں ٹپکائی جارہی ہیں! تو فرمایئے ان سے کیا حاصل؟ میں نے اصولاً یہاں وہاں سے آنارکلی کو دکھادیا ہے اس کی حیثیت کا آپ خود ہی اندازہ کرلیں اور یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے ایک ساہوکار روپیہ کو اُنگلی اور انگوٹھے پر رکھ کر چٹکی دے اور آپ روپیہ کے چھنکے سے اُس کا کھرا کھوٹا معلوم کرلیں! زیادہ تفصیل اِس لئے نہ کھولی کہ آنارکلی سے دوگنی خود مجھے ہی ایک کتاب لکھنی پڑتی۔ میں تو بات کو اتنا طول بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن جُوں جُوں کتاب پڑھی۔ اور پڑھی کیا نگلی! تو بات میں بات پیدا ہوتی گئی۔ اور لٹریچر کی خاطر مجھے مجبوراً اشارات کرنے ہی پڑے ؎

"یہ سمجھے تھے ہم ایک چھالا ہے دل پر ٭ دبا کے جو دیکھا تو ناسور نکلا!"

مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے تاج صاحب کو ذرا سختی سے ٹوکا۔ مگر میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ذاتی طور پر اُن سے کوئی پرخاش نہیں۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ اُردو کی ایک محسنہ (محترمہ محمدی بیگم مرحومہ) کے یہ فرزند ہیں۔ مجھے عزیز ہیں۔ لیکن ادبی معاملات میں اپنی آزاد رائے عرض کرنے پر مجبور ہوں۔ بلکہ میرا تو یہ مخلصانہ مشورہ ہے جسے خدا کرے وہ بھی ٹھنڈے دل سے مان لیں کہ جس اخلاقی جرأت سے اُنہوں نے یہ ڈرامہ شائع کیا ہے۔ اب بپاسِ ادب! فوراً اسے دریا برد بھی کر دیں۔ اس میں انہیں کسی قدر تکلیف اُٹھانی پڑیگی۔ اور دو ایک جگہ اُنہوں نے اس کتاب کے جو نسخے بھیجے ہوں گے۔ وہ بھی طلب کر لینے پڑیں گے لیکن یہ اُن کی شرافت نفس کی ایسی بیّن دلیل ہوگی کہ جس کی نظیر ملنی مشکل ہوگی۔ دوسرے شاہانِ سلف کی پاک روحیں جو انارکلی کے ہاتھوں بے کل ہوگئی ہیں وہ چین سے ہو جائیں گی اور دعائیں دیں گی۔ یہ کام یوں تو جتنی جلدی ہو اچھا ہے۔ مگر ایک مخلص کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم آئندہ ماہ دسمبر تک ضرور ہو جائے کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس ماہ میں وہ ایک مخصوص "بزمِ ادب" میں شریک ہونے والے ہیں۔ اس لئے انارکلی کی سنگت میں وہ وہاں بھی "بے ادب" ثابت ہوئے۔ تو سمجھو باادب بانصیب ہونے کی سعادت سے بھی محروم رہے!!

بہار

ہر سمت حسنِ شاہدِ قدرت ہے آشکار
شادابیوں کا جوش یہ رنگینیٔ بہار

یوں جھومتا ہے سبزۂ خوابیدہ باربار
جیسے کسی حسین کی آنکھوں میں ہو خمار

رشکِ عروسِ نو ہیں درختوں کی کونپلیں
غیرت دہِ بہشت ہے دامانِ کوہسار

ہر شاخ مثلِ برقِ تپاں کانپتی ہوئی
ہر پھول کیا ہے ایک بھڑکتا ہوا شرار

رنگینیوں میں ڈوب گئی ہے کلی کلی
دوشیزۂ بہار ہے گلشن سے ہمکنار

روحِ گلاب کے ہیں قرابے کھلے ہوئے
ہر پھول عطر بیز ہے ہر شاخ مشکبار

ہر نوکِ خار سے ہیں نمایاں مسرتیں
ہر نبضِ خس میں موج ہے عشرت کی بیقرار

یوں چھا گئی ہیں سارے زمانہ پہ مستیاں
آتا نہیں گرفت میں دامانِ اختیار

شبنم کی بوند بوند ہے فطرت کا اک کمال
اِک ایک پھول صانعِ قدرت کا شاہکار

شادابیوں میں چور ہیں صحرا کے خار و خس
رعنائیوں میں غرق ہیں گلشن کے برگ و بار

ہنگامۂ بہار پہ روتا ہے میرا دل
ماہر میں سوچتا ہوں جب اس کا مآلِ کار

ماہر القادری

غالب کے ایک شعر کی تشریح

از جناب مولوی اشرف حسین صاحب مرحوم

نوٹ:- اخی معظم جناب مولانا اشرف حسین صاحب مرحوم حضرت مولوی الطاف حسین قبلہ کے ارشد تلامذہ اور فارسی و اردو کے بہترین نقادانِ سخن میں سے تھے۔ آپ مشکل سے مشکل اشعار کو اس خوبی سے حل کرتے تھے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی خوب اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ ممدوح نے ۱۹۰۸ء میں شیخ (الحال سر) عبدالقادر صاحب مدیر و مالک رسالہ مخزن کی فرمائش پر میر حسن کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان کے متعلق ایک مضمون بطور اس کے دیباچہ کے لکھا تھا جو مثنوی کے ساتھ مطبع مخزن سے شائع ہو کر بہت مطبوع و مقبول ہوا۔ اکثر مفکرانِ سخن نے اس پر تبصرے کئے اور متعدد اربابِ فن نے اس کی تعریف میں خطوط بھیجے۔ راقم الحروف نے بھی ایک خط لکھا تھا اس کا جو جواب موصول ہوا وہ جرعہ نوشانِ میکدۂ "ساقی" کی تفریحِ طبع کی غرض سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے کہ اس نقل و گزک سے ان کے کام و دہن لذت اندوز ہوں۔ اس مکتوب کے آخر میں غالب کے ایک شعر کا حل لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ وہ شعر کے معنے کس طرح بیان کرتے تھے۔ مرحوم نے حسبِ خواہشِ نیازمند غالب کے دیوانِ اردو کی شرح لکھنے کا قصد کیا تھا مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی ۱۹۲۳ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کی شرح قابلِ دید ہوتی۔

اسعد حسین الاشرفی الدہلوی

خط

گورکھ پور۔ ۷ مئی ۱۹۰۸ء

برادر عزیز سلمہٗ۔ پرسوں تمہارا خط پورے بتیس صفحہ کا آیا۔ بھائی جب کبھی اتنی فرصت ملے ایک آدھ مضمون چھوٹا موٹا لکھ لیا کرو۔ مخزن والے میری جان کو آ گئے۔ بھلا اب مجھے اتنی فرصت کہاں کہ ماہوار مضمون دیا کروں۔ فرصت ہوتی بھی ہے تو غیر معین و غیر مسلسل۔ سرکاری کام کے علاوہ ملنے ملانیوالوں سے چھٹی نہیں ملتی۔ کسی کو صبح کے وقت فرصت ہوئی تو وہ صبح کو آن پہنچے۔ کوئی دوپہر کو، کوئی شام کو، میرا سارا دن خراب ہو گیا اور سلسلۂ خیال قائم نہ رہا۔ ملاقات باز دید کے خوف سے میں خود کبھی کسی کے یہاں نہیں جاتا۔

مجھے نہایت خوشی ہوئی کہ تم کو میرا مضمون[1] پسند آیا۔ منطقی آدمیوں کی نظر میں جو مضمون پاس ہو جائے عمدہ ہی ہے۔ مضمون کی جو داد تم نے دی ہے تحسینِ سخن شناس اسی کو کہتے ہیں۔ میرے پاس اور بھی چند صاحبوں کے

[1] دیباچہ مثنوی میر حسن۔

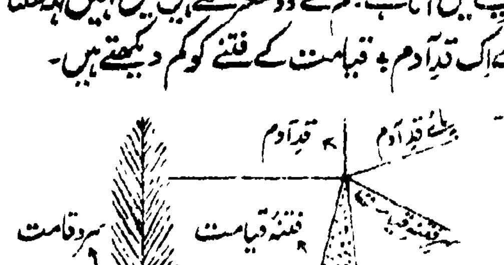
خط آئے ہیں۔ بعض نے تعریف میں مُبالغہ شاعری کیا ہے۔ اس سے میرا جی خوش نہیں ہوا۔ عنایت اللہ[1] بی۔ اے نے صحیح داد دی ہے۔ لیکن اُنہوں نے بھی واجب سے زیادہ تعریف کی ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بھی میر حسن کے عاشق ہیں۔ میں نے اِس مضمون کی غرض سے مثنوی کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ کتاب بھی غور کے لائق ہے۔ جتنی خوبیاں کلام میں ہونی چاہئیں سب ہیں اور بکثرت ہیں۔ میں نے جس پرواز پر مضمون شروع کیا تھا اور جیسا ارادہ تھا ویسا لکھتا تو دو ڈھائی سو صفحے ہو جاتے کون پڑھتا۔ مذاقِ سلیم ہزار آدمیوں میں سے ایک کو بھی نہیں ہوتا۔ بہت سی خوبیاں اس مثنوی میں ایسی ہیں کہ اُن کا اظہار بہت سے اعتراض پیدا کرتا بے مذاق آدمی تسلیم ہی نہ کرتے۔ کوئی اِدعائے محض بتاتا کوئی وہم۔ کوئی تعصب مضمون لکھنے کیواسطے کچھ کتابیں پاس ہونی چاہئیں سب مجھے قسم کھانیکو جگہ ہے کہ ایک کتاب بھی میں نے نہیں دیکھی۔ مدرسہ چھوڑے ہوئے مدتیں ہوئیں جب سے کتاب دیکھنے کا موقعہ بھی نہیں ہوا۔ مصطلحات الشعراء وغیرہ سب ذہن سے نکل گئیں۔ اصطلاح یاد ہے تو تعریف نہیں، تعریف یاد ہے تو اصطلاح بھول گیا۔ اور کیا کہوں جو لفظ کبھی اِستعمال میں نہیں آتے اُن کی اِملا میں شک ہو گیا ہے۔ اور صحت کا ذریعہ بھی کوئی پاس نہیں۔ ایک لغت کی کتاب ضرور پاس رکھنی چاہیئے۔

میرا مضمون جتنا مقبول ہوا ہے اُتنی اُمید مجھکو ہرگز نہیں تھی۔ ہاں یہ تو سمجھتا تھا کہ میر حسن کی داد جو میں نے دی ہے۔ وہ کسی نے بھی نہیں دی اور نہ میرے ہم چشموں میں کوئی دے سکتا ہے۔

تم سحر البیان کی شرح چاہتے ہو۔ بھلا کئے آدمی اُس کی قدر کرینگے۔ اب تو شاعری فقط تکبندی کا نام رکھا ہے۔ فلسفہ تصوف تمدن وغیرہ ملا کر شعر کوئی نہیں کہتا۔

مرزا غالب اور چیز تھے میر حسن اور چیز مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ مثنوی تو میر حسن ہی کہہ گئے مرزا صاحب سے نہیں ہو سکتی۔ غزل میں مرزا صاحب کا درجہ کہیں زیادہ تھا۔ میر حسن کی خواہش تھی کہ بات ایسی کہنی چاہیئے جو سب کے دل میں کُھب جائے۔ مرزا صاحب کی کوشش یہ تھی کہ ایسی کہنی چاہیئے جو کسی کو نہ سوجھی ہو۔ یہ صفت مثنوی کیواسطے مُضر ہے۔ شرح کے قابل مرزا صاحب ہی کا کلام ہے۔ ایسا (Condensed) ہوتا ہے جیسا والایت سے دودھ آتا ہے چمچہ بھر میں پاؤ بھر پانی ملاؤ جب تو کہیں دودھ کی تعریف میں آتا ہے۔ تم نے دو شعر لکھے ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ ورتو نہیں اُن کی شرح ہو سکتی ہے سہ ترے سرو قامت سے اِک قدِ آدم ؛ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں۔

اک قدِ آدم کا لُطف بیان کرنا تو در کنار سمجھنا بھی دشوار ہے۔



اِس کا (Formulae) یہ ہے:۔

سرو قامت - فتنۂ قیامت + قدِ آدم۔

شکل یہ ہے۔ ←

---

[1] خان بہادر منشی ذکاء اللہ صاحب کے فرزند، حال ناظم دار الترجمہ۔ حیدر آباد دکن۔

اب اس کے معنے کیجئے تو معلوم ہو کہ کیا کہا ہے۔ آسان حل یہ ہے:-

سروقامت = قدِ آدم (از روئے بداہت)

∴ سروقامت - قدِ آدم = ٠ (صفر، لاشئے، ہیچ)

اس لئے فتنۂ قیامت = سروقامت - قدِ آدم = (ہیچ[۲])

غالب کی شرح ضرور لکھنی چاہیئے۔ تم سے ہو سکے تو تم لکھو۔ ورنہ مجھکو یہ سامان مہیا کر دو۔
۱- دیوانِ غالب (۲) عودِ ہندی (۳) یادگارِ غالب (۴) دیوانِ غالب کی جتنی شرحیں مل سکیں۔
شوکت[۱] کی شرح پر میرے نوٹ ہیں وہ کہیں نہ کھو جائے۔ کام آئیگی۔ شرح کبھی نہ کبھی انشاء اللہ ضرور لکھی جائیگی۔

جرعاتِ تسنیم

نظارۂ دوبارہ کا ارماں لئے ہوئے
نرگس پڑی ہے دیدۂ حیراں لئے ہوئے

قلبِ ضعیف و بارِ گرانِ متاعِ عشق
ذرہ ہے اپنے سر پہ بیاباں لئے ہوئے

مت پوچھ مجھ سے وسعتِ مینائے بہار
گل ہے وداعِ عقل، دل و جاں لئے ہوئے

عشرت میں بھی عملِ گذشتہ کا ہی خیال
شامِ وصال ہے شبِ ہجراں لئے ہوئے

یہ اور بات ہے کہ اسیرِ قفس ہیں ہم
آئی تو ہے بہارِ گلستاں لئے ہوئے

اندازِ حسن مالک و مختارِ چشم و دل
افسونِ عشق نبض رگِ جاں لئے ہوئے

کہنے کو تھا کہ سوگ ہے منظور پردہ تھا
آئے وہ رخ پہ زلفِ پریشاں لئے ہوئے

آتی ہے جب بہار تو ہوتا ہی چاک چاک
دل ہے متاعِ رسمِ گریباں لئے ہوئے

ضبطِ فغاں ہے باعثِ رنگینیٔ جمال
لالہ بھی ہے جراحتِ پنہاں لئے ہوئے

صبحِ نظارہ مجرمِ رنگِ شکستہ ہے
شامِ شفق ہے خونِ شہیداں لئے ہوئے

تسنیم تیرے سر کی قسم ہم نے بارہا
دیکھا ہے اُن کو خنجرِ عریاں لئے ہوئے

تسنیم مینائی

---

[۱] مولوی احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی۔ [۲] یعنی فتنۂ قیامت سروقامت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

دُنیا اور مطلب

(از جناب اسعد الاشرفی العرشی الدہلوی)

گُفت روزے بُلبُلے باگل چُنیں ‖ بر رُخِ زیبائے تو روحی فدا
حق نے کیسا تجھ کو بخشا ہے جمال ‖ واہ وا کیا حُسن ہے صلِّ علیٰ
رو کشِ صد نخلِ طوبیٰ شاخ شاخ ‖ قائلِ حور و پری ہر ایک ادا
غیرتِ حُسنِ مجسّم برگ برگ ‖ صورت دلخواہ از سرتا بہ پا
رنگ رشکِ زعفرانِ کاشمیر ‖ اور بہ خجلت دہِ مُشکِ خطا

تیری خوش روئی نہیں رکھتی جواب ‖ کیا بیاں ہو وصف تیرے حُسن کا
ہیں مگر کچھ نقص بھی اے جانِ من ‖ کہہ دوں وہ بھی گر نہ مانے تو بُرا
یا وہ گوئی کیجیو میری معاف ‖ آج مجھ کو جوشِ وحشت ہے سوا
گر نہ تجھ سے کیجئے تو اور پھر ‖ کس سے جا کر کیجئے تیرا گلہ
خوشنما ہیں تیری شاخیں ہیں مگر ‖ بے بری میں شاخِ آہو سے سوا
برگِ تر یاقوت سے خوشتر مگر ‖ قاتلِ عُشاقِ بے برگ و نوا
بوئے خوش محسودِ خوشبوئے عبیر ‖ بوئے اُلفت کا نہیں لیکن پتا
رنگ روشن غیرتِ رنگِ شفق ‖ نام کو لیکن نہیں رنگِ وفا

ہیں بہت سی خوبیاں تجھ میں جہاں ‖ ہے وہاں یہ ایک عادت ناسزا
اپنے عاشق سے نہ کرنا التفات ‖ بلکہ اور اُس پر ستم رکھنا روا
تو مجھے ہے جان سے بڑھکر عزیز ‖ گو نہیں تجھ کو مری اُلفت ذرا
آہ تجھ کو میری کچھ پرواہ نہیں ‖ اور میری جان ہے تجھ پر فدا
میری حالت غیر تیرے عشق میں ‖ اور غفلت تیری معمولی ادا
تیرے پیچھے خار کی پروا نہیں ‖ تیرے آگے ڈر نہیں صیاد کا
تیری اُلفت میں مِٹا سب ننگ و نام ‖ ہند سے ایران تک خاکہ اُڑا
عشق نے تو کی ہی تھی بے عزتی ‖ شاعروں نے اور بھی رُسوا کیا

کاش ہوتا تیرے دل میں سوزِ عشق — کاش اُلفت کا مزا تُو جانتا
کاش ہوتا تیرے سینہ میں بھی دل — کاش ہوتا تُو کسی پر مبتلا
کاش عاشق ہوتا تُو میری طرح — اور ملتا تجھ کو تجھ سا دل رُبا
جب تجھے معلوم ہوتی میری قدر — اور کھلتا حال میرے عشق کا
الغرض جب شکوہِ بُلبل تمام — گُل از اول تا بہ آخر سُن چکا
زخم اپنے سینہِ صد چاک کے — اُس نے بُلبل کو دکھا کر یوں کہا
سچ کہا جو کچھ کہا اے مہرباں — باوفا تُو اور میں ہوں بیوفا
کہہ مگر تو ہی ذرا انصاف سے — ہے کہیں جائے رفو اس میں ذرا
ہو گیا قلب و جگر سب چاک چاک — اور سینہ پارہ پارہ ہو گیا
چشمِ گریاں کی بدولت ہر سحر — آنسوؤں سے رہتا ہے دامن بھرا
سبزہِ گلشن پر آتے ہیں نظر — قطرہ ہائے اشک میرے جابجا
تیری ہی خاطر ہے یہ حالِ زبوں — تیرے ہی باعث ہی یہ آفت بپا
حیف تجھ کو اس کی کچھ پروا نہیں — اور پھر دعویٰ ہے مجھ سے عشق کا
بُلبل و گُل کی تو سُن لی گفتگو — سُنیئے اب عرشی کا بھی کہنا ذرا
عشق بُلبل کو نہ گُل کو زینہار — جھوٹ ہے سب دعوئ مہر و وفا
دستِ گلچیں میں ہوا گُل گر ہزار — اُن کے پاس آئے نہ بُلبل کی بلا
دیکھے گُلچیں کو گر آتا گُل کے پاس — پھر سے اُڑ جائے وہ بالائے ہوا
توڑ لے یا چھوڑ دے گلچیں اُسے — وہ نہ دیکھے پھر کہ اُسکو کیا ہوا
ہے یہی احوال گُل کا ہو بہو — جیسے بُلبل کو تھا دعوئ وفا
گُل کو پرواہ بھی نہ ہو مطلق اگر — قید میں ہو بُلبلِ بے دست و پا
گر قفس میں گُل کو بُلبل کے قریب — کوئی رکھدے شاخ سے کر کے جُدا
تو نہ ہوگا وصلِ بُلبل سے وہ خوش — بلکہ اُلٹا اور مُرجھا جائیگا
الغرض دھوکے کی باتیں ہیں یہ سب — کچھ نہیں دُنیا میں جُز مکر و دغا

کوئی دلدادہ نہ ہے دلبر کوئی
اپنے مطلب کا ہے ہر ایک آشنا

لطائفِ تاباںؔ دہلوی

یعنی

نواب شجاع الدین خاں تاباںؔ مرحوم کی زندہ دلانہ زندگی کا ایک ورق

(ایک کیرکٹر اسٹڈی)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو داغ سے صحبت نہیں رہی

مرحوم نواب شجاع الدین خاں تاباںؔ سے دہلی کے بلند طبقہ میں شاید ہی کوئی ہو جو واقف نہ ہو۔ وہ سائل صاحب کے بڑے بھائی تھے اور سائل صاحب کے برخلاف بے انتہا زندہ دل اور ظریف الطبع۔ بلا کے خوش مزاج اور ہنسوڑ واقع ہوئے تھے اور ان کی اس خوش طبعی سے بوڑھے جوان بچے، باپ بیٹے، سب یکساں طور پر مستفید ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جس قسم کے تعلقات ان کے ایک باپ سے ہوتے تھے، بعینہٖ وہی بیٹے سے بھی ہوتے تھے۔ بہت شاندار اور وجیہ انسان تھے۔ دو تین سال ہوئے جب تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال کیا لیکن مرتے دم تک وہی شان تھی۔ دو گھنٹے کے قریب آرائش میں صرف ہوتے تھے اور جب وہ اپنی سپید داڑھی چڑھا کر، آنکھوں میں سرمہ ڈال کر، چوگوشیہ ٹوپی اوڑھ کر، نہایت آہستہ خرامی سے گھر سے نکلتے تھے تو ؎

انگلیاں اُٹھنے لگیں دور سے وہ آتے ہیں

کا دلچسپ منظر پیش ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی موٹے تازے گورے چٹے آدمی تھے۔ اور ان کے "مرد آدمی" ہونے میں کسی کافر ہی کو شک ہو سکتا تھا۔

ہر سال عرس کے عرس اجمیر آیا کرتے تھے اور یہ سات آٹھ روز جس لطف کے ساتھ ان کی معیت و صحبت میں کٹتے تھے ان کی یاد سال بھر رہتی تھی۔ بات کرنے کا انداز بھی نرالا تھا اور کچھ ہر بات کہنے کے بعد چہرہ پر ہنسی کا رنگ پیدا کر کے، ایک بھوں چڑھا کر، گردن کو ایک طرف موڑ کر جب وہ ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیتے تھے تو یہ منظر دیدنی ہوتا تھا۔ ہاتھ بات بات پر ملایا کرتے تھے اور اُن کے پاس بیٹھنے والوں کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ شاعری کا بے انتہا شوق تھا مگر خدا جانے یا تو فطرتاً وہ شاعری کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے یا اپنی لااُبالی طبیعت کے باعث صحیح روحِ شاعری کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے کہ بایں ہمہ ذوق و شوق اُن کا رنگِ شاعری نہ چمک سکا۔ بیحد پر گو تھے لیکن زیادہ تر اشعار صرف "موزونیت" کی حد تک پہونچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ خاص و عام انہیں اُستاد کہا کرتے تھے اور وہ اس سے بیحد مسرور ہوتے تھے مومنؔ غالبؔ، نیّرؔ اور داغؔ کے شاگرد تھے اور ہر اُستاد کے رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر غالبؔ کے

رنگ میں کوئی شعر لکھ لیا تو مومن، داغ وغیرہ پر تبرے بھیجے جا رہے ہیں اور اگر داغ کے رنگ میں کوئی شعر ہو گیا تو غالب و مومن گالیوں کے مستحق بن گئے۔ خود ہی شعر سناتے اور خود ہی داد کے طور پر بانکپن کے ساتھ سینہ تانتے اور پھر جھک کر ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیتے کہ "داغ" ب ــــ "د" کیا لکھا کے ایسا شعر لکھے گا!"

اصل بات یہ ہے کہ ان کا کیرکٹر یہ نہیں تھا کہ وہ ایک شاعر نہیں بلکہ شاعری ان کے دلچسپ کیرکٹر کا ایک جزو تھی، جس نے ان کی ظرافت طبع میں ایک پہلو کا اور اضافہ کر دیا۔ بہت منہ پھٹ، صاف گو آدمی تھے اور اُن کی تیغ زبان سے حکیم اجمل خاں مرحوم سے لیکر گلی قاسم جان کے درزی تک کوئی نہ بچتا تھا۔ چنانچہ جب وہ کہنے پر آتے تھے تو پھر ان حضرات کو سوائے "اُستاد، اُستاد" کہہ کر لپٹ جانے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہتا تھا۔

میرے والد مرحوم بہت سنجیدہ اور متین آدمی تھے اور ہم نے بہت کم ان کو خندۂ دنداں نما کی حد تک پہونچتے دیکھا لیکن دو حضرات کی باتوں پر وہ بھی ہنسی کو نہ روک سکتے تھے۔ ایک تو یہی ہمارے اُستاد اور دوسرے نواب محمد حسین صاحب خضر دہلوی۔ ان موخر الذکر بزرگوار کے حالات بھی لکھنے کے قابل ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور اگر کہیں مضمون اُن کی نظر پڑ گیا اور پھر ملنے کا اتفاق ہوا تو دیکھتے ہی کہیں گے "واہ بے لمڈے یہ ہمیں پر پھبتیاں! بازی بازی با ریش بابا ہم بازی۔ بھلا بے بھلا!"

اُستاد تاباں اپنی "فربھی" کو ایک عجیب ترکیب سے معرض بیان میں لاتے تھے۔ جب کوئی ان کی بات نہ مانتا یا زیادہ دق کرتا تو ترچھے انداز میں سینہ تان کر کہتے "بیلن کی طرح پھر جاؤں گا تو کچومر نکل جائیگا" میرے منجھلے بھائی اس دھمکی کے زیادہ ہدف بنتے تھے، وہ سائل صاحب کے شاگرد ہیں۔ اُستاد گھسیٹ گھساٹ کر انہیں اپنا شاگرد بنانا چاہتے تھے۔ کبھی تو وہ اس بات کو مان جاتے لیکن جب چھیڑنا مقصود ہوتا تو کہتے "جی نہیں، میں سائل صاحب کا شاگرد ہوں!" اُستاد بگڑ کر کہتے "بیلن کی طرح پھر جاؤنگا!"

اُستاد مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے۔ بچپن سے مجھے شعر و شاعری کا چسکا تھا۔ وہ مجھے شعر سناتے میں تعریف کرتا تو بے انتہا خوش ہو کر کہتے "بس تو ہے ایک سمجھدار آدمی، اور کسی ب ــــ "د" کو میں شریف کے نطفہ سے نہیں سمجھتا"۔ بس سمجھ لیجئے کہ جب وہ آجاتے تو ہماری پڑھائی وڑھائی سب طاق پر رکھی رہجاتی۔ فرض کیجئے کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور میں الگ کمرے میں بیٹھا اپنے اسکول کا کام کر رہا ہوں۔

اُستاد گرج کر بولے "صاحبزادے ذرا ادھر تو آؤ!"

میں نے کہا "اُستاد میں اس وقت ذرا اسکول کا کام کر رہا ہوں"

"اسکول! اب ایں! ہم بلاتے ہیں، پھر اسکول کیا؟ شریف کے نطفہ سے تو نہیں معلوم ہوتا۔

یہاں آؤ" گرج کر

چاروناچار مجھے جانا پڑتا۔ میری عمر اس وقت چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔

ایک روز اسی طرح مجھے بلاکر کہنے لگے "ابے اسی لئے تو ہم تجھ سے کوئی بات نہیں کہتے کہ تو سارے جہان میں ڈھنڈورا پیٹتا پھرے گا!" یہ گویا نئی بات سُنانے کی تمہید تھی!۔

میں نے کہا "نہیں اُستاد فرمایئے!"

سینہ تان کر کہنے لگے "ناممکن! ادھر آپ میرے منہ سے سُنیں گے، اُدھر ہر ایک کے کان میں جا پھونکیں گے!" اور یہ کہہ کر ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا "اُستاد آپ تو دیر کر کے میرے شوق کو اور تیز کر رہے ہیں!"

اکڑ کر کہا "ابے اہل زبان ہیں کہ ہنسی ٹھٹھا! بات کا تو تب لطف ہے کہ بات میں بات نکلے!" ہاتھ ملایا۔۔۔ "اب سُنیئے!" بانکپن کے ساتھ گردن ٹیڑھی کر کے کہا "ابے تو سمجھتا کیا ہے، احمل اینڈ کو کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ پڑ گئے۔ مرغ بسمل کی طرح سارے کمرے میں لوٹتے پھرے!"

"آخر ہمیں بھی بتایئے!" میں نے کہا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہنسی اور حیرت کے مارے میرا کیا حال ہوا جبکہ اُستاد نے سینہ تان کر اور اُنگلیاں اوپر کر کے اور تھرک تھرک کر عجیب بھیانک آواز میں گانا شروع کیا "سارے گا، رے گا ما، گا ماپا ماپا دھا، دھانی ی ی ی ی ی سا!" میں بھی سارے کمرے میں لوٹتا پھرتا تھا۔ اور اُستاد خود بھی بیحد خوش تھے!۔

یکایک گرج کر کہا "سُن لیا ہے! اگر تو نے کسی اور سے اس کا ذکر کیا تو ساری زباندانی بھلا دونگا۔ ابے ہم اہل زبان ہیں!"

اتنے میں میرے بڑے بھائی آئے تو تن کر کہنے لگے "اب کہہ دوگے سب قصہ ان سے" ہاتھ ملایا۔

سونے کا انداز بھی انوکھا تھا۔ لیٹنے میں تو وہ کبھی تکیہ رکھتے ہی نہ تھے کیونکہ بازو کافی بھرے ہوئے تھے اور وہ سر کو دو موٹے تکیوں کی بلندی پر خود بخود قائم رکھتے تھے، لیکن رات کو سوتے وقت چت لیٹنے کے لئے تکیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب میری شامتِ اعمال یہ تھی کہ میرا پلنگ ان کے پلنگ کے قریب ہو۔ آتے ہی پوچھتے "صاحبزادے تم کدھر سوتے ہو؟"

میری روح خشک ہو جاتی، کیونکہ اُستاد رات بھر وقفوں کے ساتھ جگاتے رہتے تھے اور باتیں سننے پر مجبور کرتے تھے۔ ان کے سونے کی کیفیت یہ تھی!۔

"جی تو ہوا یہ کہ خر خر خٹ خٹ خر خر۔ سن رہے ہو نا۔ خر خر خٹ خٹ۔ جواب بادن تولہ۔۔۔ اماں کیا سو گئے؟ لاحول ولاقوۃ ہم چھیک خر خر خٹ خر خٹ ۔۔۔۔۔۔" وقس علیٰ ہذا۔

یعنی خود تو اس طرح سو لیتے تھے اور دوسرے کے لئے بھی چاہتے تھے کہ وہ اسی طرح سوئے۔
"سیدو!" ملازم کو پکار کر کہتے "ہمارا پلنگ صاحبزادے کے پلنگ کے پاس لگیگا!"
میں کہتا "اُستاد! خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ رات بھر آپ سونے نہیں دینگے اور......"
"بک مت!" چنگھاڑ کر کہتے۔
اگر میں باوجود اس کے اپنا احتجاج قائم رکھتا تو کہتے "کیونکہ بے! ہم جیسے معزز مہمانوں کی یوں تواضع کی جاتی ہے۔ ہمیں نکما سمجھتا ہے۔ کہو نگا قبلہ شیخ صاحب سے!"
یہ ایسی دھمکی تھی جس کے بعد دم مارنے کی گنجایش نہ ہو سکتی تھی۔ سات آٹھ روز تک یونہی نیند حرام ہوتی تھی۔

ایک دفعہ رات کے نو دس بجے درگاہ معلیٰ سے واپس آئے تو دور سے مجھے للکارا "اماں صاحبزادے! دیکھو آج ہم تمہارے لئے کیا تحفہ چیز لائے ہیں، پھر کہدیجئے گا کہ رات بھر جگاتے ہیں۔ اُلو!!" گرجکر۔
میں نے کہا "اُستاد ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے ہیں!"
بہت خوش ہوکر کہنے لگے "حضرت بارہ بجے تو آپ ہی بولتے ہیں۔ کیوں بے یہ یاروں پہ ہی فقرہ بازی!" ہاتھ ملایا پھر گرجکر بولے "دیکھ یہ ہم تیرے لئے کیا نامی بسکٹ لائے ہیں۔ اب یہ صبح چار کے ساتھ اُڑیں گے علی الصباح۔ سُن لیا تو نے۔ آٹھ بجے تک منحوسوں کی طرح پڑا سوتا رہتا ہے!"
میں نے کہا "اُستاد تین بجے تک آپ سونے نہیں دیتے....."
چنگھاڑ کر کہا "خاموش بے ادب!"
یہ قصہ تو یہاں ختم ہوا۔ اب صبح دیکھتے ہیں تو اُستاد ساڑھے پانچ بجے سے آوازوں پر آوازیں دے رہے ہیں!"
"ابے اُٹھ جا۔ اُڑ رہی ہے جرعہ جرعہ! او کاہل الوجود........ ایں کروٹ لی اور پھر غائب... اب اُٹھ جائیے بندہ پرور...... سیدو پلنگ الٹ دو اس کا..... او منحوس جب ہی تو تجھے شاعری نہیں آتی ..... دگر جکر، او شست نظم حسد چہ می بری۔ قبولِ خاطر و لطف سخن خداداد است....... ہم سے دون کی لیتا ہے..... ابے ہم اہل زبان ہیں...... ایں واللہ، اے بندہ نواز اُٹھ بیٹھئے....... ہم کب تک بھونکتے رہیں ــــ وغیرہ وغیرہ!"
آخر میں تنگ آکر آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ آپ چائے کا سامان لئے بڑے اہتمام سے میرے پلنگ کے پاس بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا "اب سُنئے، دو بسکٹ نکالے، ایک اپنے لئے ایک آپ کے لئے۔ اتنے میں آ گئے میاں ظہور الدین۔ اب میں نے سوچا کہ ایک بسکٹ انہیں دیتا ہوں تو تین بسکٹوں کا خون

ہوگا۔ ادھر تو ایک پاجی، بغیر بسکٹ کے مانیگا نہیں، آخر دتن کر انگلی سے نصفا نصفی کا اشارہ کرتے ہوئے، نصف خود لیا، نصف میاں ظہور الدین کو دیا اور یہ ایک آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ نہ کہو گے کس ترکیب۔ ہم ایک بسکٹ بچا لیا۔ ابے ہم اہلِ زبان ہیں "

میں نے جھلا کر کہا "بھاڑ میں جائے آپ کا بسکٹ۔ نیند حرام کی!"

کہنے لگے "اب جائیے منہ دھو کر آئیے شریفوں کی طرح اور پھر اُڑنے لگے جرعہ جرعہ!"

میں نے اور جھلا کر کہا "چولھے میں جائے جرعہ جرعہ"

تن کر کہنے لگے "بیلن کی طرح پھر جاؤں گا"

سب سے زیادہ لطف تو اس عرس میں آتا تھا جب کبھی علامہ بیدؔل شاہجہانپوری مرحوم ایڈیٹر "مخزن" بھی آتے تھے۔ وہ بھی بے انتہا ظریف تھے اور اُستاد کی اور اُن کی خوب چوٹیں رہتی تھیں۔ بیدؔل صاحب بہت دُبلے پتلے نازک اندام مختصر القامت انسان تھے اور تن و توش کے لحاظ سے انہیں اُستاد سے وہی نسبت تھی جو ایک درخت کی پُھننگ کو اس کے ٹہنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جہاں تک زبانی گفتگو کا تعلق تھا وہاں تک بیدؔل صاحب اُستاد کو کافی ستاتے تھے لیکن جب کبھی اُستاد اپنی قوتِ جسمانی کے مظاہرے پر آمادہ ہو جاتے تو بیدؔل صاحب بغیر ایک سکنڈ کے توقف کے صلح کی سفید جھنڈی ہلا دیتے تھے۔ بیدؔل صاحب کا بیان تھا کہ اُن کے والد کے ساتھ بھی اُستاد کے بعینہٖ یہی تعلقات تھے جو ان کے ساتھ ہیں!۔

ایک روز میں نے بیدؔل صاحب سے کہا "کوئی ایسا شعر بتائیے جس میں ردّ العجز علی الصدر کی صفت ہو!"

بیدؔل صاحب نے اُستاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جڈّا گلخیرو سے پوچھو"

میں نے اُستاد کے چھیڑنے کے لئے کہا "جی نہیں مجھے اُستاد کی اُستادی میں کلام ہو گیا ہے۔ کل یہ ایک شعر میں مجرّد جوالہ بمعنی شعلہ باندھ گئے تھے جب میں نے اعتراض کیا تو بپھر گئے لیکن بعد میں چپکے سے درست کر لیا"

بیدؔل صاحب نے منہ بنا کر اُستاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مہمل ہیں"

اُستاد نے گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے اور ہاتھ سے "آلو بخارا" کا اشارہ کرتے ہوئے بیدؔل صاحب سے کہا "بٹیر کے برابر تو آپ کا قد اور اکڑفوں کا یہ حال، ابے پاجی تو ٹینی ہو کر اصیلوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ ابے ہم اصیل ہیں اصیل"

"واذا ٹلل!" بیدؔل صاحب نے ہاتھ سے "ٹیڑھی کھیر" کا نقشہ بناتے ہوئے کہا۔

اُستاد نے بانکے ہو کر ہنستے ہوئے کہا "حضرت یہ نرت تو ہمیں پسند نہیں آیا۔ ابے گدھے

بے وقت کی الاپتا ہے!"

بیدل صاحب نے ناک پھلا کر کہا "بکو مت جی۔ ہونہہ، آپ ہیں کیا۔ چو لشیم است پدی چہ جھنکارِ اُو"

اُستاد نے ترچھے ہو کر کہا "بندہ نواز! یہ تو ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ پدی کون ہے؟" ایک پاس بیٹھے ہوئے شخص سے ہاتھ ملایا۔

پھبتی کراری تھی۔ بیدل صاحب پر چھا گئی۔ اہلِ بزم نے قہقہہ لگایا۔ بیدل صاحب نے بھنا کر کہا "جہل ہو!"

اُستاد نے کہا "ابے اُلو تو یوں نہیں مانے گا!"

"زیں زپٹ کے زنا دقال ثنا!" بیدل صاحب بولے۔

اُستاد نے پینترا بدلتے ہوئے اُٹھنا چاہا۔ بیدل صاحب نے لپک کر قدم لئے اور بڑی لجاجت سے کہا "اُستاد آج طبیعت میں غیر معمولی فنا دگی محسوس کر رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے آپکی قدمبوسی کروں"

اُستاد نے تن کر کہا "ادریہاں غیر معمولی اُستادگی ہے، جی چاہتا ہے آپ کی چندیا پر ایک دھپ دیجئے!"

بیدل صاحب نے کہا "اعتبار ہے اُستاد، میں آپ کا شاگرد بھی تو ہوں!"

بہت خوش ہو کر بولے "خیر بخشیدم، اگرچہ مصلحت ندیدم"

اُستاد میں ایک عجیب عادت تھی۔ ایک جنگی قلمدان سفر و حضر میں اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اسی میں ان کی سب ضروری و غیر ضروری چیزیں بھری رہتی تھیں۔ آپ کو وقت بے وقت شعر کہنے کی سوجھتی اور اُسے کھول کر شعر لکھنے بیٹھ جاتے۔ اب اس قلمدان میں اگر کوئی ہاتھ ڈالتا تو پہلی مرتبہ تو اس کا ہاتھ روک دیتے، لیکن اگر ایک دفعہ اُس نے اُستاد کا ہاتھ جھٹک دیا تو اب اُستاد نیت کی طرح ہاتھ باندھے بیٹھے ہیں۔ زبان سے منع کئے جا رہے ہیں لیکن ہاتھ نہیں بڑھاتے "اماں، اماں جاؤ بھئی، اس میں سب میری ضرورت کی چیزیں ہیں۔ اب موزہ نہ اُڑا لیجئے گا میرا۔ ابے الو دربار میں پہن کر جانے کا ہے۔ ایں یہ میری دستیوں پر کیوں نظر ہے آپ کی۔ ذرا یہ ڈھکنا اُلٹ کر دیکھو، کیا نازک کلائی کی گھڑی ہے۔ مگر ہاتھ نہ لگائیے گا وغیرہ وغیرہ!"

ایک دن میں اسکول سے آیا تو اُستاد قلمدان کھولے سوچ میں بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "کیا بات ہے اُستاد!"

گرجکر کہا "ملعون ہو جو تمہیں آج سے شریف سمجھے، یہ کون سی بھلمنسی ہے۔ کپڑے اُتاریئے، کتابیں رکھئے پھر آکر شریفوں سے باتیں کیجئے"

میں نے کہا "استاد خیر تو ہے!"

بگڑ کر کہا "خیر کہاں سے ہو، وہ آپ کے پیرِ مغاں کفوں کے طلائی بٹن اُڑا کر لے گئے"

میں نے حیران ہو کر کہا "کون پیرِ مغاں!"

تنکر کہا "وہی آپ کے بیدل، بے جگر، بے عقل!" ہاتھ ملایا۔

میں نے ہنس کر کہا "استاد آپ تو غضب کرتے ہیں۔ میں سمجھا واقعی بٹن چوری گئے۔ پھر بیدل صاحب کو آپ نے روکا نہیں"

"ابے اُلو روکتا کیسے، ہاتھ جو جھٹک دیا اس کمبخت نے" ہاتھ ملایا۔

استاد کے چھوٹے بھائی ابو المعظم نواب سراج الدین خاں صاحب سائل، داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ سائل صاحب کو اپنے ہمعصروں اور ہمسروں میں ایک خاص شاعرانہ امتیاز حاصل ہے اور استاد تاباں کو بہ ایں معنی ان سے کوئی ... . مناسبت نہیں۔ لیکن استاد مرحوم بالکل اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ اُن کے مقابلہ میں سائل صاحب کو کسی قسم کی بھی اہمیت دی جائے۔

اس زمانہ میں مجھے سائل صاحب کی وہ مشہور غزل یاد تھی جس کا ایک مصرعہ یہ ہے:۔

برسا دے اب کی فصل میں اللہ میاں شراب

میرے منجھلے بھائی استاد کو چھیڑنے کے لئے مجھے اشارہ کر دیتے اور میں یہ غزل پڑھنی شروع کر دیتا۔ استاد قہر کی نگاہوں سے (رلا See w) مجھے دیکھتے رہتے اور پھر تن کر کہتے "بندہ پرور وہ سائل اور آپ ٹکڑ گدے۔ اینجانب سے تو بس آپ کی بات چیت بند" پھر گرجکر کہتے "یہاں آؤ!" اور اپنی بیاض نکال کر دیتے کہ "قصاص کے طور پر ہماری تین غزلیں اسی لہجہ میں پڑھو۔ ہمارے مقابلہ میں غیار کا نام جپتا ہے۔ گستاخ!"

ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے کہا "استاد آپ ہمارے اخلاق و تواضع سے تو بار بار اپیل کرتے رہتے ہیں لیکن والد ماجد سے کچھ نہیں کہتے۔ اگرچہ یہ میری پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کبھی استاد داغ یا پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ آتے تو اُن کے قیام کے لئے الگ کمرے مخصوص کئے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے والد نے آپ کو اپنے دوستوں میں نہایت معمولی اور گھٹیا قسم کا درجہ دے رکھا ہے کہ آپ کو عام مہمانوں کے ساتھ ٹھیرایا جاتا ہے"

بانکپن کے ساتھ کہا "اچھا یہ بات ہے۔ آلینے دو!"

میں نے رازدارانہ انداز میں کہا "میرا نام نہ لے دیجئے گا!"

کہنے لگے: "ہش! ہم اہلِ زبان ہیں!"

اتنے میں والد تشریف لے آئے تو آپ عجیب انداز میں سینہ پہ ہاتھ رکھکر کھڑے ہو گئے اور کہا: "بندگانِ عالی متعالی سے کچھ عرض کرنا ہے، اگر اجازت ہو تو غلام کچھ عرض کرے!"

"فرمائیے فرمائیے" والد نے اخلاق سے کہا: "آخر اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت ہے!"

اُستاد بگڑ کر بولے: "بندہ پرور معاف کیجئے۔ میں آج کی تاریخ تک آپ کو شریف ابنِ شریف سمجھتا رہا تھا"

"خیریت خیریت، یہ آج نزلہ مجھ پر کیوں گر رہا ہے!"

داد طلب انداز میں تنکر کہا: "اس لئے کہ آپ عضوِ ضعیف ہیں" ہاتھ ملایا۔

والد نے کہا: "لیکن خفگی کا راز نہیں کھلا"

کہنے لگے: "سُنیئے جناب، بندہ شریف ابنِ شریف، نجیب الطرفین، شریف الجانبین، اگر تردد ہو تو اپنا شجرۂ نسب پیش کرے، پھر ایں چہ معنی دارد کہ آپ ایسے فرومایہ لوگوں کو جن کی شرافت پر داغ ہو ممتاز قیامگاہیں عطا فرمائیں اور نیازمندانِ قدیم کو عوام میں شمار کریں!"

والد نے کہا: "اُستاد آپ نے کب اس بات کی خواہش ظاہر کی آپ کیلئے بھی یہی انتظام ہو سکتا ہے۔ چونکہ آپ دل سے قریب ہیں اس لئے میں آپ کو نگاہوں سے قریب رکھنا چاہتا ہوں"

بہت خوش ہو کر بولے: "بد اصل ہو جو علیحدہ کمرے کا خواستگار ہو"

والد نے مسکرا کر کہا: "اسی پر آپ ناراض تھے"

سادگی سے جواب دیا: "صاحبزادے کے بہکائے میں آگیا تھا"

والد نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اُستاد سے کہا: "آپ اس شریر کی باتوں میں کیوں آتے ہیں؟"

لیکن اس کامیڈی کا ایک المناک پہلو یہ تھا کہ والد مرحوم نے اس دن دو تین گھنٹہ تک ہم سے بات نہ کی اور چونکہ ہم سب سے چھوٹے اور سب سے چہیتے بیٹے تھے، اس لئے ہمارے لئے یہ سزا نہایت صبر آزما تھی۔

اسی زمانہ میں مجھے بدایوں کے ایک ماسٹر پڑھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہیں چند بار اُستاد کے حضور میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک دن وہ آئے تو اُستاد کہیں گئے ہوئے تھے۔ مجھ سے ویسے ہی پڑھاتے میں انہوں نے پوچھ لیا کہ "آج اُستاد بنکو کہاں گئے ہوئے ہیں!" میں اس وقت تو چپ ہو گیا لیکن بعد میں میں نے اُستاد سے کہا: "اُستاد! ہمارے ماسٹر صاحب نے آپ کا نام "بنکو" رکھا ہے"

ایک بھوں چڑھا کر کہنے لگے "بنکو چہ معنی دارد؟"
میں نے کہا "معلوم نہیں، غالباً بانکپن سے کچھ اشتقاق کیا ہے!"
بگڑ کر بولے "اور یہ آپ کیا جانیں اشتقاق کس چڑیا کا نام ہے، گنوار"
میں نے کہا "خیر اب آپ ان سے ذکر نہ کر دیجئے گا کہ میں نے یہ خبر آپ کو پہونچا دی ہے!"
کہنے لگے "ادب! ہم اہلِ زبان ہیں!"
دو تین روز کے بعد ماسٹر صاحب اُستاد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے اُستاد سے شعر سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اُستاد نے ترچھے ہو کر تسلیمات کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "بندہ نواز شعر سُنانے میں تو کوئی قباحت نہیں ہے مگر بنکو بھی تو پھر میں ہی ہونگا"
خیر یہاں تک غنیمت تھا۔ لیکن قیامت تو یہ ہوئی کہ اُستاد نے یہ کہنے کے بعد حد درجہ پر اعتماد تبسم کیساتھ ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔
ماسٹر صاحب کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس کے بعد وہ مدتوں ہم سے انتقام لینے کی فکر میں رہے۔ لیکن میں نے ان کی اس کوشش کو اس ترکیب سے بار ور نہ ہونے دیا کہ جب وہ پڑھانے آتے تو میں والد کے سامنے بیٹھ کر پڑھتا۔

ایک مرتبہ اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں بھی وہیں ٹھیرا جہاں اور لڑکے ٹھیرے تھے۔ اور دوسرے روز اُستادِ مرحوم سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ لیکن میرا ہاتھ ان کی ہاتھ کی گرفت میں تھا اور نگاہیں بار بار دروازہ تک ہو کر آجاتی تھیں۔ آخر مشتبہ انداز میں پوچھا "اور یہ آپ کا سامان کہاں ہے؟"
میں نے کہا "اُستاد ہمیں اسکول کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ میرے سب ہم جماعتوں نے ایک جگہ قیام....... !"
آگ بگولا ہو کر کہا "کمین ہو جو آج سے تمہیں شریف سمجھے اور مردود ہو جو آیندہ تمہارے ہاں ٹھیرے۔ شریف کے نطفہ سے تو نہیں معلوم ہوتے۔ میں آج ہی ارجنٹ تار سے تمہاری شکایت اجمیر بھیجتا ہوں!"
میں نے بڑی تو تھبو کے بعد اُستاد کو دھیما کیا اور صورتِ حال ان کے ذہن نشیں کرائی۔ آپ مرحمتاً مسکرائے اور کورنش بجالانے کے انداز میں جھکتے ہوئے گویا معافی کے لہجہ میں کہا "اخاہ! جناب کا وطن مالوف؟؟"

اس کے دوسرے تیسرے روز میں پھر گیا تو آپ شطرنج میں مشغول تھے۔ سائل صاحب اور

چند دیگر حضرات بھی شریک تھے اور ایک معرکہ دار و گیر کا قائم تھا۔ میں اس سے پہلے ایک صاحب کا قصہ سُن چکا تھا کہ وہ اُستاد سے ملنے گئے تو اُستاد شطرنج میں محو تھے ایک دفعہ اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور کامل بیس منٹ تک اُن کا ہاتھ ایک ہاتھ میں لئے بیٹھے رہے اور دوسرے ہاتھ سے مُہرے چلتے رہے۔ آخر کار وہ صاحب اکتا کر چلے گئے اور اُستاد کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جب دوسرے دن ملے تو اُستاد کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کل آکر ان سے ملے تھے۔ میں نے اسی لئے حفظ ماتقدم کے طور پر جاتے ہی بساط اُلٹ دی۔ اُستاد نے تو گردن ہلاتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ لیکن سائل صاحب اُستاد کے برخلاف ذرا سنجیدہ آدمی ہیں۔ اپنی عادت کے موافق انہوں نے براہ راست تو مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن ایک ہلکی سی جائز ناگواری کے ساتھ یہ ہوائی اُڑائی کہ "ان کے سب شاگرد ایسے ہی گستاخ ہیں!"

بچپن کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں آدمی کم کسی کو خاطر میں لاتا ہے اور میں تو ویسے بھی "کہ جہائے تو" کی وجہ سے اپنے بزرگوں کی خدمت میں گستاخ تھا۔ میں نے بھی ہلکی سی "ناجائز ناگواری" کے ساتھ جواب دیا "لیکن آپ کے شاگردوں کو اس کی بھی توفیق نہیں۔"

اہل انجمن تو میری اس ناروا گستاخی پر صرف ہنس ہی دیئے لیکن اُستاد نے اس قدر تحسین و مرحبا، اس قدر داد و آفریں کی نظر سے مجھے دیکھا، جیسے کہ میں نے ان کی اُستادی کی گرتی ہوئی عمارت کو بروقت سنبھال لیا ہو ---!!

غرض کہاں تک بیان کیجئے۔ یہ تھوڑا بہت جو لکھا گیا ان کی دلچسپ سیرت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، ورنہ ویسے تو ---!

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

وہ عمر بھر اس الم آبادِ گیتی میں اپنے احباب، اپنے عزیزوں، اپنے پڑوسیوں اور اپنے ملنے جلنے والوں کو غم فراموشی کا سبق دیتے رہے۔ ان کی صحبت لوگوں کے لئے ایسی ہی تھی، جیسے تپتے ہوئے صحراؤں میں ایک قطعۂ دل کشا مل جائے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُستادِ مرحوم کو خود خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رہنا آتا تھا۔

افکارِ زمانہ اور آلامِ روزگار سے کسی زندانی حیات کو بھی مفر نہیں۔ مگر کم ہیں جو اُستاد تاباں کی طرح سفرِ زندگی کو اس قدر خندہ رویانہ اور دلیرانہ طور پر طے کر جائیں ---

تربتش عنبریں باد!!!

اعظمی اجمیری

غزل

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری
بی۔اے

یہ کیوں گردن جُھکا لی کیا سبب تھا
تمہیں تو دیکھ لینا بھی غضب تھا

ہوئے نادم جو ہم اِس بیرُخی سے
تبسّم کیوں تمہارے زیرِ لب تھا

ہمارے دِل پہ کیوں شک کر رہے ہو
محبّت کا تقاضا تم سے کب تھا

طبیعت مُنکسر واقع ہوئی ہے
یہ سب اخلاق تھا پاسِ ادب تھا

وہی پہلی مُروّت ہیل مِلت
وہی اخلاص اب بھی ہے جو تب تھا

تمہیں تو خود سکھا دیتے ہو سب کچھ
ہمیں احساس اس کا پہلے کب تھا

ہوا مقبولؔ اب معلوم ہم کو
کہ دل لینے کا یہ بھی ایک ڈھب تھا

ہمارے تعلیمی نصاب پر ایک نظر

ازجناب نصیرالدین صاحب ہاشمی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس، ایف۔ آر۔ ایس۔ اے۔ ریسرچ اسکالر

ملک اور قوم کی ترقی کے لئے ایک مناسب اور بہتر نصاب تعلیم کی ضرورت مسلم ہے۔ ایک ایسے نصاب تعلیم کی ضرورت سے کوئی استغنا نہیں ہو سکتا کہ جو ملک کی ضروریات اور اس کے ماحول کے لیئے موزوں اور مناسب ہو۔

ہمارے مدارس اور کالجوں میں جو نصاب مقرر ہوتا ہے وہ ہماری ضروریات اور ہمارے ماحول کے لحاظ سے اصلاح اور ترمیم کا سخت محتاج ہے۔ موجودہ نصاب ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتا اس سے ہماری ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ ہمارا نصاب ایسا ہونا چاہیئے جو ہر طالب علم کو امن پسند شہری، وفادار فرد رعایا۔ مہربان باپ، اطاعت گذار بیٹا، غم گسار شوہر اور قابلِ اعتماد دوست بنا سکے، یہ ہمارے درد کی دوا ہوگا۔ ایک ایسا نصابِ تعلیم ضروری ہے کہ جس کے ذریعہ نہ صرف طالب علم کے کارآمد معلومات میں اضافہ ہو، بلکہ اس کے دماغ کی کچھ اس طرح تربیت ہو کہ وہ اہم مسائل پر غور کرنے اور رائے قائم کرنے کا بھی عادی ہوتا جائے۔ دماغی اور ذہنی قوا شل نہ ہوتے جائیں بلکہ صیقل ہوتے جائیں۔ جسمانی قوا فنا نہ ہو جائیں بلکہ نشو و نما پاتے جائیں۔ طالب علم کا جو فطرتی رُجحان ہے وہ دب کر اس کو اُس کی آیندہ زندگی میں حیران و پریشان نہ کر دے، بلکہ کش مکش حیات میں اس کو جو حصہ لینا ہے اس کا راستہ اوّل ہی سے نظر آتا جائے۔ جس پیشہ کو وہ اختیار کرنے کیلئے اپنے فطرتی رجحانات کے لحاظ سے موزوں ہے اس کے لئے ابتدا ہی سے ہمت بندھتی جائے۔

اسی کے ساتھ ان کے نصابِ تعلیم کا بھی مسئلہ ہے جو ہماری جلوت کی انیس اور خلوت کی جلیس ہوتی ہیں۔ اگر وہ چاہتی ہیں کہ پان چبا کر، دھڑی مسی کی جما کر، کاجل آنکھوں میں لگا کر صرف چراغ خانہ بنی رہیں بلکہ نئی روشنی ہیں گیسو تراش کر غازہ مل کر نئے ڈھنگ کے لباس میں سینہ کی برہنگی ساعد و دوش کی عریانی کے ساتھ حُسن اور رعنائی کو نُمایاں کرتے ہوئے پوڈر اور لیونڈر کی مہک کے ساتھ منظر عام پر جلوہ نما ہوں اور شمع محفل بنیں تو شوق سے بنیں، چشم ما روشن دل ماشاد۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اس کا بھی سامان مہیا ہو کہ ہماری مائیں اس سرزمین کے رامزے میکڈانلڈ بھی پیدا کریں۔ لائڈ جارجوں کو بھی وجود میں لائیں، مارش ہیگو کو بھی پیدا کریں، موسیولینی بھی پیدا ہو اور فان ہندن برگ بھی۔ ماؤں کے دودھ سے ہی بچے کی سرشت میں علم و عرفان کا خون ساری ہو سکے۔ بلند اخلاق اعلیٰ تہذیب کا نمونہ ماؤں کی گود سے ہی نظر آنے لگے۔ محبت و ملنساری کا سبق بھی وہیں مل جائے۔ اگر اسی کے ساتھ پردہ اُٹھ جاتا ہے تو اُٹھ جانے دیجئے۔ یہ کوئی بُری

اور گراں قیمت چیز نہیں ہے کہ نہ ادا کی جاسکے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ قیمت ادا کر کے کونسی متاعِ گراں مایہ ہم خریدتے ہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ معاملہ کی گفت و شنید ہی میں مشرقی شرم و حیا کی اعلیٰ روایات مغربی عنائی اور دلربائی سے بدل جائیں۔ مشرقی عفت و عصمت مغربی آزادی کی نذر نہ ہو جائے۔

واضح ہو کہ عورتیں ہماری تہذیب میں ہمیشہ سے مردوں کے دوش بدوش رہی ہیں۔ اُس قدیم ادب پر نظر ڈالئے کہ جو اب گویا افسانۂ کہن ہے۔ شریمتی سیتاجی نے اپنے شریف ترین اصول زندگی کے لئے ایک غیر فانی نمونہ بنا کر پیش کیا۔ اس کے بعد اس اعلیٰ اصل تاریخی زمانہ کی سیر کیجئے جس نے نورجہاں اور چاند بی بی جیسے ناموں کو متبرک سمجھ کر محفوظ رکھا ہے۔

ہماری اس سرزمین میں کم از کم مسلمانوں کی حد تک عورتوں کو حقوق قانون اور وراثت کے لئے مردوں سے جنگ کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے وقت ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے۔

ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم تعلیم و تربیت کے لئے خود اپنے اسلاف کے ترکہ کو پھر کھولیں اور اسکے گرانقدر اور بیش بہا نتائج بھی دیکھ لیں۔

مردوں کے لئے ہو یا عورتوں کے لئے ہمیں ایک ایسے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے کہ اس ملک میں بسنے والی مختلف قوموں میں خیر سگالی اور رواداری کے قدیم تاریخی زریں روایات مضبوط سے مضبوط ہوتے جائیں۔ میل جول اور ربط و ضبط کی خوشگوار فضا بچپن کے معصوم زمانے سے شوق و سرور کی پُر کیف حالت پیدا کر سکے۔ اور مادرِ ہند کے سپوتوں میں کام کرنے کا ولولہ اور شوق پرائمری سکولوں سے ہی شروع ہو جائے۔ ہم لوگ خواہ مسلمان ہوں، خواہ عیسائی، خواہ پارسی ہوں، خواہ ہندو، اپنی اس ذمہ داری کا احساس ابتداء ہی سے کرنے کے خوگر ہو جائیں، جس سے ہمارے ملک کا نام تمام دنیا میں روشن ہو، دماغی آزادانہ ترقی اور ہر شخص کے لئے چشمۂ ہدایت کا مترادف بن کر گونج اُٹھے۔ اور ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ہم نے اس اصلی اخوت کے شاندار اصول سے سبق حاصل کیا ہے جو دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیم ہے۔ ایسی اخوت جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا۔ مخالفت توڑ نہیں سکتی اور موت تباہ و تاراج نہیں کر سکتی۔

نصیر الدین ہاشمی

دل کے ٹکڑے!

(۱)

کسی نے میرے دل کے دروازہ پر دستک دی ۔۔۔! آہ یہ کون ہے؟۔ خاموشی ۔۔۔ خاموشی ۔۔۔ یکسر خاموشی ۔۔۔ سوائے ایک خیالی آواز کے ۔۔۔ ایک تصور ہی تصور کے ۔۔۔!!۔

کوئی چمکتی ہوئی چیز اندھیری راتوں میں مجھے گھورتی ہے ۔۔۔ آہ یہ کیا ہے؟۔ ایک درخشاں ستارہ جو آسمان کی سیاہ گہرائیوں میں چمک رہا ہے!!۔

یہ کس کی ہنسی ہے ۔۔۔ یہ کس کا تبسم ہے جس نے میرے دل کے کمزور پردوں کو اپنے برقی لرناں سے روشن و منور کر رکھا ہے ۔۔۔ جس طرح سیاہ بادل میں بجلی کوندتی ہے!!۔

ہاں ۔۔۔ اب مجھے معلوم ہوا ۔۔۔ اب میری سمجھ میں آیا ۔۔۔ یہ تو میرا مالک ہے ۔۔۔ میرا خدا ہے ۔۔۔ میرا پروردگار ہے ۔۔۔!!

(۲)

مجھے معلوم ہے کیوں چڑیاں چہچہاتی ہیں ۔۔۔ آفتاب کی پہلی کرن انہیں نیند سے بیدار کر دیتی ہے، ان کے نغموں کا الاپنا ۔۔۔ اُن کا بعض وقت خاموش ہو جانا ۔۔۔ پھر یکایک سب کا متفق ہو کر ایک شور برپا کرنا ۔۔۔ یہ سب آخر کیا ظاہر کرتا ہے ۔۔۔؟

ہاں مجھے خبر ہوگئی، کیوں پھول اپنی خوشبو ہوا میں منتشر کر دیتا ہے ۔۔۔ اور کس فیاضی کے ساتھ اپنا بہترین جوہر ہوا جیسی آوارہ گرد، ہر جائی کے قدموں پر ڈال دیتا ہے ۔۔۔!

ہاں میں اچھی طرح سمجھ گئی ۔۔۔ کیوں آبشار دیوانہ وار بہتے ہیں ۔۔۔ کیوں چٹانوں سے سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ کیوں پھر سمندر کی تہ میں غائب ہو جاتے ہیں ۔۔۔!!

پھولوں کو شبنم کیوں آنسوؤں کا ہار پہناتی ہے ۔۔۔ سبز زمردین پتوں پر اپنا خونِ دل نچھاور کرتی ہے، بلبل آکر ان قطروں کو پی جاتی ہے، غنچہ چٹک کر کھل جاتا ہے، رازِ عالم سے واقف ہو کر پھر اس کی ہر پنکھڑی ہوا میں منتشر ہو کر نذرِ خزاں ہو جاتی ہے ۔۔۔!!

یہ سب ہنگامہ، یہ سب سرگرمی، زبانِ حال سے گویا ہیں کہ انہیں تلاش گوہرِ مقصود سرگرداں رکھتی ہے،

(۳)

یہ کونسی نامعلوم محبت ہے جو میرے دل میں سلگ رہی ہے ۔۔۔ ایک آگ ہے کہ لگی ہوئی ہے، جس کے شرارے گھڑی بھر کو نہیں بجھتے ۔۔۔ دل ہے کہ کمبخت اس کو تو کسی پہلو قرار نہیں ۔۔۔ یہ آخر کس کی

محبت ہے جو مجھے دیوانہ کر رہی ــــــ؟

زندگی کے اس باغ میں ــــ جو اک میری رہگذر ہے ــــ مجھے ایک بھولی بسری لطیف خوشبو آرہی ہے، وہ کون ہے جس نے میرے غریب دل کو داغ لگا دیا؟ جس کی جلن سے میرا سینہ جل گیا۔ دل جل گیا منہ سے دُھواں نکلنے لگا ــــ آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں ــــ! سر چکرانے لگا ــــ آہ میرا دل ایک شمعِ سوزاں کی طرح جل رہا ہے!!

جب خلیلؑ آتش نمرود میں گر گئے تھے کس نے اس آگ کو ٹھنڈا کیا تھا ــــ؟ اور کس نے انہیں جلنے سے بچالیا ــــ؟ آہ کیا وہی طاقت، وہی قوت، وہی نامعلوم ہستی، میرے دل کی جلن کو ٹھنڈا نہیں کرسکتی ــــ؟ جب کہ یہ جلن ــــ یہ سوزش ــــ یہ خلش بھی اُسی کی یاد میں ہے!! مگر..... افسوس ؎

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کہوں کیا کارفرما جل گیا

"ح"

غزل

ازجناب محمد عبدالجلیل سائل بنگلوری

داغِ اُلفت کی یہ کثرت دل میں
گویا موجود ہے جنت دل میں

میں نے ہر چیز کو مٹتے دیکھا
کیا رہے پھر کوئی حسرت دل میں

جو چھپائے سے نہیں چھپتا ہے
ہے وہی رازِ محبت دل میں

اس سے اللہ کا مطلب کیا تھا
دی ہے کونین کی حسرت دل میں

سر میں سودا ہے تری زلفوں کا
اور ہے تیری محبت دل میں

آنکھیں پہلو پہ جمی رہتی ہیں
دیکھتا ہوں تری صورت دل میں

رنگِ راحت سے مبدل ہوکر
بن گیا عیش بھی زحمت دل میں

شوق سے آؤ یہاں آکے رہو
کیوں تمہیں ہوتی ہے وحشت دل میں

میں نے ہر کام خدا پر چھوڑا
بن گیا غم بھی مسرت دل میں

دل کی حسرت کبھی پوری ہو جائے
اور کچھ بھی نہیں حسرت دل میں

کثرتِ غم سے جگہ جب نہ ملے
کیا رہے آکے مسرت دل میں

آئینہ رو ہیں وہ لیکن سائل
رکھتے ہیں مجھ سے کدورت دل میں

دہلی

(از حضرت علی اختر اختر)

آہ، اے دہلی! بہشتِ عشرتِ عہدِ کُہن — مہر و مہ سے تھی کبھی آباد تیری انجمن
پھول تیرے باغِ عشرت کی ہوا کھائے ہوئے — اس فضا میں آج بھی ملتے ہیں مُرجھائے ہوئے
اے دیارِ نامُرادی، اے مزارِ رنگ و بُو — تیری رگ رگ میں رواں ہے تاجداروں کا لہو
کتنے گُلشن کھِل چکے ہیں اِس خس و خاشاک سے — کتنی تہذیبیں بنی بگڑی ہیں تیری خاک سے
مدتوں کی پاسبانی گردشِ ایام کی — مدتوں تو نے سنواریں قسمتیں اقوام کی
مٹ نہیں سکتے جہاں سے تیری عظمت کے نشاں — کون کہہ سکتا ہے ٹھنڈے دل سے تیری داستاں
تو کہاں اے یادگارِ کاروانِ محتشم — رہ گیا ہے جانیوالوں کا فقط نقشِ قدم
ابتدائے سوری و خلجی سے تا عہدِ مغل — اک صدا تھی، گونجتے تھے جس سے میدان و جبل
کیا ہوا اے دہلیِ برباد! آخر کیا ہوئے — عظمتِ ہندوستاں کے وہ مناظر کیا ہوئے

شب کی نکہت بیز، وہ رنگینیاں کیا ہو گئیں
صبح ہونے بھی نہ پائی تھی کہ کلیاں سو گئیں

قوتیں اس منقلب دُنیا میں آتی جائیں گی — یہ ہوائیں تو یہ تو غنچے کھلاتی جائیں گی
ذرّہ ذرّہ ہے جہاں کا مرکزِ رازِ فنا — زندگی ہے کاروانِ موت کو بانگِ درا
رہنِ اجزائے تلوّن ہے مزاجِ کائنات — وہ تغیر ہی جسے حاصل ہو دُنیا میں ثبات
پھر بھی تیری عظمتِ دیرینہ کے دُرِ ثمیں — جن سے رخشندہ تھی اے دہلی کبھی تیری جبیں

اپنی عبرت خیز آب و تاب کھو سکتے نہیں
زلزلوں میں دہر کے پامال ہو سکتے نہیں

حکیم جی کا چھلّا

از حضرت ایم۔ اسلم

یاد ش بخیر! مرزا جی گو چودھویں صدی کی پیداوار تھے۔ لیکن خیالات کے لحاظ سے بالکل "ازلی" ہی تھے البیلے، چڑچڑے، خوش مذاق، زندہ دل، لقمان بھی اور جاہل بھی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ کبھی ہنس رہے ہیں اور کبھی آگ بگولا۔ کسی کو بے نقط سنائی جا رہی ہیں اور کسی کی تعریف کے پُل باندھ رہے ہیں۔ یا تو نی ایسے کہ بیٹھے بیٹھے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں، اور جو چپ سادھیں تو پہروں تک چپ شاہ بنے بیٹھے رہیں۔ کوئی منتیں کرے، خوشامد کرے، قسمیں دے۔ لیکن کیا مجال جو آپ ٹس سے مس ہوں۔

لیکن ایک بات ضرور تھی آڑے وقت کام ضرور آتے تھے۔ دنیا بھر کے لوگوں کے کام ان کے ذمے ہوتے۔ اِدھر سے مارے مارے آرہے ہیں اُدھر بھاگے بھاگے جا رہے ہیں۔ ایک روز اسی طرح بازار سے گذرتے ہوئے مجھ سے بھی ملاقات ہوگئی، دور ہی سے سلام کر کے جو جانے لگے تو میں نے پکار کر کہا۔

"اے مرزا جی! کہاں بھاگے جا رہے ہیں آپ؟ ذرا سُنیئے تو سہی!"

آپ وہیں سے لوٹ آئے اور بولے "کیا ہے بھیا! جو کہنا ہو جلدی کہو۔ میر صاحب کے یہاں آئے ہیں۔ نوکر گھر پر نہ تھا۔ بے چارے بہت پریشان تھے کہ سودا سلف کون لائے۔ بھئی! ان کی وحشت اور اضطراب ہم سے تو دیکھا نہ گیا۔ لاچار ہم ہی نے کہا کہ لائیے ہم لائے دیتے ہیں۔ بس اسی دھندے میں ہیں۔ میاں سُنا نہیں تم نے ؎

کام انسان کو انسان سے پڑتا ہے ضرور
بات رہ جاتی ہے اور وقت نکل جاتا ہے

اب وہ ٹھہرے روز کے ملنے والے۔ اگر ہم بھی اس وقت پر خاموش بیٹھے رہتے تو یہ میر صاحب کے دھیان دل میں کیا کہتے؟ یہی نا! کہ لو جی! بڑے دوست بنے پھرتے ہیں میر صاحب کے۔ چپکے پاس بیٹھے رہے، اتنا نہ ہوا کہ ذرا بازار سے ضرورت کی چیزیں ہی خرید لاتے۔ اب تم ہی کہو کہ ہم کیسے خاموش بیٹھتے۔ ہم پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ یاران ایں زمانہ مثل گل نارند ٹھیک ہے نا بھیا؟۔

ہاں اگر میر صاحب کی گھر والی کا خیال کریں تو پھر قسم لے لو جو میر صاحب کے قریب پھٹکنے کو بھی جی چاہے۔ کمبخت کی کوئی گز بھر کی تو زبان ضرور ہوگی۔ اور ہم سے تو للہ بغض ہے، ہمارا نام سنتے ہی اس اللہ کی بندی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ سچ جانو! اُس کا اگر بس چلے تو ہم جیسوں کو تو زندہ ہی چبا ڈالے۔ یہ تو پیر جی کی دعا کی برکت ہے کہ ہم پر

سلہ اگر کوئی صاحب اِس مضمون کو خواہ مخواہ اپنے اوپر منطبق کر لیں تو ان کو چاہیئے کہ اپنی برہمی مزاج کو شاہد صاحب سے رجوع کریں نہ کہ اسلم سے۔

کسی کی گالی گلوج کا اثر نہیں ہوتا۔ تو خیر! رہے میر صاحب بے چارے، سو خدا سلامت رکھے انہیں جس طرح بھی بنے وہ غریب تو ہم سے نباہے چلے جا رہے ہیں میاں! دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ہم بھی دن بھر میں پانچ سات کام اُن کے کر آتے ہیں۔ اب جو اُن کے مہمان آئے ہیں تو ہم نے بھی دل میں ٹھانی ہے کہ اور کچھ نہیں تو جب تک یہ مہمان رہیں ہم بھی دونوں وقت کھانا دانا جا کر کھلا آیا کریں گے۔ کیا یاد آ رہیں گے کہ کوئی جناب مرزا صاحب بھی تھے، میر صاحب کے دوستوں میں! کیوں میاں! ٹھیک ہے نا! قسم ہے خدا کی جس گھڑی سے مہمان آئے ہیں یہ تیسرے پھیرے ہم بازار آئے ہیں ......"

"تو اچھا پھر آپ!" میں نے بات کاٹ کر کہا کیونکہ یہ تقریر خدا جانے کب ختم ہوتی۔ لیکن مرزا صاحب میری بات کاٹ کر بولے:

"تمہاری بھی سُن لیں گے۔ پہلے ہمیں تو بات ختم کرنے دو۔ تو ہاں یہ تیسرے پھیرے ہم بازار آئے ہیں۔ اوّل تو بازار سے شربت وربت لا کر انہیں پلایا۔ پھر اندر سے آواز آئی کہ پان نہیں ہیں، پان منگوا دیجئے۔ ہم بھاگے بھاگے گئے اور پان لے آئے۔ ابھی آ کر بیٹھے ہی تھے کہ پھر بجلی کی کڑک سُنائی دی" ایندھن گیلا ہے، تھوڑے کوئلے جلد منگوا دیجئے!"

تو میر صاحب نے ہماری طرف مُسکرا کر دیکھا اور کہا" بھائی مرزا! یہ مشکل بھی اب تم ہی حل کر دو" سو بھتیا! اب ہم کوئلے لینے آتے ہیں!"

مرزا جی کو آواز دے کر جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔ تاہم میں نے مذاقاً کہا" مرزا! کوئلے لینے تو جاتے ہو، لیکن ذرا خیال رکھنا"

"کیا؟" آپ نے میری طرف دیکھکر پوچھا" کیا خیال رکھوں؟"

"سُنا نہیں!" میں نے ہنسکر کہا" کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالا"

بس اتنا سُنتے ہی آپ بگڑ گئے" بڑے واہیات ہو تم! نہ وقت دیکھتے ہو نہ محل۔ بس جو مُنہ میں آیا بک دیا۔ سو بار کہہ چکے کہ ہمیں جلد واپس جانا ہے۔ اور تم نے فضول بک بک میں پہر بھر ضائع کر دیا"

میں نے کہا" حضرت! آپ "بک بک" کا بہت استعمال فرماتے ہیں کہیں یہ کوئی آپ کی گھر کی زبان کا لفظ تو نہیں!"

"چپ رہو جی!" آپ بولے" کہیں اس گھر والی کو پتہ چل گیا کہ ہم میر صاحب کے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں لگے رہے تو خدا کی قسم سمجھ لو کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔ ہم سے تو ناراض ہوں گی سو ہوں گی۔ لیکن میر صاحب غریب کو وہ سُنائیں گی کہ بس شیطان بھی کان پکڑے۔ آس پاس کے رہنے والے بھی آواز سُنکر توبہ توبہ کرنے لگیں اور گھر والوں کی روح بھی کانپنے لگے۔ لیکن اتنا بھی شکر ہے کہ ہے کم زبان۔ ہم سے دب بھی جاتی ہے۔ میرے یار! کیا کہیں تم سے بس ہم ہی ہیں جو نباہے جا رہے ہیں۔ لو اب معاف کرو۔ میر صاحب راہ دیکھتے ہوں گے۔ ادھر اندر

بیگم صاحبہ نے قیامت کا فتنہ اُٹھار کھا ہوگا اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے تم سے۔"

اسی سے آپ اندازہ لگالیں کہ کس نوعیت کے انسان ہیں یہ مرزا جی۔ آپ جہاں جائیں مرزا صاحب بھی آپ کو وہاں ضرور نظر آئیں گے، اور پھر یہ نہیں کہ چپکے بیٹھے ہوں، بلکہ ہر بات میں سب سے پیش پیش دیکھ لیجئے۔ سو طریق سے یہی ظاہر کریں گے کہ صاحب خانہ سے ان کے بہت گہرے مراسم ہیں۔ بھوکے ننگے تو تھے نہیں لیکن اللہ کی مارا ایسی تھی کہ اکثر دوسروں کے ہاں ہی روٹی کھاتے۔ گھر کے کام کاج سے تو واسطہ نہ تھا۔ لیکن اوروں کے کام سے فرصت نہ تھی۔ اُن کی تو وہ بات تھی کہ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ہر بات کا بتنگڑ بنانا تو آپ کی معمولی بات تھی۔ ہر چیز پہ ایمان بالغیب رکھتے تھے۔ اور لطف یہ کہ جب کسی سے کوئی نئی بات سُن لیتے تو جھٹ اس سے ملتا جلتا کوئی اپنا من گھڑت واقعہ بیان کر دیتے۔ گویا یہ تائید ہوتی دوسرے کی بات کی۔

خیر یہ باتیں تو تھیں ہی۔ لیکن ایک عیب ایسا بھی تھا جس سے صرف ان کے گھر والے ہی ان کے ہاتھوں نالاں رہتے۔ مرزا صاحب کی صحت تو خاصی اچھی تھی۔ لیکن انہیں یہ وہم تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ جس کسی سے ملتے اسی کا دُکھڑا روتے۔ آپ کسی مرض کا نام لے دیں، مرزا جی جھٹ بول اُٹھیں گے کہ آج کل انہیں بھی یہی شکایت ہے، یار لوگ کبھی کسی ایسی بیماری کا نام لے دیتے جو صرف چاپایوں کو ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب سے پوچھئے تو اُن کو بھی یہی شکایت ہوتی۔ الغرض اس وہم نے یہاں تک زور پکڑا تھا کہ اکثر کئی کئی روز ادویات گھٹتی رہتیں، معجونیں تیار ہوتیں، عرق کھنچوائے جاتے، شربت بنتے۔ شاید ہی کوئی اشتہاری حکیم ہو جس کمبخت سے آپ نے دو چار روپے کی دوا نہ منگوائی ہو۔

یوں تو شہر میں اکثر لوگوں سے آپ کا ملنا جُلنا تھا، لیکن خصوصیت سے ایک حکیم صاحب سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ حکیم بھی ایک "معجونِ مرکب" ہی تھے۔ ہر فن مولا سمجھ لیجئے۔ ادیبوں میں ادیب، مدیروں میں مدیر، مصنف بھی اور ڈرامہ نگار بھی، سال چھ مہینے بعد اکثر دوسرے شہروں کی سیر کو بھی جایا کرتے لیکن مزاج کے اس قدر لطیف تھے کہ کسی دوست کے ہاں مہمان ہونا بھی پسند نہ تھا۔ ہوٹل میں قیام فرمایا کرتے۔ خاص کر دہلی اور لکھنؤ کے ہوٹل بہت پسند تھے۔ ایسے چرب زبان اور لسان کہ شیطان بھی دم میں آجائے۔ مطلب نکالنے کے ایسے ایسے گُر یاد تھے کہ سخت سے سخت آدمی بھی آپ کا کلمہ پڑھنے لگے۔ سانپ کے سر سے من نکالتے اور دور دور کی کوڑی لاتے۔ تنقید نگار بھی خاصے تھے۔ آپ کی تنقید نگاری کی دور دور تک شہرت تھی۔ فلم ایکٹرسوں کے کام پر بہت گہری نظر سے تنقید کرتے اور اس قدر

"وسیع القلب" تھے کہ اکثر ایکٹرسوں کو فن کے متعلق مشورے لکھ کر بھیج دیتے۔ اور سٹیج کی یہ خوبصورت تیتریاں یہ مرقوم "الہامات" بڑے فخر سے دوسروں کو دکھایا کرتیں۔ اور کبھی کبھی کسی حاجتمند کو یہ "کراماتی صحیفہ" بطور تبرک دے بھی دیتیں۔

ہمارے مرزا جی ان کے ڈھب کے خاص آدمی تھے۔

ایک روز میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا کہ مرزا صاحب آ دھمکے۔

"کیوں میاں! کیا ہو رہا ہے؟" آتے ہی پوچھا۔

میں نے کہا "حضرت مطالعہ کر رہا ہوں۔"

"ہوں!" آپ ایک شانِ بے نیازی سے سر ہلا کر بولے "کیوں وقت ضایع کر رہے ہو۔ کیا کتاب بینی کے سوا دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں؟"

"تو گویا مطالعہ کرنا وقت ضایع کرنا ٹھہرا!"

"تو اور کیا!" آپ نے کہا "مکتب میں پڑھے، مدرسے میں پڑھے، پھر کالج میں پڑھ لیا۔ تو اب کیا قبر تک پڑھتے ہی چلے جاؤ گے۔ آخر کچھ ٹھکانا بھی ہے اس پڑھنے کا۔ وہ دیکھا ہمارے حکیم جی قبلہ کو۔ حکمت کی دو ایک ہی کتابیں پڑھ کر دنیا میں ہل چل مچا دی ہے۔ اسے کہتے ہیں پڑھنا۔ نہ کہ تمہاری طرح۔ صبح بھی پڑھ رہے ہیں اور شام بھی۔ اور نتیجہ اس پڑھنے کا یہی نا! کہ نزلے سے بال سفید ہو گئے۔ آنکھوں کی حالت یہ کہ دو دو عینکیں لگوانی پڑیں۔ پڑھتے پڑھتے وہ کمبخت بھی گھِس جاتی ہیں تو نئے دوسرے نئے تال بھ لوائے ہو۔ خواہ مخواہ کا ایک خرچ گلے ڈال رکھا ہے اور ملک کی حالت یہ ہے کہ پیسہ عنقا ہو رہا ہے۔ میرے یار! سچ پوچھو تو پیسہ سنبھال کر رکھنے کا گر کوئی ہمارے حکیم جی سے ہی پوچھے، دنیا بھر کے شوق دوسروں کی جیب سے پورے کرتے ہیں۔ اور پیسوں کے روپے اور روپوں کی اشرفیاں بناتے چلے جاتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا "مرزا! تمہیں خدا کی قسم سچ کہنا آج کہیں ہوٹل میں سے مفت کے کباب تو نہیں کھا آئے۔ جو حکیم جی کی اتنی مدح سرائی ہو رہی ہے۔"

"کس ہوٹل سے؟" مرزا نے پوچھا "حکیم جی کے ہوٹل سے؟ ہوں! میرے یار! بڑے نادان ہو تم! حکیم جی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ تم تو مفت کے کباب کہتے ہو۔ خدا کی قسم! وہ تو دینے کے نام سے گھر کی گُٹھلی بھی نہ دیں۔ ہم کسی بھڑوے کا کھاتے ہیں جو کسی کی خوشامد کریں۔ لیکن بھیا! حق بات ضرور کہیں گے۔ آج تمہارے اس شہر میں جو شہرت حکیم جی کی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا "حاشیہ نشیں جو ٹھہرے آپ۔"

"تو گویا ہم غلط کہہ رہے ہیں۔"

"اجی کون کہتا ہے کہ آپ نے غلط کہا۔"

"تو پھر کیا؟"

میں نے ہنس کر کہا "کچھ بھی نہیں۔ وزیر چنیں شہریارِ چناں!"

"اب لگے ہم پر بھی چوٹ کرنے تم؟" مرزا نے ذرا مسکرا کر کہا "خدا کی قسم! یہ ہم لوگوں کا ہی طفیل ہے

جو آج حکیم جی کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سچ جانا یہ ہماری ہی جوتیوں کا صدقہ ہے۔"

اور پھر میری طرف دیکھ کر "سمجھ گئے نا!"

"خاک نہیں سمجھا۔"

"تم تو حشر تک نہ سمجھو! جانے تمہارے دماغ میں بھُس بھرا ہے یا کیا؟ لیکن اتنا کہے دیتے ہیں کہ تشخیص کے فن میں تو ہمارے حکیم جی جالینوس کے بھی کان کترتے ہیں۔"

"واہ سبحان اللہ!" میں نے ہنسکر کہا "حکیم کیا ہوتے موش ہوئے!"

"ارے! یہ موش کیا؟" آپ نے تعجب سے پوچھا۔

"تو اور کیا! کُترنے کا کام تو چوہے ہی کیا کرتے ہیں"

"کیا واہیات ہو تم!" آپ نے ناراض ہو کر کہا "کُترتے ہیں کَترتے ہیں۔"

"سمجھ گیا۔ تو گویا مقراض صفت ہوئے۔"

"کون؟"

"آپ کے حکیم جی، اور کون؟"

"جھک مارتے ہو تم! ہوں۔ اور پڑھو انگریزی۔ تم یا جانو ادب کس جانور کا نام ہے۔"

"جی ہاں، جیسے آپ!"

"کیسے؟"

یہی کہ چہ داند بوزنہ لذاتِ ادرک! آپ نے انگریزی پڑھی ہو تو آپ کو اس کی قدر ہو۔"

"پھر واہی تباہی بکنے! سمجھ میں نہیں آتا کہ تم حکیم جی کے نام سے اُلجھتے کیوں ہو؟"

"صرف اس لئے کہ میں نے "اِٹل بہر" نہیں پڑھی۔"

"یہ اِٹل بہر کس بلا کا نام ہے؟"

"یہ اپنے حکیم جی سے پوچھئے، اگر بتلا دیں تو واقعی حکیم ہیں ورنہ کوئی اناڑی۔"

"چُپ رہو جی تم!" مرزا بولے "تم کیا جانو ان کے کمالات، ایک مرض کا ایک ہی وقت میں دس طریق سے علاج کرتے ہیں۔ کہیں یونانی دوا گھٹ رہی ہے، کہیں انگریزی مکسچر پلایا جا رہا ہے۔ کہیں ہومیو پیتھک دوا دی جا رہی ہے کہیں ویدک علاج کرتے ہیں۔ اب تم سے کیا کہیں ہماری تو دیکھ دیکھ کر عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔"

"عقل ٹھکانے کیسے رہے!" میں نے کہا "تخم تاثیر، صحبت کا اثر۔"

"تم کیا جانو میرے یار!" مرزا بولے "بہت بھاری حکیم ہیں۔"

"کیوں جی!" میں نے پوچھا "کوئی تین پونے تین من کے تو ہوں گے!"

"احمق ہو تم!" مرزا نے ہنسکر کہا "ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ بہت ضخیم آدمی ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ!" میں نے ہنسکر کہا "حکیم نہ ہوئے بوستانِ خیال۔ طلسم ہوش رُبا ہو گئے۔ یا داستان "امیر حمزہ" ہوئے۔ یا..."

"بات کرتے ہو" مرزا نے ٹوک کر کہا "یا جھک مارتے ہو؟"

"کون، میں یا آپ؟"

"ہم کیسے؟" آپ نے بگڑ کر پوچھا۔

"سُنئے! آپ نے فرمایا بہت بھاری حکیم ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ بہت وزن دار آدمی ہوں گے۔ پھر ارشاد ہوا

کہ بڑے ضخیم آدمی ہیں۔ تو حضرت! آدمی تو ضخیم ہوا نہیں کرتے، اب فرمایئے کون جھک مارتا ہے؟ بندہ پرور! بات ذرا سوچ سمجھ کر کیا کیجئے۔ زمانہ بہت بُرا ہے۔"

"چپ رہو جی تم!" آپ نے کہا۔ "لگے لقمان کو حکمت سکھلانے۔ بات کرنے کا خود شعور نہیں۔ اور ہمیں نصیحت کی جا رہی ہے۔ لئے پھرتے ہیں زمانہ۔ ہم زمانے کو کیا جانیں۔ زمانے کا رنگ بدلنے والے تو ہم لوگ ہیں!"

"بجا ارشاد ہوا!" میں نے کہا۔ "آپ یا آپ کے حکیم جی!"

"تو اس میں شک ہی کیا ہے" مرزا بولے۔ "واللہ حکیم جی نے ایک ایسی چیز ایجاد کی ہے کہ سچ مچ زمانے کا رنگ بدل جائے۔"

"ایجاد؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" مرزا بولے۔ "حکیم جی نے ایک ایسا "چھلّا" ایجاد کیا ہے کہ ہندوستان تو رہا درکنار، یورپ اور امریکہ والے تک حیران ہو گئے ہیں۔ اور خدا نے چاہا تو عنقریب آپ کو کوئی خطاب بھی مل جائے گا۔"

"خطاب!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں ممکن ہے زبدۃ الحکما ... نہ توبہ زُبدۃ ......"

"ہوں!" مرزا ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔ "فارسی عربی پڑھی ہوتی تو لفظ منہ سے صحیح نکلتا۔ تو خیر! دنیا اس چھلّے کو قدرت کا اعجاز سمجھ رہی ہے۔"

"قدرت کا اعجاز!" میں نے ہنس کر کہا۔ "واہ سبحان اللہ اگر چھلّا قدرت کا اعجاز ہے تو پھر حکیم جی بھی رُوح القدس ہی ہوں گے۔"

"لگے پھر وہی اُونگی بونگی بکنے۔ بھلا دیکھو تو ہمارے چہرے کی طرف!"

"دیکھ تو رہا ہوں!"

"کیا دیکھا؟"

"دو آنکھیں ہیں، ایک ناک ہے، ایک ......"

"غلط کہتے ہو تم!" مرزا نے غصے سے کہا۔

"ارے! تو پھر کیا ایک آنکھ اور دو ناک ہیں؟"

"بخدا! بڑے ہی احمق ہو تم۔"

"تو پھر اور کیا؟"

"ہمارے چہرہ کا رنگ کیسا ہے؟ اور ہم کیسے نظر آرہے ہیں؟"

"آپ تو بالکل ویسے ہی ہیں" میں نے کہا۔ "اور وہی ہیں جو آپ ازل سے بنائے گئے ہیں۔ رہا رنگ تو ...."

"کہتے کیوں نہیں کہ سُرخ ہو رہا ہے" آپ نے ہنس کر کہا۔

"سُرخ تو ہے!" میں نے کہا۔ "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آج بیگم صاحبہ کے غازے کی ڈبیا پر ہاتھ صاف کیا ہے آپ نے۔ یا بیگم صاحبہ نے ہاتھ صاف کیا ہے آپ کے رُخسار پر۔"

"باز نہیں آؤ گے شرارت سے۔"

"بندہ پرور!" میں نے کہا۔ "ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آتا ہے وہی"

"غلط ہے، یہ سُرخی جو ہمارے چہرے پر آج تم دیکھ رہے ہو، یہ حکیم جی کے چھلّے کا اعجاز ہے۔ ذرا عینک

سکے تال صاف کر کے دیکھو۔ ہے نا شباب کی جھلک؟"

"یا وحشت!" میں نے ہنس کر کہا۔ "خدا خیر ہی کرے!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کہیں آپ کے دماغ کا علاج نہ کروانا پڑے۔"

"تو گویا ہم پاگل ہیں؟"

"معاف فرمائیے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "باتوں سے تو ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"بڑے ہٹ دھرم ہو تم!" مرزا اٹنک کر بولے۔ "آنکھوں سے دیکھتے ہو لیکن ماننے سے انکار کرتے ہو۔ بھیا! کسی کی محنت اور عقل کی داد نہ دینا بھی تو کفر کی علامت ہے۔ حکیم جی غریب نے صدیوں کی محنت..... ..."

"معاف فرمائیے!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "اگر حکیم جی نے صدیوں محنت کی ہے تو پھر حکیم جی بھی تو نوح کے ہم عصر ہوں گے۔ ذرا ان کی عمر تو بتلائیے؟"

"نہیں تو بیہودہ سرائی کا مرض ہے!" مرزا نے بگڑ کر کہا۔ "صدیوں کی نہ سہی، چلو برسوں ہی کی سہی تو ہاں ہم کہہ رہے تھے کہ برسوں کی محنت کے بعد یہ چھلا ایجاد ہوا ہے، اور دنیا بھر کے امراض کا واحد علاج ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اگر پچاس برس کا بوڑھا یہ چھلا پہنے تو پچیس سال کا جوان بن جائے۔"

"واہ سبحان اللہ!" میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ "پھر تو واقعی قابل تعریف چیز ہے۔ تو ہاں مرزا صاحب! اگر بیس سال کا جوان آدمی پہن لے تو وہ ضرور دس سال کا لڑکا ہو جائے، اور جو دس سال کا لڑکا یہ چھلا پہنے تو یقیناً پانچ سال کا طفل ناداں بن جائے اور اگر طفل ناداں پہن لے تو از سر نو پیدا ہوا اور..."

"چپ رہو جی تم!" مرزا بات کاٹ کر بولے۔ "ہر بات میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ ہم ایک چیز کے خواص بیان کر رہے ہیں اور تم مذاق سمجھتے ہو۔ حالانکہ حکیم جی اعلان کر چکے ہیں کہ گو اُن کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن بیس سال کے بن گئے ہیں۔"

"تو ہاں حضرت! یہ تغیر کتنے عرصے میں واقع ہوا ہوگا؟"

"کوئی ہفتہ عشرہ کے استعمال سے!"

"سبحان اللہ! تو اگر کوئی متواتر دو چار مہینے آپ کے حکیم جی کا چھلا پہنا رہے تو کیا عجب کہ پروفیسر ڈارون کا یہ نظریہ بھی ثابت ہو جائے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ پھر تو یہ سہرا بھی حکیم جی کے ہی سر......"

"نہیں سنتے ہم تمہاری!" مرزا نے جھنجھلا کر کہا۔ "خدا کی قسم! اگر ایک چھلا منگوا کر پہن لو تو جہاں ایک افسانہ لکھتے ہو دن بھر میں دس لکھ ڈالو!"

"تو گویا" میں نے کہا۔ "چھلے کی تاثیر سے افسانہ لکھنا بھی آجاتا ہے۔"

"احمق ہو تم تو! افسانہ لکھنا تو نہیں آتا لیکن عقل ضرور آجاتی ہے۔"

"بھئی مرزا!" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہ تو میں نہ مانوں گا۔"

"کیا؟"

"یہی ناکہ چھلا پہننے سے عقل بھی آجاتی ہے!"

"کیوں کچھ وجہ بھی؟"

"وجہ یہ کہ چھلے کا موجد خود فاتر العقل نہ ہوتا۔"

"میرے یار!" مرزا ہنس کر کہنے لگے "وہی ابوجہل والی مثال ہے تمہاری تو! ایک چیز کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور تم سرے سے مانتے ہی نہیں۔ تم کیا جانو اس چھلے کو "کوٹھے والیوں" میں کس قدر چرچا ہے، ایک ایک دو دو چھلے خرید رہی ہے۔"

"بس بس!" میں نے سر ہلاکر کہا "اب تو ہم بھی قائل ہو گئے۔"

"وہ کیسے؟"

"بس کہہ جو دیا کہ ہو گئے!"

"کچھ بتلاؤ تو سہی سمجھاؤ تو سہی!"

"اجی حضرت! عاقلاں را اشارہ کافیست!"

"میرے یار!" مرزا اُٹھتے ہوئے بولے "جب تمہارے پاس آتے ہیں بیزار ہو کر اُٹھتے ہیں۔"

"حضرت!" میں نے ہنسکر کہا "میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عاقلاں را اشارہ کافیست۔"

"اب نہ آئیں گے، بلاؤ بھی تو بھی نہ آئیں" آپ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

"بندگی عرض!" کہہ کر میں بھی کتاب دیکھنے لگا۔

* * * * * * * * * * * * * * * * *

ایم۔ اسلم

بوڑھا چاچا

از حضرت تنویر قریشی

"ذرا ٹھیرو، جانو" بوڑھے نے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جانکی بائی جسے گھر کے بڑے بوڑھے لاڈ سے "جانو" کے نام سے پکارتے تھے۔ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک معصوم دیہاتی دوشیزہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پوریوں کا تھال تھا، جسے وہ خاص طور پر "بوڑھے چاچا" کے لئے لائی تھی۔ اور وہ اسے دیکر واپس گھر جانے کے لئے مضطرب تھی، تاہم وہ خاموشی سے کھڑی ہوگئی۔

بوڑھا دوکان کے آگے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تل کا لڈو تھا جسے وہ شوق دلانے والے انداز سے ایک خوبصورت سپید دھوتی باندھے ہوئے، لڑکے کو دکھا رہا تھا۔ بچہ گورا چٹا اور حسین تھا۔ وہ احاطہ میں جو دوکان کے پہلو میں واقع تھا ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔

بچے نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ پیشانی پر شکن ڈالے ہوئے، اس کی نظر لڈو پر جمی ہوئی تھی۔

بوڑھے نے لڈو کا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اور نرم لیکن بڑھاپے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ادھر دیکھو، رامو۔ ادھر دیکھو، آہاہا، کیسا میٹھا یہ تل کا لڈو ہے اور کیسا مزیدار۔ بولو اسے کون لیگا۔ جلدی ـــــ یوں نہیں۔ پہلے بوڑھے چاچا کو ایک پیار دینا پڑے گا۔ زیادہ نہیں۔ صرف ایک........"

آگے بڑھا ہوا بچہ بوڑھے کے ہاتھ پھیلانے پر جھجھک کر پھر پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح لڈو پر جمی ہوئی تھیں۔

"اہاہا۔ گڑ کا لڈو، کتنا بڑا، میٹھا، مزیدار... آؤ، صرف ایک پیار"

بچہ نے جرأت کر کے ہاتھ بڑھایا "لاؤ، یہیں دیدو ـــ"

یکایک بوڑھے نے جوانوں کی سی پھرتی کے ساتھ ایک چھلانگ لگائی "ہت تیرے کی ـــ اب بول"

بوڑھے نے بچے کے ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اپنے دونوں بازوؤں میں تنگی سے دبا کر اسے چوم لیا۔

"چھوڑو، مجھے چھوڑ دو" بچہ چلاتا ہی رہا۔

پھر بوڑھے نے بچے کے ہاتھ میں لڈو دیدیا۔ جسے لیکر وہ روتا ہوا اسی درخت کی طرف بھاگا۔

"کیا لائی ہو؟ جانو" بوڑھے نے اس کامیابی کے بعد خوشی کے انداز سے ہاتھ ملتے ہوئے حیران لڑکی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ماں نے تمہارے لئے پوریاں بھیجی ہیں۔ لے لو، اور تھال ابھی پھیر دو"

بوڑھا غیر مستقل کولو کا چکر کاٹ کر لڑکی کے قریب آیا۔ اور اس کے ہاتھ سے تھال لے لیا۔ مگر وہ اپنی خیالی دُنیا سے جس میں وہ اپنے خوبصورت نواسے کے مزے لے رہا تھا۔ ابھی اچھی طرح بیدار نہ ہوا تھا۔ وہ تھال لئے ہوئے چھپر کے ایک گوشے میں گیا، جہاں لکڑی کے ایک ٹوٹے پھوٹے صندوق میں کچھ چیتھڑے بھرے ہوئے تھے۔ تھال کو نیچے رکھ کر وہ ان چیتھڑوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

"ادھر آؤ، جانو۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں" جانو بادلِ ناخواستہ قریب گئی، اور جھک کر دیکھنے لگی بوڑھے نے آہستہ سے صندوق سے ہاتھ باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اور تل کا لڈو تھا۔

"مجھے خوب معلوم ہے جانو۔ رامو کو مٹھائی کا بڑا شوق ہے۔ چاہے ماں کتنا ہی منع کرے۔ مگر میں جس وقت جی چاہے اسے تل کا لڈو دکھا کر اپنے قریب بُلا سکتا ہوں۔ میں نے اسی لئے ایک آنے کے لڈو خرید رکھے ہیں"

بوڑھا چاچا اپنی عمر کے ستر سال پورے کر چکا تھا۔ پیشہ اور خاندان کے اعتبار سے وہ تیلی تھا۔ اس کے باپ دادا نے اسی تجارت میں اتنا کمایا تھا کہ گاؤں میں دولت کے لحاظ سے اس کا شمار معتبر لوگوں میں ہوتا تھا۔ مگر وہ زمانہ اور تھا کہ کولو کے ذریعہ تیل نکالا جاتا تھا۔ اور وہی تیل جلایا بھی جاتا تھا۔ لیکن اب دوسرا زمانہ آگیا تھا۔ نئی تہذیب نے مٹی کے تیل کو اس کی جگہ مستقل کر دیا تھا۔ اور ڈیوٹ کی جگہ لالٹین اور لیمپ لے رہے تھے۔ قدیم تمدن، اس جدید تہذیب کے آگے اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اور ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبہ تک میں لیمپ۔ لالٹین اور ٹین کی ڈبیوں کی رسائی ہو چکی تھی۔ اس کس مپرسی کے زمانے میں گنگو تیلی کو کون پوچھتا۔ دوسرے اس کا بڑھاپا اب حد سے گذر چکا تھا۔ وہ محنت و مشقت کا کام بھی زیادہ نہ کر سکتا تھا۔ تاہم بوڑھے نے اپنی وضعداری میں فرق نہ آنے دیا تھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھیر بیل، ایک کولھو سے دن بھر بندھا رہتا تھا۔ اور بوڑھا اسی ٹھاٹھ سے اپنی چوکی چھپر کے دروازے پر بچھائے سامنے کچھ کڑاہیاں، گاگر اور ٹین کے بنے ہوئے ناپ لیکر بیٹھا رہتا تھا۔ برتنوں کے پیندے سے لگا ہوا تھوڑا بہت تیل اگر ہو تو ہو، بظاہر تو ان میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ علاوہ بریں گاؤں میں دو تین نوجوان تیلیوں نے بھی دوکان لگا رکھی تھی، پھر اس کے پاس سے تیل کون خریدتا۔

پھر بھی باپ دادا کیا، خود اس کی جوانی کی کمائی اتنی تھی کہ اس کا بڑھاپے کا زمانہ آرام کے ساتھ بسر ہو جاتا۔ مگر بیٹیوں نے یہ اس کے پاس رہنے نہ دیا۔ کوئی ڈیڑھ سال قبل بوڑھے کی بیوی کے مرتے ہی دونوں بیٹیوں نے بوڑھے کو حصہ تقسیم کرنے پر کسی نہ کسی طرح راضی ہی کر لیا۔ بڑی بیٹی نے عہد کیا کہ وہ اس کے کھانے

پینے کی کفیل ہوگی اور چھوٹی نے گنگا جل اٹھایا کہ وہ تاعمر اس کے اخراجات کے نصف کی ذمہ دار رہیگی چھوٹی بیٹی نے نقدی اور زیورات پر قبضہ کر لیا۔ اور بڑی کے حصہ میں زمین اور مکان آیا۔ اسی مکان کے احاطہ میں ایک جانب وہ چھپر پڑا تھا جہاں بوڑھے کا کولھو تھا۔ اس کی ساری کمائی کا ذریعہ۔ قریب میں رہنے والے بڈھے بوڑھے جو اسے اپنے بچپن سے جانتے تھے، اب بھی کبھی کبھار پیسے دو پیسے کا تیل اس سے لے لیا کرتے تھے۔ اور یہ پیسے وہ جمع کرتا جاتا تھا۔ اسی سے وہ بیل کے لئے تل خریدتا۔ بیل کے لئے دانہ چارہ۔ اور اپنے لئے تمباکو وغیرہ۔ گھر سے اُسے ایک پیسہ نہ ملتا تھا صرف کھانا دو مرتبہ ضرور دیا جاتا۔ تو وہ بھی رسوئی میں۔ کیونکہ اس کی بڑی بیٹی صفائی کا بڑا اہتمام کرتی تھی، اور اسے گوارا نہ تھا کہ بوڑھا تمباکو تھوک تھوک کر اور کیچڑ بھرے قدموں سے چل چل کر اس کے صاف ستھرے کمروں اور دالانوں کو خراب کرے۔ تمباکو خوری پر اس کو بہت باتیں سننی پڑتیں، مگر بوڑھا اپنی عادت سے مجبور تھا۔ چرا چھپا کر تمباکو چباتا ہی رہتا۔ ہاں حقہ پینے کا موقع اُسے صرف دوکان ہی میں ملتا۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنی بڑی بیٹی کے اصرار پر بادل ناخواستہ چھوٹی بیٹی کے گھر گیا تھا تو حقہ پینے کے لئے اُسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چھوٹی بیٹی دُبلی پتلی اور بڑی کینہ ور تھی۔ اسکی بات بات سے طنز ٹپکتا تھا۔ بوڑھا بہ نسبت اپنی بڑی بیٹی کے، جو فربہ اندام اور غصیلی تھی مگر بہت جلد غصہ کو بھول بھی جاتی تھی، اپنی چھوٹی بیٹی سے بہت ڈرتا تھا۔ چھوٹی سہاگن تھی اور بڑی بیوہ، چھوٹی کا ایک لڑکا تھا —— وہی لڑکا جسے لڈو کا لالچ دے کر پیار کیا تھا۔ لڑکے کی ماں نے اُسے بوڑھے کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ بوڑھا غلیظ اور کثیف حالت میں رہا کرتا تھا —— بڑی بیٹی کی بھی ایک لڑکی لچھمی تھی جس کی عمر آٹھ دس سال کے قریب تھی۔

ایک روز جانکی جو بوڑھے چاچا کے ہمسایہ کی لڑکی تھی، اپنے احاطے میں کھڑی تھی کہ بوڑھے چاچا نے اسے آواز دی "جانو بیٹی، اِدھر آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے"

"بیٹی تم نے سُنا؟" جانکی کے قریب آجانے پر بوڑھے نے احتیاطاً چاروں طرف دیکھتے ہوئے اُسکے کان کے قریب منھ لاکر کہا۔

"کیا چاچا؟"

"لچھمی کی شادی ہونے والی ہے" —— لچھمی بوڑھے کی نواسی کا نام تھا۔

"ہاں"

"کیا تمہیں یہ بات معلوم تھی؟ کتنے دنوں سے؟ پھر تم نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟ میں نے آج ہی اتفاقاً سن لیا ہے"

"نہیں، کیا سچ مچ تمہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ میں بہت دنوں سے یہ ذکر سن رہی ہوں۔ اب تو شادی کے

دن بھی قریب آگئے۔"

"تو بیٹی، پھر لچھمی کے دولھا کو کچھ نہ کچھ ضرور دینا پڑے گا۔"

"کون تم دوگے چاچا؟"

"کیا کیا جائے، جانو۔ کچھ پیسے جمع کئے تھے، اسی سے کچھ خرید کر دیدونگا۔ ورنہ دُنیا کیا کہیگی، اور پھر لچھمی اور اس کی ماں کیا سمجھے گی کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ——"

مگر جانکی ماں کے پکارنے کی آواز سُنکر چلی گئی۔

"اماں، تم نے سُنا۔ لچھمی کی شادی کی خبر آج چاچا کو ہوئی، اور وہ بھی اتفاق سے۔"

"ہاں بیٹی۔ دنیا کے یہی چلن ہیں۔ اب بوڑھے کے پاس رکھا کیا ہے، جو اس کے مشورہ کی ضرورت ہو گی۔"

اِس کے دو چار روز بعد پھر ایک دن بوڑھے چاچا نے جانکی کو پکارا۔ اس مرتبہ شادی کا تحفہ دکھانے کے لئے۔ بوڑھے نے ایک خوبصورت سُرخ ریشمی دھوتی سُنہری گوٹ والی اُسے دکھائی۔ جانکی حیران رہ گئی۔ بوڑھے کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی۔

مگر دوکان کی فضا صاف بتا رہی تھی کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔ جانکی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی۔ تیل کی کڑاہیاں اور دوسرے پیتلی ظروف اب غائب تھے۔

"کیوں جانو، ٹھیک ہے نا؟" بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں چاچا، اچھی ہے، اور بہت اچھی۔ مگر یہ تم نے ...."

"نا، نا، بیٹی، اب میرا دنیا میں رہا کیا ہے۔ صبح رہا، شام گیا۔ دنیا کیا کہیگی اور لچھمی کی ماں ....."

جانکی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور وہ آنچل سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی اپنے گھر واپس چلی گئی۔

بوڑھے چاچا نے کمالِ ہمت سے اپنے تحفہ کا راز سب سے چھپایا تاکہ عین موقع پر بیٹی اور نواسی کو حیران کر دے۔ شادی کے وقت بوڑھے کی موجودگی کا سوال دراصل بڑا اہم سوال تھا۔ دونوں بیٹیاں حیران تھیں کہ اس کو خوش اسلوبی سے کیسے سرانجام دیں۔ لچھمی کا دولھا ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اور اس کا تعلق قریبی قصبہ کے ایک دولتمند خاندان سے تھا۔ ان کو دُلہن کے نانا کا اس غلیظ اور کثیف حالت میں سرپرست بن کر موجود رہنا کیسے نہ ناگوار گذرتا۔

آخر لچھمی کی ماں نے اس مُہم کو سر کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ بوڑھے کے لئے گاڑھے کی نئی مرزئی اور دھوتی خریدی گئی۔ موٹے سیاہ بانات کا ایک کوٹ سلوایا گیا اور رنگدار پگڑی بنائی گئی۔ بوڑھے کو جب وہ دن میں دو مرتبہ کھانے کے لئے آتا تو ایک طویل لکچر دیا جاتا کہ شادی کے وقت اس کا برتاؤ کیسا رہنا چاہیئے۔

اب شادی کے صرف آٹھ ہی روز باقی رہ گئے تھے۔ لچھمی کی ماں نے چھوٹی بہن کو بہت دنوں پہلے ہی سے کام کاج میں مدد دینے کے لئے بُلا لیا تھا۔ اب دو تین روز میں مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی تھی۔ گھر میں ہر طرف گھما گھمی مچی ہوئی تھی۔

ان بڑی بڑی تیاریوں میں بوڑھے چاچا کے کھانے پینے کا کسی کو کیوں خیال آتا۔ بوڑھا گھنٹوں رسوئی میں بیٹھا انتظار کرتا، مگر کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ ہوتا۔ جب وہ لچھمی کی ماں کو ڈھونڈھ نکالتا۔ تو وہ اسکی التجاؤں کا سخت و سُست جواب دیتی ہوئی کھانے کا تھال اُس کے سامنے لا رکھتی۔

اتفاق کی بات کہ انہیں دنوں بوڑھے چاچا کو ہوا لگ گئی۔ سردیوں کا موسم تھا ہی مگر بوڑھا اسی طرح اس پُرانے لحاف میں لیٹا ہوا سوتا جسے چیتھڑے ہو کر بھی ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ بخار ہو گیا۔ شروع شروع میں کسی نے توجہ نہ کی، اور بوڑھا بھی حالات کو سمجھتے ہوئے پہلے دو ایک روز بغیر شکایت خود گھر میں کھانے کیلئے چلا گیا۔ مگر جب بخار میں تیزی ہوئی اور برابر دو دو وقت کھانے کیلئے گھر نہ آیا تو بڑی بیٹی کو کچھ تشویش ہوئی اور اس نے دریافتِ حال کے لئے دوکان کا رُخ کیا۔

بوڑھے کا جسم جھلس رہا تھا، اس نے بیٹی کے پکارنے پر جواب نہ دیا۔ وہ خود اندر آئی اور جب اُسنے بدن پر ہاتھ رکھ کر اندازہ کرنا چاہا تو حرارت سے چونک کر ہاتھ کھینچ لیا۔ فوراً چھوٹی بہن مشورہ کے لئے طلب کی گئی، اور دونوں کی رائے سے گھریلو جڑی بوٹیوں کا علاج ہونا شروع ہوا۔ بوڑھے کی علالت کچھ ایسی اہمیت نہ رکھتی تھی، جسکے لئے شادی کی تاریخ بڑھا دی جائے۔

لیکن یہ کوئی معمولی بخار نہ تھا، بلکہ مہلک نمونیہ اور ٹائیفائڈ تھا۔

شادی کے لئے اب صرف دو روز رہ گئے تھے۔ پرسوں بیاہ کا دن تھا۔ لچھمی کی ماں اس قدر مصروف تھی کہ بوڑھے کے دیکھنے کو بھی نہ آسکی۔ ہاں اپنی بہن کے ہاتھ اُس نے دودھ بھجوا دیا۔ مگر پھر کسی نے شام تک اس کی خبر نہ لی۔ شام کے وقت وہ آئی مگر حالت وہی تھی۔ گاؤں کا وید طلب کیا گیا۔ اُسنے بھی کچھ جڑی بوٹیاں تجویز کیں اور ایک اکھنّی ہتھیا کر چلتا بنا۔ بوڑھے کو گھر میں منتقل کرنے کی رائے خود لچھمی نے دی، مگر اس کی خالہ نے فوراً بات کاٹ دی، گھر میں جگہ کہاں تھی جہاں اسے رکھا جاتا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خود رات کو دوکان میں جا سوئے اور چاچا کی خبر گیری کرے۔

بوڑھا چاچا بھی اپنی علالت سے سخت متفکر اور پریشان تھا۔ شادی کے روز اس کا تحفہ دیا جانا ضروری تھا۔ اور اس حالت میں وہ کیسے دے سکتا تھا۔ کیا وہ اپنی چھوٹی بیٹی سے اس کا ذکر کر دے؟ مگر نہیں، شاید پرسوں تک اس کا بخار اُتر جاتے۔

دوسرے روز بھی بخار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ اور اضافہ ہو گیا۔ اور بوڑھے نے ہذیان بکنا شروع کیا۔ وید بھی آتے، مگر علاج کرنا تو کدھر، شاید یہ پہلا موقع ہو گا کہ انہوں نے عمر بھر میں اس مرض کا مشاہدہ

کیا ہو۔ دوسری طرف لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ باجوں کے شور، برتنوں کی جھنکار اور مہمانوں کے شور وغل سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

بوڑھا جھونپڑی میں اکیلا پڑا تھا۔ صرف ایک خیال اس کے دماغ پر مستولی تھا اور وہ دولہا کو سلامی دینے کا خیال تھا۔ بُحران میں وہ اسی کی رٹ لگانے لگا۔ مگر وہاں سننے والا کون بیٹھا تھا۔ دوپہر کے قریب چھوٹی بیٹی اُسے دیکھنے کے لئے آئی۔ اور یہ حالت دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ مگر اسی وقت اپنی پریشانی کو چھپانا ضروری تھا ورنہ مہمانوں میں ابتری پھیل جاتی۔ پریشانی کا بڑا سبب کچھ بوڑھے کی علالت ہی نہ تھی۔ بلکہ ایک اور چیز بھی تھی یہ خدا کرے بوڑھا کم از کم دو روز اور جی جائے، ورنہ ——— اتنے اہتمام کے بعد شادی اگر موقوف ہو جائے تو نہ جانے کتنا مالی نقصان ہو گا کسی کے اِدھر آجانے یا بوڑھے کے باہر نکل جانیکے خیال سے اس نے چھپر کے دروازہ کو مقفل کر دیا۔

بوڑھے نے اس کے سامنے ریشمی دھوتی کا تذکرہ کیا۔ مگر وہ اسے دیوانے کی بکواس سمجھ رہی تھی۔

بوڑھے کا دماغی بخار بھی بڑھنے لگا۔ وہ رات بھر اُول جلول بکتا رہا۔ مگر صرف ایک چیز کی نسبت اس کے خیالات صاف تھے۔ ریشمی دھوتی جسے وہ اتنی بڑی قُربانی کے بعد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا، دولہا کو کس طرح دی جائے۔

دوسرے روز صبح سے رسوم ادا ہونے شروع ہوئے۔ بوڑھے نے آج کسی نہ کسی صورت باہر نکل کر شرکت کرنے کا ارادہ دل میں ٹھان لیا۔ اس نے پھٹی ہوئی دری کے نیچے رکھی ہوئی ریشمی دھوتی ہاتھ میں لی اور شام کے قریب جبکہ چوکے کے پاس پنڈت مہاراج بڑبڑا رہے تھے، بدقت تمام کھسک کھسک کے وہ دروازہ کے قریب پہونچا۔ اور اسے کھولنا چاہا مگر وہ بند تھا۔ اُسنے اپنی پوری قوت دروازہ کھولنے میں صرف کر دی لیکن یہ ایک بوڑھے ناتوان بخار کے مریض کے بس کا کام نہ تھا تنگ آکر اُس نے چیخنا شروع کیا۔ مگر اس کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا تھی۔ آخرش اس نے دروازے سے اپنا سر ٹکرانا شروع کیا ——— ایک جنون کے عالم میں۔

دوسرے روز تڑکے سے لچھمی کی ماں نے چھپر کا قفل کھولا اور دروازہ کو اندر کی جانب ڈھکیلا ——— مگر دروازہ نہ کھلا۔ اندر سے کوئی وزنی چیز پٹوں سے لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی مدد کیلئے بہن کو بلایا اور دونوں نے زور لگا کر دروازہ کھول ہی لیا لیکن ——— دروازہ کھلتے ہی دونوں جھجک کر پیچھے ہٹ گئیں ——— اندر بوڑھا چاچا زمین پر دروازہ کے قریب اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر جابجا سے پھٹا ہوا تھا۔ اور خون کے قطرے سر اور چہرہ سے بہہ بہہ کر ایک نئی خوشرنگ سُنہری گوٹ کی دھوتی پر جمے ہوئے ——— دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر خاموشی سے دروازہ بند کیا، قفل ڈالا اور گھر واپس آگئیں ——— یہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔

اقرارِ محبت

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

"اختر کتنا حسین ہے!"
"اُس کی آواز کتنی دلکش اور موہنی ہے"
"جب کبھی وہ آساوری یا بھیرویں الاپتا ہے تو میں پہروں کھڑی اُس کو سُنتی رہتی ہوں"
"لیکن مجھے اُس سے ذرا بھی محبت نہیں!"

"قیصر بے شمار دولت کا واحد مالک ہے!"
"دنیا اُس کو آنکھوں پر بٹھاتی ہے"
"جب کبھی میں اُس کے مرمریں محل میں جاتی ہوں تو میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کا فرنیچر، زرق برق پوشش، نفیس اور لذیذ کھانے اور اُس پر اُس کا خُلق —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں دوسری دنیا میں ہوں"
"لیکن مجھے اُس سے ذرا بھی محبت نہیں!"

"حامد کتنا وجیہ اور طاقتور ہے!"
"دُنیا اُس کو سراہتی ہے۔ آئے دن اُس کی تصاویر اخبارات میں شایع ہوتی رہتی ہیں"
"وہ میرے روبرو اپنی غیر معمولی طاقت کا ہزاروں طرح سے مظاہرہ کیا کرتا ہے۔ وہ جمناسٹک کا ماہر ہے"
"لیکن مجھے اُس سے ذرا بھی محبت نہیں!"

"ظہیر کتنا قابل ہے!"
"اُس کا دماغ فلسفیانہ اور اُس کا دل لمعاتِ عشق سے منور ہے۔ وہ اپنی علمیت کی بدولت ایک لازوال شہرت کا مالک بن بیٹھا ہے"
"پہروں وہ مجھے غالبؔ، جوشؔ، اور جگرؔ کے اشعار سُنا سُنا کر بیخود بنائے رکھتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے زرّیں اقوال اُس کو ازبر ہیں۔ خود بھی وہ ایک پرزور قلم کا مالک ہے"

"لیکن مجھے اُس سے ذرا بھی محبت نہیں!"

"تم — پیارے شوہر! — نہ تو اختر کی طرح حسین و خوش گلو ہو"
"نہ قیصر کی طرح مالدار ہو"
"نہ حامد کی طرح طاقتور ہو — اور نہ"
"نہ ظہیر کی طرح قابل ہو"
"لیکن پھر بھی — پیارے شوہر! — مجھے تم سے عشق ہے!"
"کیوں — سنتے نا؟"

انصار ناصری۔ بی۔ اے (دہلوی)

نگۂ شوق کی شکایت

نواب سید ابو المحسن صاحب بلگرامی

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے

کبھی گئے جو چمن میں تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوئے ہوئے بار بار دیکھا ہے

بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے
نسیم نے تمہیں مستانہ وار دیکھا ہے

سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکا کر
شفق نے تم کو سرِ جوئے بار دیکھا ہے

ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تم کو
نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے

کبھی جو بیٹھے ہو گیسو سنوارنے کے لئے
تو آئینہ نے تمہیں ہمکنار دیکھا ہے

گیا وہ دامنِ کہسار نے تمہیں اکثر
اسیرِ زمزمۂ آبشار دیکھا ہے

عروسِ برق نے اپنا نقاب اُلٹ کے تمہیں
غریقِ مستیِ ابرِ بہار دیکھا ہے

کسی خیال میں کھوئے ہوئے تمہیں اکثر
نگاہِ گل نے تہِ شاخسار دیکھا ہے

غرض مظاہرِ قدرت نے ہر طرح تم کو
ہزار بار نہیں، لاکھ بار دیکھا ہے

مگر مری نگۂ شوق کو شکایت ہے
کہ اُس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

لال کُرتا

از جناب محمد منظور صاحب

"اماں مجھے بھی ایک لال کرتا بنوا دو، اب تو ہولی بھی آگئی، سب لوگ نئے نئے کپڑے بنوا رہے ہیں"

"بیٹا! یہاں کپڑا اچھا نہیں ملتا، نہیں تو میں تمہارے لئے کُرتا ضرور بنوا دیتی"

"ایسے اچھے اچھے کپڑے ملتے ہیں، میرے لئے کہیں کپڑا ہی نہیں ملتا، دیکھو! شیام کا کُرتا کتنا اچھا ہے"

"تو جلدی کیا ہے؟ میرے بیٹے! میں تیرا کُرتا سب سے اچھا بنوا دوں گی۔ کپڑا تو سب سے اچھا آجائے، جب تک صبر کرو"

"اماں! اب میں نہیں مانوں گا، تمہاری ایک بات بھی نہیں مانوں گا، میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کُرتا بنوا دو"

کہتے کہتے مدن ضد کرنے لگا، مچل گیا اور ہٹ پکڑلی، سلوچنا اپنے کو اب زیادہ نہ روک سکی، ضبط کی تاب نہ رہی، ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لی، جس کے ساتھ دو آنسو بھی نکل پڑے اور گالوں پر بہہ گئے، اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بچے کو بہلاتے ہوئے بولی "بیٹا آج تو اب شام ہوگئی ابھی جاکر کھیلو، کل تمہارے لئے ضرور اچھا سا کُرتا لادونگی"

بچے کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا اور وہ خوشی خوشی اچھلتا کودتا کھیلنے کے لئے جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ اس کی مسرت کو دیکھ کر سلوچنا اپنے اُمنڈتے ہوئے جذبات کو ضبط نہ کرسکی، اور جھونپڑی کے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی، تھوڑی دیر کے بعد جب طبیعت ہلکی ہوئی وہ اُٹھی اور باہر سے کچھ لکڑیاں ایندھن کے طور پر جمع کر کے لائی اور چولھا جلانے لگی، ایک کونے سے اپنی ہانڈی نکال کر جھاڑی، مشکل سے مٹھی بھر چاول رہے ہوں گے، کوئی صورت نہ دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ اتنا پکا کر مدن کو کھلا دے، اور آپ یونہی سو رہے، کل چھٹا بیٹے گا، مزدوری ملیگی تو کھانے کا سامان لائیگی۔

سلوچنا نے چاول پکاتے وقت خیال کیا کہ دال ترکاری نہیں ہے بچہ روکھے چاول کھائے گا نہیں، اس لئے اس نے تھوڑا سا نمک ڈال دیا۔ اور یہ نمکین بھات پکا کر مدن کا انتظار کرنے لگی۔

مدن آگیا۔ آج اس کا جی کھیل میں نہیں لگا، گھر میں آیا، ماں نے بڑے پیار سے وہی بھات نکال کر کھانے کو دیا، مدن کھا چکا تو کہنے لگا "اماں! تم بھی کھالو تو جلدی سے سو رہیں"

ماں نے غمگین لہجہ میں کہا "میں آج نہیں کھاؤں گی تم سو رہو۔ مجھے بھوک نہیں لگی ہے"

"اماں تم نے صبح بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا کیا تم کو کبھی بھوک نہیں لگتی"

ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اس نے کچھ کہنا چاہا۔ دل نے کہا کہ "بیٹا تم کیا جانو غریب کی بھوک ایسی ہی ہوتی ہے۔ جس دن اُن کے پاس کھانے کو نہیں ہوتا اس دن اُن کو بھوک نہیں لگتی" دل کے جواب کو دل ہی میں رکھ کر بولی "میں بڑی ہوں اور تم چھوٹے، اس لئے تمہیں بھوک زیادہ لگتی ہے اور مجھے کم"

"اماں یہ بات ہے تو میں کبھی بڑا نہیں ہونگا۔ نہیں تو تمہاری طرح بغیر کھائے رہنا ہوگا"

بھولے بچہ کے ان الفاظ میں معلوم نہیں مستقبل کی کیسی بھیانک تصویر کھنچی تھی کہ سلوچنا کا دل کانپ اُٹھا اور اس نے اپنے یتیم بچہ کو بھینچ کر سینہ سے لگا لیا۔

(۳)

صبح تڑکے کے وقت جب کہ آفتاب جلدی جلدی اپنی کرنوں سے تمام دنیا کو روشن کر رہا تھا، سلوچنا مغموم و پریشان اُٹھی، قریب ہی مدن محوِ خواب تھا بڑے پیار سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی، اسکا بھولا بھولا مُنہ دیکھ کر کسی کی یاد ستا گئی، ساتھ ہی اس کی کل کی ضد یاد آگئی، اپنی راحت و آرام کا خیال چھوڑ کر اس کے پاس گئی، اور اس کو جگایا، ہاتھ مُنہ دُھلا کر ایک لوٹے میں پانی اور وہی کل کے باسی چاول اس کے سامنے رکھ دئے، مدن کھانے لگا اور سلوچنا مزدوری کرنے چلی گئی، یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔

آج سلوچنا کو بڑی خوشی تھی، کیونکہ جس کے یہاں وہ کام کرتی تھی وہ اتوار کے دن ہفتہ بھر کی مزدوری دیا کرتا تھا، اور آج اتوار کا دن تھا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ مزدوری ملنے پر سب سے پہلے جو چیز خریدے گی وہ مدن کے لئے "لال کرتا" ہوگا، اگرچہ ساتھ ہی یہ فکر بھی دامنگیر ہوگئی تھی کہ ہفتہ بھر کے کھانے کو کہاں سے آئے گا، کل سلوچنا نے دن بھر کچھ کھایا نہیں تھا جس سے اُس کو چلنے پھرنے میں کمزوری معلوم ہو رہی تھی، لیکن یہ خیال اُس کی ساری کمزوریوں کو بُھلا دیتا تھا کہ مدن "لال کرتا" پاکر کیسا خوش ہوگا۔ باوجود اس کے آج اس کا جی کام میں نہیں لگتا ہے، دن گویا ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ سلوچنا بار بار آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی جیسے اُس کی آنکھیں سورج دیوتا سے یہ التجا کر رہی تھیں کہ "اپنا سفر جلد طے کرلیں"

سورج دیوتا نے گویا دُکھیاری سلوچنا کی یہ التجا سُن لی اور مغرب میں جا کر اپنا مُنہ چُھپانے لگے، مالک حساب کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ ایک ایک مزدور کا نام باری باری لینا اور اُن کا حساب چُکتا دیکر رخصت کر دیتا۔ سلوچنا صبر شکر کئے اپنے نام کے پکارے جانے کا انتظار کرنے لگی۔

مزدوری بانٹتے بانٹتے مالک نے آواز دی "سلوچنا"۔ اپنا نام سُنکر سلوچنا آگے بڑھی اور ملتجی نگاہوں سے مالک کو دیکھنے لگی، مالک نے اپنی ہی دیکھ کر سلوچنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم ساڑھے چار

آنے روز پر ہو، تمہاری کُل مزدوری دو پیسے کم دو روپے ہوئے، کیوں؟"

سلوچنا گھبرا گئی، اور جلدی سے بیچ میں ایک اُمید ــــ موہوم اُمید پر بول اُٹھی:-

"مالک اس بار پورے دو روپے دے دیجئے آیندہ ہفتہ میں چاہے یہ دو پیسے کاٹ لیجئے کا' کل ہولی ہے۔"

سلوچنا نے دل ہی دل میں حساب لگایا "دس بارہ آنے کا ایک اچھا سا کُرتا مل جائے گا باقی میں کسی نہ کسی طرح آٹھ روز چلالوں گی" اتنے میں مالک کی آواز سُنکر سلوچنا کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مالک کچھ تیز لہجہ میں کہہ رہا تھا "بیچ میں مت بول دیا کرو حساب میں گڑبڑ کرنا مجھے پسند نہیں۔ ہر آدمی کو اگر دو دو چار چار پیسے زیادہ دیدیا کروں تو میں کہانتک یاد رکھ سکتا ہوں"

سلوچنا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مالک! اگر آپ بھول جائیں گے تو میں آپ کو یاد دلا دونگی"

مالک نے ڈانٹ کر کہا "پھر بیچ میں بولی، تم لوگوں کا ایسا ہی ایمان ہوتا تو کیا بات تھی، اب اگر بیچ میں بولی تو جرمانہ کر دوں گا"

جرمانہ کا نام سُنکر سلوچنا چپ رہ گئی۔ مالک پھر بولا "ایک دن تم گھنٹہ بھر دیر کر کے آئیں، اور ایک دن آدھ گھنٹہ، ایسا ہی اس حاضری کے رجسٹر میں کئی بار لکھا ہے، سب ملاکر تمہاری غیر حاضری آدھے دن کی ہوتی ہے۔ غیر حاضری کے نو پیسے کٹیں گے۔ سمجھ میں آیا؟"

سلوچنا پر گویا بجلی گر گئی، وہ گڑگڑانے لگی "مالک ایسا نہ کیجئے، میں بے موت مر جاؤں گی، اس مرتبہ معاف کر دیجئے، پھر کبھی دیر نہیں ہوگی"

مالک نے پھر ڈانٹا۔ سلوچنا ہاتھ جوڑ کر بولی "مالک ہمارے پاس گھڑی نہیں ہے جو ہم بالکل ٹھیک وقت پہ آویں تھوڑی بہت دیر ہو گئی، اب کی مرتبہ آپ ــــ"

مالک نے گرجتے ہوئے کہا "چپ رہو، شور مت کرو، مجھے بہت پریشان کرو گی تو کچھ نہیں دوں گا، جاؤ ہمارے اوپر دعویٰ کرو، اگر جیتو گی تو وہ نو پیسے لے لینا، بس میں تمہیں ایک پائی بھی زیادہ نہ دونگا"

سلوچنا نے ایک دلدوز آہ کھینچ کر آسمان کی طرف دیکھا، گویا خدا سے کہہ رہی ہے کہ "تو کیسا انصاف پسند خدا ہے کہ اتنی بے انصافیاں دیکھتا ہے۔ غریبوں ہی کو پیسنا اور اُن پر ظلم کرنا تیرا بھی انصاف ہے"

"کرتا ضرور خریدوں گی نہ ہوگا دو چار دن بھوکوں مروں گی" یہ سوچ کر سلوچنا نے ایک روپیہ سوا تیرہ آنے لے لئے اور چپ چاپ بازار کی طرف چلدی اس کے پیر ایک مشین کی طرح آپ ہی آپ تیزی کے ساتھ بڑھ رہے تھے، مگر دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا....

(۴)

"آہا ہا! لال کرتا پاکر میرا مدن کتنا خوش ہوگا۔" سلوچنا ایک کپڑے والے کی دُکان کے سامنے کھڑی ہوکر مدن کے واسطے کُرتا ڈھونڈھ رہی تھی، ایک کُرتا اُسے بہت پسند آیا۔ ساتھ ہی اُس کو یہ یقین ہوگیا کہ مدن کو بھی یہ کرتا ضرور پسند آئے گا، سلسلۂ خیال میں ایسی محو ہوئی کہ دوکاندار سے پوچھے بغیر قریب ہی ٹنگے ہوئے ایک کرتے کو دیکھنے کے لئے اُتار لیا، کرتا ابھی وہ کھینچ ہی رہی تھی کہ دُکاندار چلّا اُٹھا "چور! چور!!"

سلوچنا گھبراہٹ سے بھونچکی سی ہوگئی، کُرتا دُکاندار کو دیتے ہوئے کہنے لگی "میں چور نہیں ہوں، اس کرتے کو خریدوں گی اس لئے ذرا دیکھ رہی تھی۔"

دوکاندار نے اس کی باتوں پر قطعی توجہ نہ کی، اور سلوچنا کو پکڑ لیا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ لوگ اکٹھے ہوکر تماشہ دیکھنے لگے۔ سلوچنا نے اپنی بات دُہرائی اور کہا "اس کرتے کے دام بتاؤ میں اگر بلا دام دئے یہ کرتا لیجاؤں تو کہنا کہ میں ...."

سلوچنا کی بات بھی پوری نہیں ہونے پائی کہ وہاں قہقہہ لگا اور دوکاندار نے کہا "صورت دیکھو تو معلوم ہو کہ معلوم نہیں کتنے دنوں سے کھانے کو نہیں ملا، چلی ہے یہ ڈیڑھ روپے والا ریشمین کُرتا خریدنے۔"

"ضرور یہ شاطر چور ہے، معلوم ہوتا ہے دُکان میں سے نظر بچا کر اس نے کچھ نقد بھی چُرا لئے ہیں۔ ورنہ یہ پھٹے حال اور یہ ریشمین ڈیڑھ روپیہ والا کرتا۔"

سلوچنا دوکاندار سے ہاتھ چُھڑانے کی جتنی کوشش کرتی اُتنی ہی طاقت کے ساتھ دوکاندار اُس کا ہاتھ پکڑتا جاتا، ہنگامہ کا شور و شر سُنکر حلقہ کا کانسٹبل آگیا اور لوگوں کی دلچسپی کا سامان پیدا ہوگیا۔ سلوچنا کی تلاشی لی گئی، اس کے پاس سے نکلے ہوئے ایک روپیہ سوا تیرہ آنے کو چوری کا مال کہہ کر سپاہی نے اپنے پاس رکھا، سلوچنا نے چُھٹکارے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر اپنے مالک کا نام بتایا، جس کے یہاں سے اس کو ایک روپیہ سوا تیرہ آنے ملے تھے۔ اس پر سپاہی نے کہا "پہلے تھانے چل پھر باتیں بنانا۔" غریب سلوچنا کی باتوں پر کسی نے توجہ نہیں کی، اس دکھیاری کی آہوں کو کسی نے نہیں سُنا۔ سپاہی اُسے گھسیٹتا ہوا تھانے کی طرف لے چلا، بیکس عورت نے آس توڑ کر ایک فلک دوز آہ کھینچی اور تھانے کی طرف چل دی۔

وہاں تھانہ دار نے اُس کے مزدوری والے پیسے رکھ لئے۔ مار پیٹ کر اور گالیاں دے کر نکالدیا۔ بدنصیب سلوچنا، جو دن بھر کی تھکی اور کئی وقت کی بھوکی تھی ان پیہم صدمات کا مقابلہ نہ کر سکی، بیہوش ہوگئی اور اسے معلوم نہیں کہ وہ کب تک بیہوش رہی۔

رات کی ٹھنڈی ہوا سے ہوش آیا، دن کے سارے واقعات اس کے دماغ کے سامنے سینما کے سین کی طرح آنے لگے "مدن اب تک میرے نہ لوٹنے سے گھبرا رہا ہوگا" یہ سوچتے ہی اُس کے دماغ میں آیا کہ فوراً گھر پہونچ جائے۔ لیکن اس خواہش کے ساتھ ہی اُس کو مدن کے لال کرتے کی ضد یاد آگئی۔ کہ آج ہی کے دن میں نے لال کرتا لا دینے کا وعدہ کیا تھا، آہ! بدنصیب مدن!! میری واپسی میں دیر ہو جانے سے اُمید لگائے ہوگا کہ لال کرتا ضرور ملے گا، کرتا نہ پاکر وہ کیسا مایوس و غمگین ہوگا؟ مگر اب تو پاس کے دام بھی چھن گئے اب میں کرتا کیسے خریدوں گی؟ کرتا لئے بغیر میں مدن کے پاس کس طرح جاؤں؟ آج کرتا نہ پاکر اس کو کتنا رنج اور دکھ ہوگا"

مدن کا اُداس اور مغموم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس نے ایک خوفناک ارادہ کیا! جلد ہی ایک ایسے کام کا خیال دل میں آیا جس سے کانپ گئی۔ مگر ساتھ ہی یہ پختگی کے ساتھ ٹھان لیا کہ کچھ بھی ہو وہ مدن کے پاس کرتا لیکر جائے گی۔

اس کے دماغ نے سوچنا شروع کر دیا، نہایت تیزی کے ساتھ مختلف تدبیریں سامنے آئیں، دل نے کہا کہ "چوری کا بدنما داغ تیرے دامن پر لگ ہی چکا۔ ناکردہ گناہ کی داد جب ملے تو اس کے نہ کرنے کی حسرت کیوں رہے، اس دنیا میں کوئی جرم کرو یا نہ کرو غریب ہونا ہی سب سے بڑا جرم ہے۔ سوسائٹی دولتمندوں کے بدترین معاصی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن غریبوں کی خفیف سی لغزش پر بڑے بڑے ناکردہ جرائم اُن کے سر منڈھتی ہے۔ چوری کا الزام جب مجھ پر لگ چکا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنے معصوم بچہ کی خواہش پوری نہ کروں، میں وہ کرتا چراؤں گی اور جس طرح بنے گا چراؤں گی"

سلوچنا اُٹھی مگر اُس کے پیر ڈگمگانے لگے اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ لاچار ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ لیکن چُپ چاپ بیٹھنے میں اُسے آرام نہیں ملا۔ اندرونی خلش دل کو بے چین کئے تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اُٹھی، بچہ کو خوش و خرم دیکھنے کے لئے ممتا کی ماری ماں اپنی تکلیف بھول گئی۔ آہستہ آہستہ بازار کی طرف چلی۔

دور سے اُس نے دیکھا، وہ دوکان اب تک کھلی ہوئی تھی، کوئی دولتمند خریدار بیٹھا کپڑے دیکھ رہا تھا، اُس کے چاروں طرف کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا تھا، مگر اس کو کوئی کپڑا ہی پسند نہیں آتا۔ ڈھیر میں اس نے وہ "لال کرتا" بھی دیکھا، اس کرتے کو دیکھتے ہی سلوچنا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ وہ لال کرتا ڈھیر میں سے گر کر نیچے سڑک پر گر گیا ہے، یہ دیکھکر بہت خوش ہوئی اور چپ چاپ آگے بڑھی، دوکاندار ایک دوسرا کپڑا نکالنے کے لئے دوکان کے اندر چلا گیا تھا موقع پاکر سلوچنا نے نہایت خاموشی اور پھرتی کے ساتھ وہ کرتا نیچے سے اُٹھالیا اور

اپنی ساری میں چھپالیا۔ اور جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ وہ بار بار پیچھے کی طرف دیکھتی جاتی تھی، اسکو ڈر لگا تھا کہ کہیں کوئی اس کے تعاقب میں آتا نہ ہو، کہیں اس کو چوری کرتے ہوئے کسی نے دیکھ نہ لیا ہو، خدا کے کام بھی عجیب ہیں۔ سلوچنا نے جب چوری نہیں کی تب پکڑی گئی، لیکن اب اُس نے چوری کی تو اُسکی طرف کسی کا خیال بھی نہیں گیا۔

تھوڑی دور چلنے پر اس کو اطمینان ہوگیا کہ اس کو چوری کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، کیتے کو اُس نے اچھی طرح چھپالیا۔ اپنی آرزو پوری ہوتے دیکھکر اور خود کو اپنے ارادوں میں کامیاب سمجھ کر اُسے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ فرطِ مسرت سے اپنے گھر کو قریب دیکھ کر بھی اندر نہ جاپائی۔ گھر کے پاس پہونچی ہی تھی کہ تھکان اور خوشی کی زیادتی کی وجہ سے اس کو چکر آیا اور وہیں بیہوش ہو کر گر گئی۔

۴

صبح کا سہانا وقت ہے، سب لوگ میٹھی نیند چھوڑ کر اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے ہیں اور دُنیا کے جھنجھٹوں میں پھنس گئے ہیں۔ سب سے زیادہ جھنجھٹ میں گاؤں کے لوگ پھنسے ہیں کیونکہ آج ڈپٹی صاحب دورے پر آنے والے ہیں، ان کی بیگار میں گاؤں کے سب ہی غریب مزدور پکڑے جا رہے ہیں، سرکاری نوکر اور پیادے ڈپٹی صاحب کے خیر مقدم کی تیاری کر رہے ہیں، اُن کے استقبال کے بندوبست میں آج گاؤں کے مزدور اپنے کام پر نہ جا پائے۔ سب بیگار میں پکڑے گئے ہیں، اس کے باوجود وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ! گھاس چھیل کر صاف کرنا، اینٹوں کے ڈھیر کو سامنے سے ہٹانا، خیمہ لگانا، رسد مہیا کرنا، نہ معلوم کتنے کام ہیں، گاؤں بھر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

مدّن بہت دیر تک رات کو اپنی ماں کے آنے کا انتظار کرتا رہا اور انتظار کرتے کرتے بھوکا سو گیا۔ صبح جاگنے پر بھی اپنی ماں کو گھر میں نہ دیکھ کر ڈھونڈھنے کے لئے فوراً باہر نکلا۔ گھر سے نکلتے ہی اُس نے چند قدموں کے فاصلہ پر اپنی ماں کو بیہوش پڑا دیکھا، دیکھ کر فوراً دوڑا ہوا گیا اور اماں اماں!! چلاتا ہوا اسے جھنجھوڑنے لگا، اس کو سوتی ہوئی سمجھ کر کہنے لگا "اماں! تم یہاں سو رہی ہو، میں رات بھر مارے بھوک کے تڑپتا رہا۔ اوہو! چلکر مجھے کھانا دو۔"

اس کے جھنجھوڑنے اور حرکت دینے پر بھی نہ بولی تو مدّن گھبرا گیا کہ میری ماں کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی اطلاع دینے کے لئے پڑوسی کے گھر گیا کہ اس کو لاکر دکھلاؤں۔ شاید وہ کچھ مدد کرے۔ دوسری طرف سے مزدوروں کی بیگار ڈھونڈھتا ہوا تحصیل کا چپڑاسی نکل آیا۔ مدّن کو دیکھتے ہی جھپٹ کر پکڑ لیا مدّن کے رونے، پیٹنے، اور فریاد کرنے، ماں کی حالت بیان کرنے پر کوئی خیال نہ کیا اور اسکو زبردستی

گھسیٹتا ہوا اس جگہ لے گیا جہاں ڈپٹی صاحب کے ٹھہرانے کا انتظام ہو رہا تھا۔

مدن اینٹیں ہٹانے کے کام میں لگایا گیا، کل صبح اُس نے وہی تھوڑا سا باسی بھات کھایا تھا اس کے بعد اب تک اس کو کچھ بھی کھانے کو نہیں ملا تھا۔ کچھ اینٹیں اُٹھانے کے بعد ہانپنے لگا اور کام کرنے سے اُس نے انکار کر دیا۔ کمزوری کی وجہ سے اس سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ اس پر سرکاری ملازمین نے بہت ڈرایا دھمکایا، اس پر بھی وہ کام کرنے پر راضی نہ ہوا تو ایک چپراسی نے اس کے دو تین بیتیں ماریں، مار کھا کر معصوم بچہ تڑپ گیا، اور روتے روتے اینٹیں اُٹھانے لگا۔

مدن نے ایک اینٹ ہٹائی، اینٹیں بہت دنوں سے وہاں پڑی تھیں، اُن کے نیچے معلوم نہیں کتنے جانور پیدا ہو گئے تھے۔ ایک سانپ نے چپکے سے مدن کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ اس کی تکلیف سے مدن تڑپ گیا۔ اور اینٹیں وہیں پھینک کر چلّا اُٹھا "مجھے کسی نے کاٹ لیا! ہائے کسی نے کاٹ لیا!" اس کے چلّانے کی آواز سُنکر دو تین مزدور جو پاس ہی کام کر رہے تھے وہاں آ گئے اور اینٹیں ہٹا کر ڈھونڈھنے لگے کہ کس جانور نے کاٹا ہے۔ لیکن سرکاری اہلکار کام میں کوتاہی برداشت نہ کر سکے اور وہ بھی وہاں آ گئے۔ مدن کا سر چکرانے لگا تھا اس کو سانپ کا زہر چڑھ رہا تھا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور چلّا چلّا کر رونے لگا۔

اہلکاروں نے یوں کام بند دیکھ کر یہ سمجھا کہ سارا فساد اسی لونڈے کا اُٹھایا ہوا ہے جو بڑے ڈرانے، دھمکانے سے آیا اور یہاں یوں ڈھونگ رچا رہا ہے۔ ایک بولا "میں سب سمجھتا ہوں، یہ لونڈا ہے تو ذرا سا مگر بڑا ہی منفنی ہے۔ ابھی ابھی اینٹیں ڈھونے سے انکار کر رہا تھا۔ اور اب اس نے دوسرا ڈھونگ نکالا، ان اینٹوں میں رکھا ہی کیا ہے جو اسے کاٹے۔ دیکھو! میں ابھی اس کو ٹھیک کئے دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنا چابک سیدھا کیا، اتنے میں سلوچنا دوڑی ہوئی آ گئی۔

سلوچنا کو جب ہوش آیا، سیدھی گھر میں گئی۔ مدن کو نہ پاکر گھبرا گئی۔ پڑوس کے لوگوں سے اُس نے بیگار کا حال سُنا اور یہ بھی معلوم کیا کہ مدن بھی وہیں گیا ہے، تو وہ جلدی جلدی وہاں پہونچی۔ مدن کو دور سے دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئی۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ چپراسی نے اُس کے پیارے مدن کو چابک مارا، جس کی چوٹ کھاتے ہی مدن تڑپ کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرا کوڑا اُٹھایا ہی تھا کہ سلوچنا مدن کو بچانے کے لئے دوڑ پڑی۔ اہلکار نے دوسرا چابک چلایا جو مدن کے نہیں لگا بلکہ سلوچنا کی پیٹھ پر پڑا۔ کیونکہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو بچانے کے واسطے اپنے جسم سے اُس نے بالکل ڈھک لیا تھا۔ اہلکار نے تیسرا چابک اُٹھایا، گاؤں والے مدن

اور اس کی ماں پر جو ظلم ہو رہا تھا زیادہ دیر نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اس اہلکار کو دھکا دے کر علیحدہ کر دیا اور اس سے چابک چھین لیا۔ ساتھ ہی جو لوگ کہ اینٹیں ہٹا کر دیکھ رہے تھے کہ کس جانور نے کاٹا ہے، چلا اُٹھے "سانپ! سانپ!!" سب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مدن کو سانپ ہی نے کاٹا ہے۔ چاروں طرف شور مچ گیا، لوگ جھاڑنے پھونکنے والوں کو ڈھونڈنے لگے۔

سلوچنا نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ آواز دی "بیٹا!" مدن نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں اور بڑی حسرت کے ساتھ ماں کو دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں، سلوچنا دیوانوں کی طرح چیختی چلاتی اور دردناک آواز میں کہتی جاتی "بیٹا آج ہولی ہے، لے اپنا لال کرتا پہن"

مدن نے پھر اپنی آنکھیں کھولیں، ماں نے اس کی طرف لال کرتا بڑھایا۔ کرتا دیکھ کر بچہ کے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے کرتا لینے کے واسطے اپنا ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن ہاتھ نہیں اُٹھا۔ سلوچنا بڑے زور سے چیخ کر رو پڑی۔ اور روتے روتے اس نے وہی لال کرتا اپنے بچہ کے اوپر ڈال دیا۔ پھر بولی "بیٹا! بیٹا!! مجھے چھوڑ کر تو کہاں جا رہا ہے، غصہ مت ہو، روٹھ نہیں لے اپنا لال کرتا پہن لے"

آہ! اب لال کرتا پہننے کے واسطے مدن کہاں تھا۔ لال کرتے کی تمنا دل کے دل ہی میں لئے وہ اس ذلیل دنیا اور زندگی کو خیرباد کہہ چکا تھا، جو ایک قیدخانہ اور مسلسل عذاب ہے۔ لال کرتا آیا، مگر اس وقت جب مدن نہ رہا۔

سلوچنا چیخ مار کر اپنے لخت جگر کی لاش پر گر پڑی۔ جھاڑنے پھونکنے والے آئے لیکن اب کیا تھا جب کچھ ہو سکتا تھا، تب وہاں چابک پڑ رہے تھے۔ اب اہلکار سب کے سب سٹ پٹا رہے تھے اور بغلیں جھانک رہے تھے، کاش! ان کو خلق خدا پر رحم کرنا آتا۔

سب سے زیادہ سرمایہ داروں کے ظلم وجور پر دو لاشیں شہادت دے رہی تھیں، جن میں سے ایک کے گالوں پر تازہ آنسوؤں کی بوندیں تھیں، اور دوسرے پر وہی "لال کرتا!"

(ترجمہ)

جذبۂ تخلیق

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

خدا تعالیٰ کا وجود ایک ایسے زمانے سے ہے، جس کی کوئی ابتدا نہیں۔ عرصۂ دراز تک وہ ایک عضوِ معطّل کی طرح بیکار رہا۔ لیکن آخر کہاں تک؟ —— وہ ایک زبردست انہماک کا طالب تھا —— ایک ایسے انہماک کا جس میں گھر کر اسے ایک لمحہ کی بھی فرصت نصیب نہ ہو۔

اس کے تخیّل نے پرواز کی، دماغ پر زور ڈالا اور یہاں تک کہ اپنے ابرو کے ایک اشارے سے سینکڑوں عالم تخلیق کر ڈالے۔ انہیں میں سے ایک کرۂ ارض بھی ہے۔ جس کے ساتھ خدا کو غیر معمولی طور پر بہت زیادہ دلچسپی ہو گئی۔

کئی صدیاں گذر گئیں۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ تمازتِ آفتاب سے سمندر کا پانی بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور سربفلک پہاڑوں سے ٹکرا کر پھر اپنی اصلی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پانی میں نمو کی قوت تھی۔ سبزہ اُگ آیا۔ درخت پھلے پھولے گلہائے رنگا رنگ اپنی نکہت سے صبا کو معطر کرتے۔ مگر بیکار۔ قسم قسم کے پھل ڈالیوں پر نمودار ہوتے مگر ان سے لطف اندوز ہونے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر خدا نے لاکھوں قسم کے جانور پیدا کر دئے۔ بعض نے سمندر کی گہرائیوں میں سکونت اختیار کی۔ اور کچھ فضا کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگے۔ باقی نے سطحِ زمین پر رہنا شروع کر دیا۔ مگر اس مخلوق سے بھی خالق کا مقصدِ حقیقی پورا نہ ہوا۔ وہ ایک زبردست محویت کا طالب تھا۔ ایک ایسی محویت کا جس میں گم ہو کر وہ خود اپنی ہستی کو بھول جائے۔

کئی صدیاں گذر گئیں۔

یکایک اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کامیابی کے آثار چہرے سے نمایاں ہونے لگے۔ کائناتِ عالم کو حکم دیا کہ ہر شے اپنی بساط کے مطابق کوئی تحفہ پیش کرے۔ خدا کو ایک نئی ہستی دائرۂ وجود میں لانی منظور تھی۔ اعضائے فطرت نے احکام کی تعمیل شروع کر دی۔

پہاڑوں کی بلندیوں نے عالی ہمتی پیش کی۔ دامن کی پستیوں نے عجز و انکساری، سمندر جوش میں آیا اور اپنی تہ سے گوہر نکال کر ساحل پر بکھیر دئے۔ زمین نے اپنے پوشیدہ دفینے اُگل دئے۔ تاروں نے ضیا، چاند نے سرد مہری، سورج نے تمازت اور آسمان نے رعد و ابر و باران، صبا نے خرامِ ناز، گل نے نکہت، بلبل نے پاسِ وفا، شبنم نے طراوت۔ دریا کی موج نے جوشِ عمل۔ حباب نے بے ثباتی کا سبق۔ شمع نے سوزِ غم۔ پروانے نے خود کو فنا کر دینے کی تعلیم —— سب سے آخر میں قسمت کی دیوی بینا بدوش

جلوہ افروز ہوئی۔ اس کے دونوں شانوں پر دو صراحیاں تھیں۔ ان میں سے ایک اُتار کر اُس نے خدا کے دائیں جانب رکھدی، جس میں لاکھوں طرح کی نیکیاں تھیں۔ پھر دوسری صراحی اتاری اور خدا کے بائیں جانب رکھدی جو ہر قسم کی بدی سے لبریز تھی۔

خدائے قدوس ایک رفیع الشان تخت پر رونق افروز تھا۔ کائناتِ عالم کے پیش کئے ہوئے تحائف اس کے قدموں میں پڑے تھے۔ وہ مسرور تھا۔ تکمیلِ آرزو کے تمام لوازمات فراہم ہو چکے تھے۔ اس نے اشارہ کیا۔ عناصر میں ترتیب شروع ہو گئی۔ اور ایک نیا پُتلہ دائرۂ وجود میں آگیا۔ جس کا نام انسان رکھا۔ خدا کے تنفس سے اس میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس نے آنکھ کھولی اور فرشتے اُس کی تعظیم کے لئے جھک گئے۔

خدا نے اسی قسم کے بے شمار پتلے بنائے اور اُن کو دنیا میں رہنے کے لئے بھیج دیا۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ پر رکھی ہوئی صراحی کو، جو قسمت کی دیوی نے پیش کی تھی، انڈیل دیا۔ سطحِ ارض پر نیکیوں کی بارش ہو گئی۔

کئی صدیاں گذر گئیں۔

خالقِ حقیقی نے دیکھا کہ دُنیا کے تمام لوگ ملائکۂ آسمانی کی طرح نہایت معصوم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ صبح و شام خودرو پھلوں کو کھا کر دریا کا پانی پی لیتے ہیں، اور باقی وقت رکوع و سجود میں گذار دیتے ہیں۔ خدا کو یہ بات پسند نہ آئی۔ کیونکہ زہد و اتقا کی اس طرزِ زندگی کو وہ پہلے ہی سے فرشتوں کے لئے مخصوص کر چکا تھا۔ آخرکار اُس نے بائیں ہاتھ پر رکھی ہوئی صراحی کو بھی جو قسمت کی دیوی نے پیش کی تھی، انڈیل دیا۔ سطحِ ارض پر بدی کی بارش ہو گئی۔

دنیا کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ لوگ طرح طرح کی مصیبتوں میں پھنس گئے۔ ہزاروں قسم کی بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ جو انہیں کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھیں۔ ظلم و ستم کا سکہ رواں ہوا، غرور و نخوت کے مُہلک جراثیم لوگوں کی ذہنیت میں پیدا ہو گئے۔ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اور جس طرح جنگل میں خونخوار درندے اپنے سے کمزور جانوروں کا شکار کر لیتے تھے۔ بالکل اسی طرح حضرتِ انسان کا بھی یہی شیوہ ہو گیا کہ طاقتور ہستیاں نحیف الجثہ لوگوں کو تکلیف دینا اپنا حق تصور کرنے لگیں۔ ایک خدا کی عبادت تو بڑی چیز ہے، وہ اپنے زعمِ باطل میں خود خدائی کا دعویٰ کرنے لگے۔

خدا مسرور تھا کیونکہ اس کا مقصدِ حقیقی پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا تھا۔

پھر خدا نے قسمت کی دیوی کو طلب کیا اور کہا۔ "دیکھ! تو نے دو تحفے پیش کئے تھے —— نیکی اور بدی —— میں نے ان دونوں کو کرۂ ارض پر بکھیر دیا ہے۔ تو دنیا میں جا، تمام نیکی اور بدی کو سمیٹ کر واپس لے آ۔ یہ کام تیرے سپرد کیا جاتا ہے۔ اسے جلد سرانجام دے، غفلت نہ کیجو۔"

قسمت کی دیوی آداب بجالائی۔ ایوانِ ایزدی سے باہر نکل کر پرواز کرتی ہوئی سطحِ ارض پر پہنچ گئی۔
کئی صدیاں گذر گئیں۔

عرصۂ دراز کے بعد دیوی واپس آئی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اور چہرے سے مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔
وہ خدا کے حضور میں گئی اور دو زانو ہوگئی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "یاباری تعالیٰ! صرف تیری ذات قادرِ مطلق ہے۔ وہ مہم جو تو نے میرے سُپرد کی تھی، اپنے ذمہ لیلے۔ وہ میرے بس کا کام نہیں ہے، میں اس کو سر کرنے سے قاصر ہوں"

خدا کے لبوں کو جنبش ہوئی "دیوی! مفصل حال بیان کر، تو نے دنیا میں جاکر کیا کام کیا اور کیا دیکھا؟"
قسمت کی دیوی نے اپنے حواس بجا کئے اور کہا۔

"اے ارض و سما کے مالک! جب میں دنیا میں گئی تو میرا خیال تھا کہ تمام نیکیاں امیروں اور بادشاہوں کے کاشانۂ عشرت میں مل جائیں گی، اور بدی کا سراغ غریبوں کے جھونپڑوں سے لگ سکیگا لیکن میرے توقعات کی پامالی ہوگئی۔ جب میں نے ایک قصر میں داخل ہوکر دیکھا کہ بادشاہ شہوت پرستی کا شکار ہوکر زنا کاری میں مشغول ہے۔ غریبوں کی آہ و فریاد اس کے کانوں تک نہیں پہونچ سکتی۔ وہ اپنے نفس کا غلام ہوگیا ہے۔ عدالتوں میں انصاف کوشی ہو رہی تھی۔ رشوت کا بازار گرم تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آئے جو رکوع و سجود میں تھے۔ لیکن جب میں اُن کے اعماقِ قلب میں داخل ہوئی تو اصل حقیقت منکشف ہوگئی۔ کہ وہ کس قدر ریاکار اور گندم نما جو فروش ہیں۔ پھر میں نے غریب کسانوں کے جھونپڑوں کا رُخ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تیری عبادت سے کس قدر غافل تھے۔ مگر ان کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات تھے۔ پاسِ وفا ان کا شیوہ تھا۔ دوسروں کے دُکھ درد میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن میں نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے علیحدہ نہیں کرسکی۔ ان کے اندر تمیز کرنا محال ہے۔ کیونکہ لاکھوں نیکیاں بدی میں تبدیل ہوچکی تھیں۔ بعض کی صورت ایسی مسخ ہوگئی کہ قطعی طور پر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ نیکی ہے یا بدی"

خدا مُسکرایا اور ضیائے تبسم سے تمام فضا منور ہوگئی۔ وہ پہلے سے سمجھا ہوا تھا کہ قسمت کی دیوی ناکام واپس آئے گی۔ اُس نے کہا۔

"اے قسمت! آج سے تیرے اختیارات سلب ہوگئے۔ اب انسان کے اعمال خود اس کے قبضہ میں ہیں۔ وہ نیکی کرے یا بدی۔ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر وہ قسمت کا گلہ کریں تو یہ اُن کی غلطی ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے نیکی اور بدی کو اپنا بنالیا ہے"

قسمت کی دیوی سکتہ کے عالم میں تھی کیونکہ اب اس کا کوئی اقتدار باقی نہ رہا تھا۔
اِس بات کو بھی صدیاں گذر گئیں۔

فضل حق قریشی دہلوی

داد کا شکریہ

کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند (حافظ)

محبت کا بڑی مدت ہوئی اِک خواب دیکھا تھا
بڑی مدت کے بعد اس خواب کی تعبیر نکلی ہے

زہے قسمت، ملی اب "خستگی کی داد" شاعر کو
خوشا! اب اندمالِ زخم کی تدبیر نکلی ہے!

سَرَت گردم! نہیں "نظم و نثر" یہ آہ و نالے ہیں
بڑھی نالوں کی توقیر، آہ کی تاثیر نکلی ہے

ضرورت اب نہیں اوروں کی تحسین و ستائش کی
لگی محنت ٹھکانے "راز" کی تفسیر نکلی ہے!

کیا ہے یاد، قربانت شوم! ہجراں نصیبوں کو
حجابِ شعر سے اُمید کی تصویر نکلی ہے

کتابِ زندگی کا آسمانی باب اسے سمجھوں!
کہ یا جنت سے اک چوری چھپے تنویر نکلی ہے

میں اپنے آہ و نالہ، گریۂ و فریاد کے صدقے
تکلف برطرف! اس التفات، اس داد کے صدقے

اعظمی اجمیری

بال کا پھندا

ایک مختصر ترین جاسوسی افسانہ

(مندرجہ ذیل فسانہ اگر رات بھر کھلے آسمان کے نیچے شبنم میں بھیگنے کے لئے رکھدیا جائے، تو صبح تک پھول کر ڈیڑھ سو صفحہ کے ناول کا حجم پیدا کریگا۔)

معمہ تقریباً لاینحل تھا۔ نمبر ایک، نوجوان کو بلا شبہ قتل کیا گیا تھا۔ نمبر دو، قاتل ایک مرد نامعلوم تھا۔

اس لئے "مشہور ترین" سراغرساں کو بلانے کی ضرورت پیش آئی۔

اس نے لاش پر ایک سرسری نگاہ ڈالی، اور دفعتاً جیب سے خوردبین نکالی۔

"ہا، ہا" اس نے مقتول کے کوٹ کے کالر سے ایک بال اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "معمہ اب حل ہو گیا"

اس نے بال کو دو انگلیوں میں احتیاط سے پکڑ کر سب کو دکھایا۔

"سُنو" اس نے کہا۔ "بال کے مالک کی تلاش کرو۔ وہی قاتل ہے"

منطق صحیح اور استدلال قاطع تھا۔

سراغرساں نے تلاش شروع کی۔

چار دن اور چار راتیں وہ بھیس بدلے شہر کی گلیوں میں گھومتا رہا ہر رہرو کے چہرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے۔ جس کے سر کا کوئی بال کم ہو۔

پانچویں دن اس نے ایک آدمی کا پتہ لگایا جو سیاح کے لباس میں تھا۔ جہازی ٹوپی اُوڑھے ہوئے جو سر کو کانوں تک چھپائے ہوئے تھی۔ یہ شخص جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔

سراغرساں اس کے ساتھ ہی تختہ جہاز پر چڑھ گیا۔

"گرفتار کر لو" اس نے کہا اور پھر اپنے سینہ کو اُبھار کر، بال کو دو انگلیوں میں احتیاط سے پکڑ کر۔ مسافروں کو دکھانے لگا۔

"ٹوپی اُتارو" جہاز کے کپتان نے درشتی سے کہا۔

اس نے تعمیل کی۔

اس کا سر انڈے کی طرح گنجا تھا۔

"ہا! مشہور ترین سراغرساں نے بغیر ایک لمحہ کے تامل کے کہا۔ "تو پھر اس نے ایک نہیں ہزاروں ہی قتل کئے ہیں" (لیکاک)

تنویر قریشی

نقد و تبصرہ

"فل بوٹ" پر دو نظریں

پہلی نظر مرزا عظیم بیگ کا نام گرامی اُردو داں طبقہ میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اتنی قلیل مدت میں مرزا صاحب جس شہرت اور نمود کے مالک بن بیٹھے ہیں وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ اُردو ادب میں آپ نے جس لطیف طرز نگارش کی بنیاد ڈالی وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ شریر بیوی، کولتار، چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز، تفویض، رُوحِ ظرافت، رُوحِ لطافت ایسی کتابیں ہیں جن پر ملک کا نوجوان طبقہ لوٹ ہے۔ ہر کتاب بجائے خود ایک "مستقل قہقہہ" ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی ان سے حظ اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حال ہی میں آپ نے ایک نئی کتاب "فل بوٹ" شایع کی ہے۔ عنوانات قائم کرنے میں مرزا صاحب کو یدِ طولیٰ ہے۔ "فل بوٹ" بھی کتنا تڑپا دینے والا نام ہے! سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ مرزا صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس کا ٹائیٹل بنایا ہے(؟) ٹائیٹل واقعی نہایت خوب ہے اسکے علاوہ کتاب کی جلد، طباعت، کتابت اتنی نفیس ہے کہ مرزا صاحب کی کوئی کتاب بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کاغذ بھی نہایت عمدہ، چکنا اور دبیز ہے غرض کتاب بظاہر اتنی شاندار معلوم ہوتی ہے کہ بیک نظر اس کو مرزا صاحب کا "شاہکار" کہدینا پڑتا ہے۔

دوسری نظر جہانتک مجھے علم ہے مرزا صاحب کا پہلا کامیاب افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" ہے۔ اسکی مقبولیت سے مرزا صاحب کچھ اس بیڈھنگے طریقہ پر متاثر ہوئے کہ اب جب اور جہاں بس چلتا ہے کسی نہ کسی "مصیبت" کو گھسیڑ ہی دیتے ہیں۔ "چینی کی انگوٹھی" میں شذری صاحب کی اُنگلی میں چا کی پیالی کا کُنڈا پھنس کے رہ جاتا ہے اور "فل بوٹ" میں بھی آپ اپنی ہونیوالی بیوی کے پاؤں میں "فل بوٹ" پھنسا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان "مصیبتوں" سے دلچسپ ترین نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ "مصیبت" بجائے خود کچھ کم دلچسپ نہیں لیکن ایک ہی قسم کے پلاٹ پر دھڑا دھڑ لکھتے چلے جانا افسانہ نگار کی کم مذاقی کو نمایاں کرتا ہے۔ اوّل تو مرزا صاحب کی ساری ظرافت کا دار و مدار صرف پلاٹ اور واقعات پر ہے۔ وہ بھی اگر تبدیل ہو جائے تو پھر رہ ہی کیا جاتا ہے خیر دوسری بات جو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے وہ مرزا صاحب کا طرزِ بیان ہے۔ اُردو تو مرزا صاحب "ایسے ہی بہت حسین" لکھتے ہیں لیکن "فل بوٹ" میں تو آپ نے حد ہی کر دی۔ غریب اردو پر وہ وہ اُلٹی چھُریاں پھیری ہیں کہ الامان! الحفیظ۔ ایک دِلّی کا باشندہ "اہلِ زبان" اس لئے نہیں کہا کہ کہیں مرزا صاحب رُعب میں نہ آجائیں سب کچھ برداشت کریگا لیکن اُردو کو اپنے سامنے ذبح ہوتے ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ "فل بوٹ" کے کل ۷۰ صفحات ہیں اور کوئی صفحہ ایسا نہیں جو غلطیوں سے پاک ہو۔ بجز چند صفحات یہاں تمام کی تمام غلطیاں درج نہیں کر سکتا کیونکہ یوں ایک مستقل کتاب تیار ہو جائیگی۔ اس لئے فی الحال مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کچھ ایسے فقرے درج کرتا ہوں جو شاید مرزا صاحب ہی سمجھا سکیں :-

صہ۵ "ابھی جو میں لاہور گیا" آپ قسم نہ کھائیے ہمیں ویسے ہی یقین ہو گیا کہ آپ ضرور لاہور گئے۔ فقرہ خود منہ سے بول رہا ہے۔

صہ۱۰ "مطلب میرا فل بوٹ سے یہ ہے کہ واقعی فل بوٹ" سُبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے آپ نے "مطلب میرا عظیم بیگ چغتائی سے یہ ہے کہ واقعی عظیم بیگ چغتائی" کیوں صاحب! کیا اسی کا نام ظرافت ہے؟

ص۱۳ "مکان کا ایک تو عام دروازہ تھا لیکن دوسرا ایک کمرہ میں ہو کر مردانی کوٹھی میں نکلا تھا" کیوں مرزا صاحب یہ "دروازہ نکلا تھا" کونسی زبان کا محاورہ ہے اور اس "لیکن" کا یہاں کیا محل ہے؟۔

ص۱۴ "بیچوں بیچ کمرہ میں" کیوں صاحب! یہ "بیچوں بیچ کمرہ" کیا کھانیکا کمرہ، سونیکا کمرہ اور بیٹھنے کا کمرہ کی قسم کی کوئی مخصوص کمرہ ہی یا کیا؟

ص۱۶ "اپنے متناسب اعضا اور صاف ستھرے کپڑوں میں اپنی صورت شکل کے باعث ایک عجیب کشش اور جاذبیت رکھتی تھی" تو یہ کہئے کہ یہ کشش متناسب اعضا اور صاف ستھرے کپڑوں میں تھی نہ کہ صورت شکل میں۔

ص۱۹ — "جسکو گلاب جامن نہ کھلانا بد تہذیبی تھا" یہ لیجئے وکیل صاحب نے اعلان کر دیا کہ ہر گاہ "بد تہذیبی" مذکر ہے، لہذا آپکو اجازت ہے کہ آپ بھی آج سے "آپ کا بہت مہربانی ہوا" اور "آپ کا بہت نوازش ہوگا" کی قسم کے فقرے نہ صرف بولا کریں بلکہ اپنے مایۂ ناز شاہکاروں میں لکھا بھی کریں اور اس بات کی توقع رکھا کریں کہ آپ کی یہ کتابیں (جن کا ٹائٹل آپ نے خود بنایا ہو) مقبول ہوں۔

ص۲۰ "تم بھی تو کہاں کا علاج کرا رہے ہو" کیوں صاحب! اس "کہاں" سے کیا کسی "مقامِ مخصوص" کی طرف اشارہ ہے؟۔

ص۲۱ "میرے سر میں اتنے بال کہاں" آج معلوم ہوا کہ مارواڑ کے لوگوں کے "سروں میں" بھی بال ہوتے ہیں۔

ص۲۶ "واللہ عالم وہ مجھے کیا سوچتی ہوگی" اس رنگیلی اردو پر قربان ہونیکو جی چاہتا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں آپ اس تبصرہ کے بعد "مجھے بھی" "کچھ اور نہ" "سوچنے" لگیں۔

ص۲۷ "اسکو بچاری کو کیا پتہ کہ یہ فیس میں ہی بھگت رہا ہوں" شاید آپ "کو" کی "تکرار" کرنا چاہتے تھے لیکن ناکامیاب رہے صحیح فقرہ یوں ہوتا "اس کو بچاری کو کیا پتہ کو کہ یہ فیس کو میں بھگت کو رہا ہوں کو"!!!

ص۲۹ "میں نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ تمہارے ہاتھ میں شفا ہے" یہ "صاف صاف" آپ نے اس بہادری سے کہا کہ گویا آپ "اظہارِ تعشق کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بات چبا گئے۔ کیوں نہ میں بھی آپ سے "صاف صاف" کہدوں کہ آپکی ٹوپی میں پھندنا لگا ہوا ہے!!

ص۳۱ "حتی کہ نوبت باینجا رسید..." مرزا صاحب! سچ سچ بتائیے گا کیا آپ نے کبھی (خدانخواستہ) "تیل" تو نہیں بیچا۔ کم از کم "اس فارسی" سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، خدا کرے میرا خیال غلط ہو لیکن میں آپ سے اس "حتی کہ نوبت باینجا رسید" کا مطلب ضرور پوچھ کے رہونگا۔

ص۳۶ "میں تمام وہ تعریفیں اسکے کانوں تک پہونچا تا جو ایک مریض ڈاکٹر کے بارے میں کہہ سکتا ہے" میں اس "تعریفیں کہنے" کی جدت طرازی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں —— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ص۴۳ "مس سنگھ کو جو کچھ دلچسپی اس قصہ سے آرہی تھی" معلوم ہوتا ہے آپ نے بڑی کاوش سے "دلچسپی آنے" کا محاورہ گھڑا" کاش یہ نصیب اُردو اس "کاوش" اور "اختراعِ فائقہ" کی قدر کر سکتی! لیکن آپ کو ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ آئندہ نسلیں آپ کی ان "اختراعات" کو آنکھوں سے لگائیں گی —— کئے جاؤ کوشش میرے دوستو۔

ص۵۳ "اگر روزانہ کا دستور باندھ کر اوقات کا پابند ہو جائے" "دستور باندھنا" آپ نے اس خوبی سے رقم فرمایا گویا سچ مچ یہ بھی کوئی "پاجامہ" کی قسم کی چیز ہے کہ آپ نے "اللہ کہکر" "باندھ" لیا۔

ص۵۴ "تو غلطی کو اپنی محسوس کیا" کیا خوب مصرعہ فرمایا ہے آپ نے۔ بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے۔ آپ نثر میں بھی وزن قائم رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اس فقرہ کو یوں تبدیل کر دیا جائے تو آپ کو کیا اعتراض ہوگا —— "تو غلطی کو محسوس اپنی کیا"!

ص۱۱۳ "کیونکہ چلا تھا تو محض دفتر میں ایک نوٹ چھوڑ گیا تھا"۔ کیوں صاحب یہ "محض دفتر" کس چڑیا کا نام ہے؟
ص۱۱۵ "دریچہ میں پہنچکر آہستہ سے بڑھ کر، پردے سے لگ کر جھانکا"۔ ماشاءاللہ! کیا عبارت آرائی ہے!
ص۱۱۷ "مگر میں نہ جانا تھی نہ گئی"۔ یہ محاورہ بھی آپ نے خوب تراشا۔ میں اس کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔
ص۱۲۰ "طرفین سے عشق حقیقی جذبات بنکر دونوں کے لبوں پر مہر سکوت دیکر تکلیف پہونچا رہا"۔ آپ نے بڑی مشقت سے "عشق حقیقی" "جذبات" اور "مہر سکوت" کو ایک فقرہ میں جھونکا۔ معلوم ہوتا ہے آپ الفاظ ذیل کو اپنے فقروں میں استعمال کر وشکے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر لیتے رہے ہونگے۔ مگر آپ نے "عشق حقیقی" کو "جذبات" خوب بنایا گویا "عشق حقیقی" پہلے ایک جوہا تھا پھر ایک دم سے "جذبات" بن گیا (شاید جادو کے زور سے) یہ بھی مان لیا۔ لیکن براہِ خدا فقرہ کا مفہوم تو سمجھائیے!
ص۱۲۱ "میں مجبوراً ضد پکڑ گیا"۔ "ضد پکڑنا" داد سے مستغنی ہے۔
ص۱۲۳ "اور بیشک میں نے ٹال دیا، اور غلط بتایا تمہیں کہ فل بوٹ کسی اور نے منگایا ہے"۔ تو اے مرزا صاحب! کیا نہ بتائیں گے آپ ہمیں کہ سیکھا آپ نے یہ انداز "گلابی اُردو" کس سے۔ پس تحقیق ثابت ہوا اوپر ہمارے کہ آپ مبتلا ہیں کسی مغالطہ متعلق اپنے میں!!!
ص۱۵۵ "میں جیسے محو تھی کہ ایکدم سے" مرزا صاحب کو خدا معلوم لفظ "جیسے" کیوں زیادہ مرغوب ہے۔ آپ "جیسے" کو "گویا" کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اپنی اس "اختراع" سے اتنے خوش ہیں کہ ایک ایک صفحے میں سترہ سترہ "جیسے" استعمال کرتے ہیں۔ "پیر میرا جیسے ٹوٹا جا رہا ہو"۔ "وہ جیسے صوفے میں گر پڑی"۔ ۱۶۰ صفحات کی کتاب میں آپ نے ۲۱۳ مرتبہ "جیسے" استعمال کیا ہے۔ اب کہانتک گنواؤں۔
ص۱۶۷ "اُسکے گھنے ہوئے سیاہ بال" خدا جزائے خیر دے! کیوں نہ ہو آپ ایک چھوڑ گیارہ کتابوں کے مصنف ہیں اگر اب بھی آپ کو "گھنے ہوئے بال" اور "نرگس ہوئی آنکھ" کہنے کا حق حاصل نہو تو آخر پھر کب ہو۔

غرض ایسی ہی غلطیوں سے ساری کتاب پُر ہے۔ خدا کرے مرزا صاحب ان تمام غلطیوں کو "کتابت کی غلطیاں" کہہ سکتے ہیں خوش ہونگا اگر وہ "فل بوٹ" (کتاب) ہی کو ایک مستقل "کتابت کی غلطی" مان لیں۔

ایک نئی ادا مرزا صاحب نے اور سیکھی ہے وہ یہ کہ آپ خیر سے اب ہر کتاب، ہر افسانہ اور ہر قصہ کو ناتمام چھوڑنے لگے ہیں۔ شاید مرزا صاحب اسے بھی کوئی خوبی سمجھتے ہوں لیکن میں انہیں جتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ افسانہ نگار کی کمزوری اور نالائقی کی دلیل ہے۔ چنانچہ "فل بوٹ" بھی آپ نے ناتمام چھوڑ دی۔ واللہ اعلم اس میں کیا مصلحت ہے۔ شاید یہی کہ یا تو مرزا صاحب کے ادبی ذوق پر تجارتی ذوق غالب آ گیا اور آپ "فل بوٹ حصہ دوم" شایع کرنیکی نیت رکھتے ہیں۔ یا یہ کہ انہوں نے آیندہ کے واقعات لکھنے کیلئے آپ نے آپکو ناقابل پایا۔ سوائے ان دو کے تیسرا کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔ آخر میں میں نہایت خلوص نیتی سے مرزا صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرونگا کہ اس سے پہلے کہ وہ دھڑا دھڑ کتابیں شائع کریں انہیں کچھ عرصہ تک "اُردو" سیکھنی چاہیئے۔ میرے نزدیک "فل بوٹ" مرزا صاحب کی ذلیل ترین کتاب ہے۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک سے زیادہ غلطیاں نہ ہوں۔ اس کے باوجود اگر آپ "فل بوٹ" پڑھنا چاہیں تو بسم اللہ! مبلغ ۱۲/ صرف بھیجے اور دفتر کتابت عظیم بیگ چغتائی۔ جودھپور سے منگا لیجئے۔ ساقی بکڈپو۔ کھاری باؤلی دہلی سے بھی یہ کتاب مل سکتی ہے۔

انصار ناصری۔ بی۔ اے (دہلوی)

نیرنگِ خیال "اقبال نمبر"

تجارتی اغراض کو پورا کرنے کا ایک نہایت قبیح طریقہ

حضرت علامہ اقبال کی شہرت صوبجاتی یا ملکی نہیں بین الاقوامی ہے۔ کبھی وقت تھا کہ چند مدعیانِ زبان انکے منہ آتے تھے۔ اور ان کی شاعری پر نام رکھ کر اپنی بدنامی کا باعث ہوتے تھے۔ کچھ دنوں برادرانِ وطن انہیں دشمنِ وطن قرار دے کر شاعری سے خارج کرنے کی قرار دادیں پیش کرتے رہے۔ چند سر پھرے سیاسی لوگ انہیں "سر" ہونے کی وجہ سے بُرا بھلا کہتے رہے۔ کچھ فرنگی نقادوں نے انہیں مغربی استبداد کا مخالف سمجھ کر "خونین ستارہ" کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ مگر آہستہ آہستہ صداقت آشکار ہوتی گئی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ادھر اٹلی کی اکاڈیمی انہیں لیکچر دینے کی دعوت دے رہی ہے۔ اور مسولینی جہاں گاندھی سے چند منٹ گفتگو کرنے پر اکتفا کرتا ہے حضرت علامہ کے ساتھ دنیا جہاں کے سیاسی مسائل پر بحث و تمحیص کرتا ہے۔ انگلستان میں انہیں وہاں کی سب سے بڑی فلسفیانہ انجمن بلاتی ہے۔ شاعروں کی کلب لکچر کے لئے استدعا کرتی ہے۔ جرمنی میں ہائیڈل برگ سے دعوتیں آتی ہیں۔ روس اپنے اقتصادی پروگرام کے متعلق رائے لینے کے لئے بے تاب ہے، سپین اپنی نئی یونیورسٹی کے سلسلہ میں مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ مصر اور فلسطین میں ان کی شان میں قصائد لکھے جاتے ہیں اور خود ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم کانفرنس کی صدارت ان کے لئے مخصوص ہے۔

ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان ہستی کے نام پر جو ادبی رسالہ اپنا نمبر نکالنے کی جرأت کرتا ہے۔ اُسے مضامین کے لئے تو موجودہ اشخاص ہی پر انحصار کرنا ہوگا۔ مگر ظاہری شکل و صورت اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ اسی لئے ہمیں اُمید تھی کہ "نیرنگِ خیال" جسے تمام تر ناز اپنی ظاہری صورت پر ہے اقبال نمبر میں کم از کم لکھائی چھپائی، کاغذ اور تصاویر کے اعتبار سے اور کچھ نہیں تو اپنے دیگر نمبروں سے سبقت لے جائیگا۔

- - - مگر ہمیں کس قدر مایوسی ہوئی جب ہم نے اقبال نمبر دیکھا۔

سائز گھٹا کر چھبی کر دیا گیا۔ تاکہ کئی سو صفحے کا دعویٰ قائم رہ سکے۔ - - - - - -

کاغذ ردی پُڑیا باندھنے والا کاغذ اس سے بہتر ہوتا ہے۔

لکھائی چھپائی۔ خود ایڈیٹر کو اعتراف ہے کہ اس سے بدتر ممکن نہ تھی۔

اور کتابت کی غلطیوں کا یہ حال ہے کہ بقول حضرت علامہ اقبال، ہر صفحے پر چودہ پندرہ سے کم نہ ہوں گی۔

تصاویر الٹھو کے کارٹون فوٹو کی تصاویر سے زیادہ دلچسپ تھے۔ آخر شمع شاعر کی سی دل گداز اور روح پرور نظم کے لئے ایک شمع کے سامنے ایک باریش بڈھے کو بٹھانے کا کیا مدعا ہے؟ کیا اس اعلیٰ نظم کا یہی مقصد ہے؟۔

یہ تو ہے حسنِ صورت کا حال جس پر کارپردازانِ نیرنگِ خیال کو پورا اختیار حاصل تھا۔ بجز اس اگر یہ پرچہ خود اقبال کے شہرت شایع نہ ہوتا تو شاید یہ خیال ہوتا کہ کسی حاسد نے بدنام کرنے کے لئے ایسی کوشش کی ہے۔

اب رہے مضامین سوان کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ سب سے بہتر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا مضمون ہے جو برسوں پہلے انگریزی اور پھر اُردو میں چھپ چکا ہے۔ تین اور انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں۔ جن میں سے کوئی ایک مضمون بھی نیرنگِ خیال کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔ اور ممتاز حسن احسن صاحب کا مضمون مسخ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی مضامین اسلم و تنائی کی حسین عبارت آرائیوں کو چھوڑ کر ایسے ہیں کہ اگر ان پر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت علامہ کی ہتک کی جارہی ہے۔ ہاں ایک مضمون "چودھری" کا ہے جس کا ایک خاکہ سا انقلاب میں شایع ہوا تھا۔ مگر اس میں اس قدر اغلاطِ کتابت ہیں کہ بے سرو پا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کاروان لاہور کے کارپردازوں سے لے کر بلا حوالہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حوالہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ مضامین کی خوبی یا بُرائی کا ایڈیٹر ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہنا غلط ہے۔ خوبی کا تو نہیں مگر برائی کا ذمہ تمام تر ایڈیٹر پر ہے۔ کیونکہ بُرا مضمون شایع کرنا کوئی طبی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

اور پھر جس رسالہ کا یہ اقتدار بھی نہ ہو کہ اسے کسی خاص مضمون کے لئے بہترین لکھنے والے میسر آسکیں اسے اس مضمون کے متعلق خاص نمبر نکالنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ خود لاہور میں اقبال اور اس کے فلسفہ اور شاعری کے متعلق حضرت سالک وغیرہ۔ تاثیر و بخاری۔ ایم۔ اسلم اور حکیم شجاع جیسے ادیب لکھنے والے موجود ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس پرچہ سے مکمل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ لاہور سے باہر علی گڑھ، حیدرآباد، الہ آباد، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ۔ ہر جگہ اقبال کے حفاظ موجود ہیں۔ مگر ذوقِ انتخاب اور چیز ہے اور تجارتی گرمیِ بازار اور چیز!۔

"یکے از نیازمندانِ لاہور!"

یورپ میں دکھنی مخطوطات

علامہ شبلی اپنے کسی دوست کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "فہرست کیا بھیجتا۔ کوئی کتاب معقول نہ تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ اُردو کی عمدہ کتابوں کے نام لکھو۔ افسوس اُردو میں ابھی ہے ہی کیا!" کاش علامہ موصوف اس زمانہ میں ہوتے تو بہ نظرِ استحسان اور بہ جذبۂ مسرت یہ کہتے کہ "اُردو کی عمدہ کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ کس کس کے نام لکھوں؟"

اپنی مادری زبان کو جو اظہارِ جذبات اور خیالات کا واحد ذریعہ ہے۔ بلند معیار پر لائے بغیر زندگی کے دیگر گوناگوں شعبوں میں ترقی کا خیال اُمیدِ موہوم سے زیادہ نہیں۔ اپنی تہذیب و تمدن کی ترقی اور معاشرت کی اصلاح کا راز اسی امر میں مضمر ہے کہ پہلے اپنی زبان کو دیگر مہذب اور ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش اور قدم بقدم چلایا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو اربابِ ذوق اس سعیِ جمیل کو اپنا شریف مشغلہ بنائے ہوئے ہیں اور اپنے ذوقِ سلیم کے ثبوت میں اُردو کے علمی، ادبی، یا تاریخی سرمایہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں، وہ بجا طور پر ستایش اور سراہے جانے کے لایق ہیں۔

خدا کا شکر ہے اِس شریف مشغلہ میں دلچسپی لینے والے ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ (خدا نظرِ بد سے بچائے) کوئی دیگر زبانوں کی فلسفیانہ اور سائنٹفک کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنا رہا ہے، کوئی شعر و شاعری میں چار چاند لگا رہا ہے۔ کوئی نثر میں طول طویل خطوطِ فاصل یا ڈیش دیکر ایک طرزِ نو (جسے ادبِ لطیف سے موسوم کیا جاتا ہے) کی بنیاد ڈال رہا ہے۔ کوئی قدیم اُردو کے اہلِ قلم کی تصانیف جمع کرنے میں مشغول ہے۔ اور کوئی اُردو ادب کی تاریخ مدوّن کرنے میں منہمک ہے۔ غرض بقول جناب ڈاکٹر محی الدین قادری ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے سونے کی کانوں کی طرح کوئی معدن مل گیا ہے جس کی طرف ہر نئے پرانے کی نظر لگی ہوئی ہے"

انہیں اہلِ ذوق اصحاب میں نصیر الدین صاحب ہاشمی بھی ہیں، جو اپنے معاصرین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ صاحبِ موصوف کو دکھنی اُردو کے قدیم مُصنّفین اور اساتذہ کی تصانیف اور کلام جمع کرنے سے خاص شغف ہے۔ اِسی جذبہ کے ماتحت ہاشمی صاحب دکھنی مخطوطات کی چھان بین کے لئے یورپ تشریف لے گئے اور وہاں نہایت دیدہ ریزی سے تمام کیٹا لاگوں کا مُطالعہ کیا۔ اور بعض کیٹا لاگوں میں تصحیح بھی کی۔ اور اس طرح یورپ سے قدیم اساتذۂ دکن کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر کے ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اور اس ذخیرے کو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے شایع کیا ہے۔ ہاشمی صاحب کی جانفشانی کا اندازہ اِس امر سے ہو سکتا ہے کہ صاحبِ موصوف نے اِس قلیل عرصے میں بارہ کتب خانوں سے استفادہ کیا جن کے نام کتاب ہٰذا کے پیش نامہ میں مذکور ہیں۔ علاوہ مذکورۂ بالا کتب خانوں کے چند اور کتب خانے بھی ہیں جنہیں

اُردو کا کافی مواد موجود ہے۔ ہاشمی صاحب کی رائے ہے کہ جرمنی، پیرس، انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں ہماری زبان میں تحقیق و تدقیق کرنے کے لئے وافر سامان موجود ہے۔ اکثر ایسے مخطوطات یورپ میں موجود ہیں جن کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ملتا۔ نیز یہ کہ ایک ہی کتاب کے کئی کئی نسخے ہیں، جن کا باہم تقابل کر کے اختلاف معلوم کیا جا سکتا ہے۔ فاضل مؤلف نے جانکاہی سے اِن مخطوطات کا مطالعہ اور تقابل کیا ہے اور انہیں اپنی محققانہ رائے کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ اپنی زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے "دکھنی مخطوطات" کا مطالعہ از حد دلچسپ اور مفید ثابت ہو گا۔ لائق مؤلف کی سعی مشکور ہے اور دکن اگر اپنے اِس ہونہار سپوت پر فخر کرے تو بجا ہے۔ سُلطان العلوم کے ادب پرور دورِ حکومت میں ہاشمی صاحب زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کے مُستحق ہیں۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب و نظر فریب۔ ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلّد صہ ر۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ جناب نصیر الدین ہاشمی۔ تُلجی گوڑہ۔ تُرپ بازار۔ حیدر آباد۔ (دکن)

ریزۂ مینا

شاھدِ ساقی!

تم "شاہد" ہو یا "ساقی"؟ تم حیران ہو گے کہ اس سے میرا کیا مطلب ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ شاھد اور ساقی میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک "شاھدِ ساقی" ہے اور دوسرا "ساقیِ شاھد"! سنو، جس عالم میں یہ "اتصالِ فتنہ انگیز" وارد ہوا ہے وہاں کیفیات واحساسات میں کوئی تفاوت اور امتیاز ممکن ہی نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک کی خودمستی اس کو دوسرے کی قلتِ نوازندگی سے بےخبر رکھتی ہے۔ جب تک ساقی تمہاری آہ میں نہیں آیا تھا، تمہاری زندگی میں کیف جب بھی تھا مگر بےمزہ۔ تمہاری شراب میں صہبائیت جب بھی تھی، مگر محرومِ التہاب۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہد کا شباب بھی تشنۂ ساقی تھا، اپنے احساسِ شباب کے لئے —!

اس "نمک زار" میں تم کو کس منہ سے بُلاؤں! اس ویرانے میں تمہارا کیسے جی بہلے گا؟ میں یہاں جیسی داس زندگی بسر کر رہا ہوں، خدا بہتر جانتا ہے۔ یقین جانئے کہ میرے دل و دماغ پر موت کی سی سیاہی چھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شے جس پر میری حیات کا دارومدار ہے اندر ہی اندر فنا ہو رہی ہے۔ اور اگر میرے "وحشت آباد" میں ایک مستقل رہنے والی چیز نہ ہوتی تو — عزیز شاھد! — شاید میں اب تک "مرحوم" ہو چکا ہوتا — آہ! تم محروم ہو اُس لذتِ خاص سے جو میری زندگی کی رُوح ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ چاہنے اور نہ چاہے جانے میں کیا شیریں تلخیاں ہیں۔ احساسِ اُلفت میرے لئے مقصودِ حیات ہے۔ مگر دعویٔ محبت —! اگر اِس جُرم کا تصور ہی پیدا ہو جائے تو میرے اور میرے مقصد کے درمیان ایک حجابِ مستقل بن جائیگا۔ ذرا غور کرو، رازِ حیات آخر کیا ہے؟ یہی "اضطرابِ شوق" اور یہی "تشنگیِ ذوق"! شوق اضطراب بھی اسی سے ہے اور ذوقِ تشنگی بھی اسی سے۔ اگر خدانخواستہ ہم اس کیف وحال کو برباد کر دیں تو بجز ایک جسدِ بےحیات کے اور کیا رہ جائے گا؟ واللہ! اس فلسفیانہ شعریت کی داد چاہتا ہوں! تمہیں تعجب ہوگا کہ رنگین طبع اور عاشق مزاج انصار ایک خشک فلسفی بھی ہے، مگر جو "عشق" فلسفہ سے خالی ہو وہ میرے نزدیک بوالہوسی ہے!۔

"چندرا موہنی" کی غیرمعمولی کامیابی پر میں اُسی حد تک مبارکباد کا مستحق ہوں جتنا کہ تم۔ یہ تمہاری ہی وسعتِ پذیرائی کی بدولت ہے کہ میری جگر کاوی ٹھکانے لگی۔ اس کے علاوہ میں دبی زبان سے اتنا اور کہوں گا کہ "جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد ؂ وگرنہ من ہماں خاکم کہ بودم —" کہیں مولانا..... کی طرح یہ نہ کہدینا کہ "یہ میرے مذاق سے گرا ہوا ہے" واللہ قربان جائیے اس ادا کے!۔

خطوں کا جواب جلدی جلدی دیا کرو۔ میں صرف اِنہی کے سہارے جیتا ہوں۔ کیا میں اب خفیف سی مسرت کا بھی مستحق نہیں رہا —؟

تمہارا
انصار

سالنامہ ساقی ۳۳ء

دسمبر کے آخری ہفتے میں شایع ہو جائیگا

علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ تنقیدی اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ مزاحیہ اور سنجیدہ افسانے اور ڈرامے۔ پُر کیف نظمیں اور غزلیں۔ غرض ہر طرز کے چیدہ چیدہ نمونے سالنامہ میں شامل ہوں گے۔

رنگین اور سادہ تصاویر کا دلآویز مُرقع

یہ بیش قیمت مجموعہ ہر شہر کے ایجنٹ سے عہ میں اور ریلوے بُک اسٹالز سے عہ میں مل سکے گا۔

مُستقل خریداروں کو مُفت دیا جائیگا

نوٹ:- ہر مُستقل خریدار کو سالنامہ بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا اس لئے ۳ر کا وی۔پی ارسال کیا جائیگا۔

مضامین اور مضمون نگاروں کی طویل فہرست یہاں پیش نہیں کیجا سکتی اور نہ خودستائی ہمیں پسند ہے۔ شایقین خود دیکھکر خریدیں۔ اس سے کھرا سودا اور کیا ہو سکتا ہے؟

انتخاب دیوان شمس تبریز

مرتبہ جناب عبد الماجد آروی

مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن کی معرکۃ الآرا تصنیف کی تلخیص مع تنقید و تحقیق تصوف اسلام [illegible] مولانائے روم کے تصوف پر نہایت خاتمہ سنجیدہ اور مدلل محاکمہ۔ طباعت کتابت بہترین۔ [illegible] نکلسن کی تصویر۔ (ایوان گورکھپور۔ اگست [illegible])

مغرب کے مشہور مستشرق رنالڈ نکلسن کا دیوان شمس تبریز بہت مشہور چیز ہے۔۔۔۔ اسی کتاب کو [illegible] بہار کے مشہور فاضل مقالہ نگار مولوی عبد المالک صاحب آروی نے اردو میں منتقل کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے [illegible] ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اسکی ترتیب میں ڈاکٹر نکلسن سے کم محنت کی ہے، یہ کتاب حقیقتاً ترجمہ نہیں ہے بلکہ نکلسن کی تصنیف پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے جس میں بہت کچھ مفید اضافہ کیا ہے نکلسن کے تسامحات کو بھی [illegible] کیا ہے۔۔۔۔ حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اس کے فاضل مرتب کی جس نے انتہائی عرق ریزی، خوش سلیقگی سے [illegible] چیز اردو میں پیش کی جس کی مثال ہمارے یہاں کے انتقادی لٹریچر میں مشکل ہی سے کوئی دوسری مل سکتی ہے (نگار لکھنؤ۔ بابت جولائی [illegible])

جناب عبد المالک صاحب آروی نے پروفیسر نکلسن کے انتخاب دیوان شمس تبریز پر نہایت محققانہ مقدمہ لکھا ہے اور اس ضمن میں تصوف، صوفی شاعری، اور شعرا اور دوسرے اہم مسائل پر جن کا تعلق تصوف سے ہے [illegible] قابلیت سے بحث کی ہے، ان کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور فارسی تذکرے اور کتابیں ہیں اس کتاب سے فاضل مرتب کی وسیع نظری اور تنقیدی قوت کا اظہار ہوتا ہے، آخر میں مولانا روم کے دیوان کا جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے، انتخاب دیا ہے، انتخاب تو صرف پچیس چھبیس صفحے پر ہے لیکن باقی تمام کتاب یعنی تقریباً [illegible] صفحات میں دوسری متعلقہ بحثیں ہیں جو محققانہ معلومات سے لبریز ہیں۔ (اردو دکن جولائی [illegible])

جامعہ دہلی ([illegible]) معارف اعظم گڈھ (بابت دسمبر [illegible]) نے بھی تبصرے کئے ہیں

لیبر یک [illegible] کے موقر جرائد اور [illegible]

[illegible] اور

خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کی تمام خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے [illegible] قیمت [illegible]

[illegible]

ملک کے مشہور ادیب حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ ہر سال نگار کا ایک خاص نمبر جنوری میں شائع کرتے ہیں۔ یہ خاص نمبر خصوصیت کے ساتھ عجیب و غریب پرچہ ہوتا ہے چنانچہ اب کے بھی ایک اچھوتے موضوع پر بسیط مضمون شائع کیا جائیگا مفصل اشتہار ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت نیاز کا رنگین قلم ہی اُسکی عمدگی کی کافی ضمانت ہے اسلیئے آج ہی ایک کارڈ لکھکر اپنا نام رجسٹر کرا لیجیئے ورنہ گذشتہ خاص نمبروں کی طرح یہ بھی پھر کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکے گا۔

جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار

(جناب نیاز کے قلم سے)

کم از کم دس جزد کی ضخامت پر شائع ہوگا اور وقف ہوگا صرف شہوانیات یا تاریخ الفحشاء کے لئے یعنی اس میں عہدِ قدیم سے لے کر اس وقت تک کی فحاشی پر تاریخی، نفسانی و علمی نقطۂ نظر سے نہایت بسیط بحث کی جائے گی اُردو میں بالکل پہلی چیز ہوگا اور ہزاروں ایسی دلچسپ معلومات کا حامل ہوگا۔ جو اس وقت تک نہ آپنے سُنیں، نہ دیکھیں مفصل فہرست عنوانات کی نگار ماہ نومبر و دسمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ سالانہ چندہ نگار پانچ روپے (صہ)

جنوری ۳۳ء کا پرچہ علیحدہ عہ میں ملے گا

منیجر "نگار" لکھنؤ